قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

ستمبر 2021 قیمت 15₹

ماہنامہ

اُردو دُنیا

نئی دہلی

Monthly **URDU DUNIYA**, New Delhi

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ
بچوں کی دنیا
دہلی
Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں
قسط وار ناول

دل چسپ کہانیاں
معلوماتی مضامین
ہنسنے ہنسانے کی باتیں

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ سیاحتی مقامات

اردو فیس بک ◆ دماغی ورزش

ننھے فنکار ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

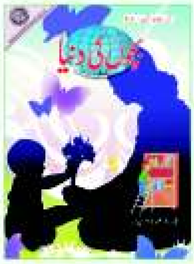

سب سے زیادہ چھپنے والا بچوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 10 روپے سالانہ: 100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

زر تعاون سالانہ 100 روپے بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: 90092010045326 :A/C ، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

ماہنامہ اردو دنیا دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:23، شمارہ:09، ستمبر 2021

مدیر : ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

مشیر : حقانی القاسمی

معاونین: عبدالرشید اعظمی، یوسف رامپوری، نایاب حسن

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت تعلیم، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع:

ایس نارائن اینڈ سنز، بی-88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا

فیز-II، نئی دہلی-110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد اکرام

ڈیزائننگ: محمد زید

قیمت -/15 روپے سالانہ -/150 روپے

Total Pages:100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL,New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ،
نئی دہلی-110025

فون: 49539000 شعبۂ ادارت: 49539009

ویب سائٹ

http://www.urducouncil.nic.in

E-mail: editor@ncpul.in

urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 26109746، فیکس: 26108159

ای میل: sales@ncpul.in,ncpulsaleunit@gmail.com

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلیکس

بلاک نمبر 5-1 پتھر گٹی، حیدر آباد-500002

فون: 040-24415194

مشمولات

اداریہ

ہماری بات 4

خطوط

ربط والتفات — قارئین کے خطوط 5

ادب: زاویے اور جہات

سرسید کے زینو بھیا — صغیر افراہیم 9

اکیسویں صدی میں اردو تنقید نگاری کی پیش رفت — سعید رحمانی 12

مالک رام کی کتاب 'فسانۂ غالب' ایک تحقیقی کاوش — حنا آفریں 16

الیاس احمد گدی کی سفرنامہ نگاری — فیروز عالم 18

تحقیق کے معلم اول: حافظ محمود شیرانی — راشد میاں 21

دولت وصحت کی نعمت کا فلسفہ اور کلام نظیر — سرفراز جاوید 25

اردو افسانے میں تقسیم ہند کے مسائل اور کرب — ساجد علی قادری 28

شمیم کرہانی کی انقلابی شاعری — اعظم عباس شکیل 31

لعل و گہر

نواب مشتاق حسین وقار الملک — ناشر نقوی 34

زخ ش — افشاں ملک 36

مہر دکن: جے پی سعید — غضنفر اقبال 40

پریم ناتھ پردیسی — خورشید احمد ڈار 42

یاد رفتگاں

خالد سعید کی شاعری — سلیم شہزاد 46

حیرت فرخ آبادی: ایک معتبر شاعر — نصیر افسر 48

ہندوستانی تہذیب وتمدن کا ستون: دلیپ کمار — منتظر قائمی 50

تہذیب و ثقافت

اردو لوک گیتوں کے امتیازات — عبداللہ امتیاز احمد 53

سلسلۂ صحافت

اردو میں طنزیہ و مزاحیہ کالم نگاری — رفیق احمد 57

ماہنامہ سب رس ایک تحقیقی وتنقیدی جائزہ — قمر احمد 60

کتاب دریچہ

جن کتابوں نے مجھے متاثر کیا — خطاب عالم شاذ 62

تجارت و معیشت

عہد وسطیٰ کے دیہی بازار اور زرعی پیداوار — منصور احمد صدیقی 64

گفتگو

انس مسرور انصاری سے ایک ملاقات — ساجد جلال پوری 66

تشریح و تجزیہ

غالب کے غیر متداول کلام سے تین اشعار اوران کی تشریح — ج، ع، واجد 69

سلطان حیدر جوش علیگ کا افسانہ 'اتفاقات زمانہ' — شہزاد بخت 72

کتابوں کی دنیا

تعارف وتبصرہ — ادارہ 76

خبر نامہ

اردو دنیا کی خبریں — ادارہ 85

ہماری بات

اردو زبان کی یہ خوش بختی ہے کہ دنیا کی دیگر ترقی یافتہ زبانوں میں اردو زبان و ادب کے مسائل، مباحث اور موضوعات کے حوالے سے گفتگو ہوتی رہی ہے۔ انگریزی میں بھی اردو ادب سے متعلق کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور انگریزی مجلات میں اردو سے متعلق مقالات بھی شائع ہوتے رہے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ دوسری زبانوں کے لوگ اردو کے ذخیرے کو اپنی زبان میں منتقل کرتے رہتے ہیں۔ دوسری زبانوں کے مجلات میں بھی اردو زبان اور اس سے جڑی ہوئی شخصیات کو مرکزی موضوع کی حیثیت دیتے ہوئے بیش قیمت مقالات شائع کیے گئے ہیں۔ اس طرح اردو کی توانائی اور قوت کا احساس دوسری زبانوں کو بھی بخوبی ہو رہا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ اردو ایک اہم زبان ہے جس کے اندر دنیا کے بیشتر موضوعات کو سمیٹنے کی قوت ماضی میں بھی رہی ہے اور حال کے موضوعات بھی اب اردو زبان کا حصہ بنتے جارہے ہیں۔ اس زبان کی تخلیقی، تخیلی قوت اور موضوعاتی تنوع کا اعتراف اب عالمی سطح پر ہونے لگا ہے۔ یہ اردو زبان کے لیے نیک فال ہے کہ اب باضابطہ اردو کے تنقیدی مباحث پر بھی دوسری زبانوں میں گفتگو شروع ہو چکی ہے اور بہت سے شاعروں اور ادیبوں کو دوسری زبانوں میں مقبولیت اور اہمیت بھی حاصل ہے مگر المیہ یہ ہے کہ دوسری زبانوں میں اردو زبان و ادب کے تعلق سے جو کتابیں یا مقالات شائع ہو رہے ہیں ان کے تعلق سے ہمیں یا تو خبر نہیں ہو پاتی یا ہم انھیں نظرانداز کر دیتے ہیں۔ جب کہ ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ دوسری زبانوں کے ناقدین یا ادیبوں کا ہماری اردو زبان کے تعلق سے کیا زاویہ نظر ہے۔ وہ اردو زبان و ادب کے اندر کس طرح کی خوبیاں یا خامیاں محسوس کرتے ہیں۔ اگر ہمارے ادب میں کچھ خامیاں ہیں تو ہمیں ان کے تدارک کی کوشش کرنی چاہیے اور غلط فہمیوں کا ازالہ بھی کرنا چاہیے۔

انگریزی یا دیگر ترقی یافتہ زبانوں میں اردو کی تخلیقات کے جو ترجمے ہوئے ہیں ان سے اردو کی عالمی شبیہ بہت بہتر ہوئی ہے اور ان زبانوں کے پڑھنے والے افراد بھی اردو کے تئیں دلکشی اور دلچسپی محسوس کرنے لگے ہیں اور واقعی اس زبان میں اتنا عظیم سرمایہ ہے کہ اگر اس کو پورے طور پر دوسری زبانوں میں منتقل کیا جاتا رہے تو اس کے بہت مثبت اور مفید اثرات سامنے آئیں گے۔ ہمیں ایسے مترجمین کی تلاش کرنی چاہیے جو اردو زبان کے شہ پاروں کو انگریزی یا دیگر زبانوں میں منتقل کر سکیں۔ اس طرح ہماری زبان کے تئیں اگر کسی طرح کا تعصب یا تنگ نظری پائی جاتی ہے تو اس کا بھی خاتمہ ہوگا اور ہمارے تخیل اور احساس کی قوت سے دوسری زبانوں کے افراد بھی بخوبی واقف ہو پائیں گے۔

قارئین! اردو زبان جس طرح عالمی سطح پر اپنی شناخت قائم کرتی جارہی ہے اور اس کا دائرہ اثر بڑھتا جا رہا ہے، نئی بستیوں میں اردو اپنی ایک الگ پہچان قائم کر رہی ہے اور وہاں کے لوگ جذباتی طور پر اس زبان سے لگاؤ محسوس کرتے ہیں تو ایسے میں ہمیں بھی اردو زبان کے تئیں سنجیدگی کا مظاہرہ کرنا ہوگا اور اس زبان کے تحفظ، فروغ، توسیع اور تجدید کے لیے ہر ممکن کوشش کرنی ہوگی کیونکہ جو زبانیں اپنے ہی دائرے میں سمٹ کر رہ جاتی ہیں وہ آہستہ آہستہ ختم ہو جاتی ہیں۔ ان کے نشانات مٹتے جاتے ہیں، اسی لیے ہمیں اپنی زبان کو زندہ رکھنے کے لیے بہت سی سطحوں پر کوشش کرنی ہوگی۔ ہمیں اپنی زبان کے تعلق سے بیداری کا مکمل ثبوت دینا ہوگا تبھی یہ زبان ہر حلقے میں مقبول ہوگی۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ اس کے لیے صرف مسلم اکثریتی اضلاع یا اردو سے مانوس علاقوں کا ہی انتخاب کیا جائے بلکہ ہندوستان کے تمام علاقوں میں اس کی ترویج و اشاعت کے لیے کوشش کرتے رہنا چاہیے کیونکہ اردو ایک سیکولر اور جمہوری زبان ہے، جس کی پرورش و پرداخت میں تمام مذاہب اور طبقات کا خون جگر شامل ہے۔ بلا امتیاز مذہب و ملت اس زبان نے ہندوستانی افکار و اقدار کی ترجمانی کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس زبان کے لیے بہت سے ان ذہنوں میں بھی بے پناہ محبت و عقیدت ہے جن کی زبان کوئی اور ہے مگر وہ اردو کے ادبی سرمایے سے بہت متاثر ہیں، خاص طور پر اردو کی غزلیہ شاعری سے ایسے افراد کی روح کا ایک گہرا رشتہ ہے۔ وہ اپنے جذبات و احساسات کا اظہار اسی زبان کے شعری پیرائے میں کرنے کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ ہمیں ان کے اس جذبے کا احترام کرتے ہوئے اردو کا سرمایہ ان تک پہنچانا ہوگا تاکہ ہماری زبان کو نئی زندگی اور نیا کارواں مل سکے۔

عقیل احمد

شیخ عقیل احمد

ربط والتفات

ماهنامه 'اردو دنیا' میں 'ربط و التفات' کے تحت قارئین کے خطوط شائع کرنے کا قطعی مقصد نہیں ہوتا که محض ستائشی اور تحسینی کلمات لکھے جائیں بلکه رسالے کے مشمولات کے حوالے سے نئے مباحث پر گفتگو کو آگے بڑھانا ہوتا ھے۔ ماضی میں مکتوبات بہت سے مضامین سے بھی زیادہ بیش قیمت ہوتے تھے که ان میں مشموله مضامین کے تعلق سے نئے نکات، مباحث کی نشاندھی کی جاتی تھی۔

قارئین سے گذارش ھے که ماهنامه 'اردودنیا' کے مشمولات کے حوالے سے بحث انگیز خطوط ارسال کریں اور ان نئے موضوعات، عنوانات، شخصیات اور علاقوں کی نشاندھی کریں جنھیں نظرانداز کیا جاتا رہا ھے۔ آپ کے خطوط ھمارے لیے بہت اھمیت کے حامل ہوتے ھیں، ان سے ھمیں رسالے کو خوب سے خوب تر بنانے میں مدد ملتی ھے۔ (اداره)

ماہ اگست کا اردو دنیا اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ آزادی کا جھنڈا (ترنگا) لہراتے ہوئے رونق افروز ہوا۔ ہماری بات میں مدیر رسالہ ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے مکمل اداریہ آزادی پر لکھ کر یہ ثابت کیا کہ اردو نے 'انقلاب زندہ باد' کا نعرہ دیا اور آج بھی اردو زبان کی ترویج کے لیے کام ہو رہا ہے۔

'ربط والتفات' میں مختلف ریاستوں کے قارئین کے خطوط ہیں۔ پہلی تخلیق اولاد نرینہ کی حیثیت رکھتی ہے اور جب اردو دنیا میں شائع ہو تو شائع ہونے والا ہر طرح سے مالامال ہو جاتا ہے۔

ادب جہات اور زاویے میں آٹھ مضامین ہیں۔ پہلا مضمون 'تحقیق کیسے کریں' غضنفر نے تو کمال کر دیا۔ تحقیق پر بہت کچھ لکھا گیا مگر جس طرح کے 50 اشارات دیے ہیں وہ ایک ریسرچ اسکالر اپنا لے تو اس کی تحقیق میں چار چاند لگ جائیں گے جن امور کی طرف اشارہ ہے وہ نظرانداز نہیں کیے جاسکتے۔ دوسرا مضمون قمر جمالی کا 'میرابائی استغراق اور عرفان ذات کی شاعرہ' کو نسائی ادب میں ایک اضافہ کہا جاسکتا ہے۔ تیسرا مضمون قیصر زماں کا 'حسرت کا شاعرانہ کردار' خوب ہے۔ چوتھا مضمون قمر سلیم کا 'اردو قومی یکجہتی اور اتحاد' میں یکجہتی اور اتحاد کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ہندوستان وہ واحد ملک ہے جہاں ہزاروں تہذیبیں، فرقے اور طبقے ہیں۔ الگ الگ زبانوں کے علاوہ سیکڑوں بولیاں بولی جاتی ہیں اور پھر بھی ان تمام کو اردو زبان جوڑے ہوئے ہے جو ملک میں بولی جانے والی دوسری بڑی زبان ہے۔ پانچواں مضمون احسان حسن کا 'رام کے حوالے سے چکبست کی شاہکار نظم کا بڑے دلکش انداز میں تجزیہ ہے۔ چھٹا مضمون زاہد ندیم احسن کا 'ماحولیاتی تحفظ اور ادب اطفال' آج کا سلگتا ہوا مضمون ہے اگر ہم بچوں کو ماحولیاتی تحفظ کا احساس دلائیں اور ان میں بیداری پیدا کریں تو آنے والا کل محفوظ رہے گا۔ ساتواں مضمون سلمیٰ محمد رفیق کا 'نقد مثنوی کاشف الحقائق کے آئینے میں' ہے۔ انھوں نے اچھا تجزیہ کیا ہے۔ کاشف الحقائق جسے بہارستان سخن بھی کہا جاتا ہے۔ یہ اولین تنقیدی کتابوں میں شمار کی جاتی ہے۔ آٹھواں مضمون اطہر حسین کا 'ماہنامہ معارف اور تحقیقات سلیمانی' ہے۔ انھوں نے حوالوں کے ساتھ تفصیلی جائزہ لیا ہے۔

زبان و تعلیم میں مشتاق احمد آئی پٹیل 'ورچوئل تدریس میں گوگل کلاس روم کا استعمال' محمد اطہر حسین کا 'عصر جدید کے طلبا میں اضطراب مسائل اور حل ہے'

یاد رفتگاں میں دو مضامین ہیں ایک راشد جمال فاروقی کا 'زندگی میں مرے حصے کی دھنک آجائے (دشت زاد کے حوالے سے سہیل اختر کی غزلوں کا مطالعہ) ہے۔ دوسرا مضمون نارائن پائیدار کا 'پروقار افسانہ نگار: آنجہانی رتن سنگھ' ہے۔ رتن سنگھ معتبر افسانہ نگاروں میں شمار ہوتے ہیں اور انھوں نے افسانوی ادب کو ایک نیا رنگ و آہنگ دیا۔ افسانے کے ساتھ افسانچوں کی دنیا میں بھی اپنا کمال دکھایا۔

لعل و گہر میں تین لعل و گہر ہیں: ایک مولانا قاضی سجاد حسین، دوسرے تسنیم انصاری اور تیسرے سید محمد نسیم انہونوی ہیں۔ مولانا قاضی سجاد حسین کی ادبی خدمات کا جائزہ عتیق الرحمٰن نے فنکارانہ تخلیقی اظہار کا شاعر تسنیم انصاری پر اسرار اللہ انصاری نے فنکارانہ جائزہ لیا اور آخر میں سید محمد نسیم انہونوی حیات و خدمات پر شہلا پروین نے قلم اٹھایا اور ان کے ناولوں کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔

افسانہ سمت و امکانات میں پہلا مضمون مغربی بنگال میں اردو افسانہ 2000 کے بعد محمد علی حسین شائق کا ہے۔ انھوں نے 2000 کے بعد کے افسانوں اور افسانہ نگاروں کا تعارف کروایا۔ دوسرا مضمون 'تمل ناڈو میں اردو افسانہ' اسا غنی مشتاق رفیقی کا ہے۔ ان کی نظر افسانوی ادب پر گہری ہے۔ تیسرا مضمون 'اردو میں افسانچہ نگاری کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ' فردوس احمد بٹ کا ہے۔ انھوں نے بڑے سلیقے سے تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ چوتھا مضمون اردو افسانوں میں خود کلامی کے عناصر محمد علیم اسماعیل کا ہے۔ حال ہی میں

انھوں نے افسانچہ کے فن پر کتاب مرتب کی ہے۔ انھوں نے خود کلامی کی تکنیک کو بتانے کی کوشش کی ہے۔

اردو تاریخ تہذیب اور تکنیک میں تین مضامین ہیں پہلا مضمون 'کس کو اردو زبان دے جاؤں' ابوزر عبدالاحد فرقانی کا ہے۔ انھوں نے حوالوں کے ساتھ بڑی اچھی باتیں کہیں اور ان باتوں میں سب کہہ گئے۔ دوسرا مضمون 'اردو میں ڈیجیٹائزیشن سمت و رفتار اور مستقبل' یہ آج کا مسئلہ ہے اور اردو والے دوسری زبانوں سے پیچھے ہیں۔ اس میں نت نئی معلومات دی گئی ہیں۔ تیسرا مضمون 'ریڈیو اور اردو کا باہمی رشتہ' ایک معلوماتی مضمون ہے۔ نفسیات میں 'کتھارسس کی نفسیاتی اہمیت اور ادبی معنویت' وحید الظفر خاں کا مضمون ہے۔

❖ **ڈاکٹر م ق سلیم**: صدر شعبۂ اردو، شاداں کالج، تلنگانہ

'اردو دنیا' جولائی 2021 بدست ہوا۔ اداریے پر جو نظر پڑی تو دل مسوس کر رہ گیا کہ کیا ہی عظیم ہستیاں ہم سے بچھڑ گئیں، بالخصوص شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کی یاد تو بھلائے نہیں بھولتی۔ ان کے علاوہ محترم شمیم حنفی بھی داغِ مفارقت دے گئے۔ ان ہستیوں سے احقر کے دیرینہ روابط رہے ہیں اور بس یہی مصرعہ دل و ذہن میں گردش کرتا ہے کہ

زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

پھر بھی دل پر پتھر رکھ کر یہ تسلی دی جاسکتی ہے کہ اگرچہ یہ دنیا فانی ہے، پھر بھی اہلِ کمال سے خالی نہ رہ پائے گی۔ ان کے حق میں دعائے خیر ہی کی جاسکتی ہے کہ پروردگار انھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ آمین ثم آمین۔

جولائی 2021 کا یہ شمارہ 98 صفحات پر مشتمل ہے جو اداریے کے علاوہ کوئی پندرہ شہ سرخیوں اور کوئی 29 ذیلی سرخیوں کا احاطہ کرتا ہے۔ 'ربط و التفات' (ص 5 اور 6) کے ذیل میں پانچ خطوط درج ہیں جن میں کچھ تنقید اور کچھ مشورے بھی شامل ہیں۔ 'زبان و ادب' (ص 7 تا ص 10) کے تحت 'عالمگیریت اور تعلیم: باہمی رشتے اور اثرات' پر بحث کی گئی ہے۔ اس میں عالمگیریت کی تعریف دی گئی ہے، پھر اس کے تین اقسام اور تین نظریے گنائے گئے ہیں۔ تعلیم پر عالمگیریت کے اثرات وغیرہ پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ لیکن عالمگیریت کے تحت دنیا کو عالمی گاؤں کے بجائے عالمی بستی کہا جائے تو کیا مضائقہ ہے کیوں کہ گاؤں کچھ پچھڑے ہوئے علاقے کی جانب اشارہ کرتا ہے گو کہ اس سے قربت مراد لی جاتی ہے۔ خیر۔ 'نقد و نگاہ' (ص 11 تا ص 27) کے ذیل میں پانچ اچھے خاصے مقالے دیے گئے ہیں۔ مقالہ بعنوان 'فلسفۂ موت کی شعری تشریحات' (ص 18) نہایت عمدہ ہے۔ مصنف کی پیش کش غضب کی ہے۔ وہ اس ہنر سے بخوبی واقف لگتے ہیں کہ توجہ کو کیسے اپنی بات کی جانب مبذول کیا جائے۔ 'یادِ شمیم' (ص 28 تا ص 32) کے تحت دو مضامین دیے گئے ہیں۔ ایک 'یادِ رنگ' (ص 28) اور دوسرے 'پروفیسر شمیم حنفی' (ص 31)۔ پہلے مضمون میں ابتداءً شمیم حنفی پس منظر میں چلے گئے تھے، البتہ دوسرا مضمون فی الواقعی اچھا ہے اور شمیم حنفی پر راست لکھا گیا ہے۔ زبان و پیش کش بھی عمدہ ہے۔ اس کے بعد 'لعل و گہر' (ص 33 تا ص 44) میں پانچ مضامین یعنی پانچ ہیرے جواہرات دمک رہے ہیں جو پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ 'شمس و قمر' (ص 45 تا ص 57) کے تحت چار مقالے درج ہیں یعنی چار چاند سورج ضیا پاش ہیں۔ اس کے بعد 'اساطیر اور اردو' (ص 58 تا ص 63) میں دو بیانیے دیے گئے ہیں۔ پہلے میں یہ بتایا گیا ہے کہ اردو افسانوں میں ہندو اساطیری رزمیوں کو کس خوبی سے ادا کیا گیا ہے جبکہ دوسرے میں یہ بتایا گیا ہے کہ اردو شاعری میں ہندو رزمیہ عناصر اور رام کا کیا کردار رہا۔ دونوں اچھے مضامین ہیں پڑھنے کے لائق۔ اس کے بعد 'کتاب دریچہ' (ص 64 تا ص 65) کے تحت

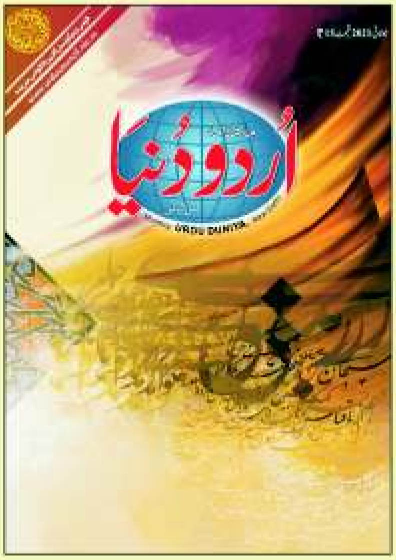

ایک مضمون 'جن کتابوں نے مجھے متاثر کیا' دیا گیا ہے۔ دیکھیے آپ اس کا مطالعہ کرکے کس حد تک متاثر ہو سکتے ہیں۔ کام ذرا کٹھن ہے۔ 'زاویۂ نظر' (ص 66 اور 67) میں ایک مضمون 'پیغام آفاقی کا دوست' شامل ہے جو دراصل پیغام آفاقی کے ناول 'دوست' پر کڑی تنقید ہے۔ اس میں ایک طویل تمہید باندھی گئی ہے۔ اگر یہ ناول اتنا بیزار کن ہے تو اسے نظر انداز ہی کر دیتے۔ خیر۔

'نگر نگر اردو' (ص 68 تا ص 71) میں 'کرناٹک کی نسائی شاعری' میں کرناٹک کی کوئی ڈھائی درجن سے زائد شاعرات کی حیات و کارناموں کا ان کے منتخب کلام کی روشنی میں جائزہ لیا گیا ہے اور کڑی محنت سے یہ مقالہ لکھا گیا ہے۔ غالباً یہ مصنفہ کی ریسرچ کا حصہ ہوگا لیکن اچھا لکھا ہے۔ 'خصوصی گفتگو' (ص 72 تا ص 75) میں عزیز اللہ شیرانی سے لیا گیا انٹرویو شامل ہے۔ 'عربی ادبیات' (ص 76 تا ص 80) کے ذیل میں دو مقالے شامل ہیں۔ ان میں پہلا علم نحو کی سب سے پہلی کتاب 'الکتاب' (ص 76) ہے۔ بڑی محنت سے اور بڑی تحقیق سے لکھا گیا ہے لیکن اس کا اردو سے کوئی تعلق ظاہر کیا جاتا تو مناسب تھا۔ عبارت بھی اجنبی لگتی ہے۔ اور دوسرا مقالہ 'معلقاتی شاعری — مستند یا مسترد؟'' ہے۔ اچھا مضمون ہے۔ سمجھ میں آنے والی بات ہے اور مولانا حالی کے مسدس کے ایک بند سے اس میں جان پڑ گئی ہے۔

'صحت و سائنس' (ص 81 تا 83) کے تحت ہنسی کے فوائد گنائے گئے ہیں۔ لیکن قہقہوں سے فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ اس پر ہنسی آتی ہے۔ خیر خیال اپنا اپنا۔ شہ سرخی 'کتابوں کی دنیا' (ص 84 تا ص 92) میں کوئی دس کتابوں پر تبصرے درج ہیں تا کہ ان کی روشنی میں مطلوبہ کتاب یا کتب حاصل کی جا سکیں۔ جبکہ 'خبر نامہ' (ص 93 تا ص 98) کے تحت قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں بیان کی گئی ہیں جن میں اردو تعلیم سے متعلق قومی اور علاقائی خبریں اور وفیات درج ہیں۔

❖ **مصطفیٰ ندیم خاں غوری**: گرین ویلی، روضہ باغ، اورنگ آباد، مہاراشٹر

ماہنامہ 'اردو دنیا' کے مدیر وغیرہ ہمیشہ ہندو مسلم سکھ عیسائی وغیرہ کی مذہبی و قومی یک جہتی و گنگا جمنی تہذیب و تمدن کے حامی و پاسبان رہے ہیں۔ ماہ مئی کے شمارے میں جناب سجاد احمد نجار نے ہندوستان کی مشترکہ تہذیب و معاشرت کو اردو شاعری میں بخوبی نشان زد کیا ہے۔ اسی طرح جولائی کے شمارے میں محترمہ شاذیہ عمیر نے اپنے مضمون میں تہذیب و تاریخ کے آئینے میں سنسکرت زبان کے پنچ تنتر، موسوم شہرہ آفاق گرنتھ میں جنگلی جانوروں مثلاً شیر، گیدڑ، ہاتھی، مور، سانپ، مینڈک اور کبوتر، کوے وغیرہ، پرندوں کے توسط سے انسانی فطرت و خصلت کو بے نقاب کرتے ہوئے موجودہ زمانے کے مسائل کے حل بھی مزید پیش کیے ہیں۔ اسی شمارے کا خاص مضمون جناب ابوبکر

عباد کا ہے جس میں ہندو اساطیر کو اردو افسانوں میں مثالوں کے ساتھ نشان زد کرنے میں بلا کی کامرانی حاصل کی گئی ہے۔ جناب آل احمد سرور، سردار راجندر سنگھ بیدی، ممتاز شیریں، سلام بن رزاق، انتظار حسین و جوگندر پال کے افسانوں میں ہندو اسطورہ کے استعمال کا مفصل بیان قابل مطالعہ ہے۔ صفحہ 60 پر 'جنگل' لفظ (اول کالم) کی بجائے 'چنگل' اور 'یک لویۓ دیومالائی کردار کا نام ایک لویہ درج کرنا ہی درکار تھا۔ آخری کالم میں ص 61 پر 'یشودھا' نام کی جگہ 'یشودا' صحیح نام ہونا چاہیے تھا۔ اس طرح ص 61 پر 'گھڑیا' جمع اسم لفظ 'گھڑیاں' درکار تھا۔ تمام افسانوں میں فی زمانہ حالات و مسائل سے مطابقت ایک جمع لفظ گردانا جائے گا۔

محترمہ مہر فاطمہ نے بھی مختلف دیومالائی عناصر، بالخصوص شری رام کے کردار کی اردو شاعری میں جاندار و شاندار خط کشی کی ہے۔ فقط اول کالم میں رسم اسم مونث عربی لفظ کے جمع لفظ 'رسوم' کا دوبارہ لایعنی اعادہ کرکے رسومات درج کرنے کی ایک ہی غلطی چلی گئی ہے۔ چکبست لکھنوی کی نظم کا اقتباس طویل ہونے کے باوصف از حد متاثر کن اور محترمہ کے حسنِ انتخاب کا احسن ضامن کہا جائے گا۔

❖ **ڈاکٹر کرشن بھاوک** : کوٹھی نمبر 201-A، گورونانک نگر گلی نمبر 18-K، 201-A، پٹیالہ (پنجاب)

ماہ جولائی کا شمارہ اردو دنیا ملا۔ آپ نے مشاہیر کے انٹرویوز کا جو سلسلہ شروع کیا ہے، بہترین ہے، قومی کونسل کے تمام پرچے بہت شاندار اور نئے نئے اچھوتے مضامین پر مبنی ہوتے ہیں، ان کو پڑھ کر ہم کو لکھنے کے لیے ایک نئی راہ فراہم ہوتی ہے، اس شمارے میں شمس کمال انجم کا مضمون، علم نحو کی سب سے پہلی کتاب، الکتاب بڑا معلوماتی ہے جس کو پڑھ کر مزہ آ گیا، کرونا کے اس وبائی دور میں آپ نے جس انداز سے ادارے کو فعال بنا رکھا ہے وہ قابل تحسین ہے،

ایک رائے میگزین کے سلسلے میں آپ کے سامنے رکھنا چاہوں گا، اردو دنیا کے پرچہ میں بیک گراؤنڈ کلر کی وجہ سے مضمون پڑھنا مشکل ہوتا ہے، اگر اس کو سادہ رکھا جائے تو زیادہ بہتر ہے، ایک اور بات کہ قومی کونسل کے میگزین ایک ماہ گزرنے کے بعد ہی ویب سائٹ پر اپلوڈ کیے جائیں، تاکہ زیادہ سے زیادہ خریدار بن سکیں۔

اسعد ہاشمی، سرونج، مدھیہ پردیش

رسالہ 'اردو دنیا' اردو رسائل کے درمیان ایک اہم حیثیت رکھتا ہے اور اسے عظمت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ یہ عالمی اردو داں طبقے کو عوامی ماحول میں لے جاتا ہے۔ یہ رسالہ نہیں بلکہ بحر العلوم معلوم ہوتا ہے۔ ہر شمارے میں ادبی و علمی مشمولات کے علاوہ ٹکنالوجی، کمپیوٹر، سائنس، کامرس، معاشیات، ماحولیات، قانون، تنقید، تحقیق پر مواد دستیاب ہوتا ہے۔ البتہ تحقیق کے فن اور اردو میں تحقیقی سرمایے اور ماہرین و محققین کے تعلق سے ایک گوشے یا نمبر کا اجرا کریں۔ یہ گوشہ یا نمبر اسکالرز کے لیے نعمت سے کم نہیں ہوگا۔ اس رسالے کے مضامین تحقیق، تنقید اور حوالہ جات کے لیے معتبر و مستند مواد رکھتے ہیں۔ اس نے اپنے مشمولات کے ذریعے اردو کو ٹکنالوجی سے مربوط کیا ہے۔ اداریہ، خطوط، زبان و تعلیم، نقد و نگاہ، اکیسویں صدی اور اردو، صدی شخصیت، شمس و قمر، یادِ رفتگاں، سلسلۂ صحافت، خصوصی گفتگو، سماجیات، نیا آسمان نئے ستارے، دیگر زبانوں سے، کتابوں کی دنیا اور خبرنامہ جیسے مشمولات فکر انگیز معنویت لیے ہوئے ہیں۔ 100 صفحات کے شمارے میں ہمہ نوعیت و تنوع لیے مواد و مضامین ملیں گے۔

ڈاکٹر محمد ناظم علی: مکان نمبر 17-7-335، برہمن واڑی، یاقوت پورہ، حیدرآباد،

ماہنامہ 'اردو دنیا' شمارہ جون 2021 دیکھا۔ بڑا دلکش اور جاذب نظر ہے۔ سرورق بے حد خوبصورت ہے۔ ہماری بات کے تحت جناب شیخ عقیل احمد نے بجا فرمایا کہ مادیت اور صارفیت کے اس دور میں بڑھتے آلات و وسائل نے احساس و مروت جیسے جذبات کو کچل کر رکھ دیا ہے۔ ریاض احمد کا 'اسکولی تعلیم کی تشکیل' سچ پر مبنی مضمون ہے۔ سید عینین علی حق کا مضمون 'مفتی صدرالدین خاں آزردہ' مذہبی ادبی اور قومی جذبات بہت خوب ہے۔ محمد محسن رضا کا 'تلوک چند محروم اور ادب اطفال' معلوماتی مضمون ہے۔ شہاب ظفر اعظمی نے 'اکیسویں صدی میں ہندوستان کا اردو افسانہ' میں افسانہ لکھنے والوں کی ہر نسل پر کما حقہ روشنی ڈالی ہے۔ یادِ رفتگان میں عظیم راہی نے 'قمر اقبال فرض مٹی کا چکانے کے لیے زندہ ہوں' پر لطف اور بار بار پڑھنے کی چیز ہے۔ خبرنامے کے تحت روئیے کس کے لیے کس کس کا ماتم کیجیے (ایک صفحہ رفتگاں کے نام) پڑھ کر از حد دکھ ہوا۔ کل تر سٹھ معتبر اشخاص داغ مفارقت دے گئے جو ادبی دنیا کے لیے عظیم خسارہ ہے۔ خدا مرحومین کو جوارِ رحمت میں جگہ عطا کرے۔ آمین۔

اس شمارے میں آصف مبین، اے۔ آر محمد عادل، محمد یٰسین، رئیس فاطمہ وغیرہ کے مضامین شامل ہیں۔ ماشاء اللہ سارے مضامین لائق مطالعہ ہیں۔ خطوط، خبرنامہ، کتابوں کی دنیا وغیرہ۔ غرض اردو دنیا کا یہ شمارہ اپنے قابل قدر مشمولات کے سبب پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ قلمکاروں کو ماحولیات پر بھی لکھنے کی سخت ضرورت ہے۔

معین الدین شمسی: گمہلو، جھلاڈیہ، گانڈے، ضلع: گریڈیہ، جھارکھنڈ

جن کتابوں نے متاثر کیا

ماہنامہ 'اردو دنیا' کا نیا سلسلہ

ہزاروں کتابوں میں چند ہی کتابیں ایسی ہوتی ہیں جو آپ کے ذہن و دل کی دنیا بدل دیتی ہیں۔ ایسی کتابوں کی قوت، اہمیت و معنویت کو قارئین سے شیئر کرنے کے لیے 'اردو دنیا' میں ایک نیا سلسلہ شروع کیا جا رہا ہے۔ جس میں مختلف اصناف پر مشتمل نئی اور پرانی کتابوں کے بارے میں صاحبان علم و ہنر یہ بتائیں گے کہ کن کتابوں نے انھیں متاثر کیا ہے۔

صاحبانِ ذوق کتاب کے اسلوب، موضوع اور دیگر تلازمات کے علاوہ یہ بھی بتائیں گے کہ یہ کتابیں کیوں پڑھنی چاہئیں۔ آپ نے ابھی تک جتنی کتابیں پڑھی ہیں ان میں سے چند کا انتخاب کیجیے اور اپنے مطالعاتی سفر میں ان افراد کو بھی شامل کیجیے جن تک شاید ان کتابوں کی رسائی نہیں ہو پاتی ہے۔ منتخب کتابوں کے تعلق سے اپنے منطقی و معروضی خیالات اور تاثرات ہمیں لکھ بھیجیے۔

قلمکاروں سے چند معروضات

ماہنامہ 'اردو دنیا' علمی اور ادبی مجلہ ہے جس میں ادبیات، سماجیات، اقتصادیات، تہذیب و ثقافت، تعلیم و تدریس، زبان و لسانیات، سائنس و ٹکنالوجی، طب و فلسفہ، فنونِ لطیفہ، نفسیات، زبان کی زمینی صورت حال، عالمی ادبیات اور دیگر موضوعات پر مضامین شائع کیے جاتے ہیں۔ یہ خالص علمی اور ادبی نوعیت کا رسالہ ہے۔ اس میں مذہبی مباحث اور متنازعہ فیہ مسائل پر مضامین کی اشاعت کی گنجائش نہیں ہے۔ یہ رسالہ صرف 100 صفحات پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس رسالے میں پوری اردو دنیا کے دانشوروں، ادیبوں اور قلمکاروں کی تحریریں اشاعت کے لیے موصول ہوتی ہیں۔ بہت سے مضامین اشاعت کے لیے منظور کر لیے جاتے ہیں لیکن بہت سی تحریریں اشاعت سے محروم رہ جاتی ہیں۔ بہ کثرت مضامین موصول ہونے کی وجہ سے ادارے کو بہت سی دقتوں کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے قلمکاروں سے گذارش ہے کہ اپنی تحریریں بھیجتے وقت مندرجہ ذیل امور کا بطورِ خاص لحاظ رکھیں۔

- مضمون غیر مطبوعہ ہو۔ کسی اخبار/ مجلے میں ارسال نہ کیا گیا ہو اور نہ ہی اپنی یا کسی مرتب کردہ کتاب میں شامل ہو۔
- مضمون ادارے کے مزاج، معیار اور پالیسی کے منافی نہ ہو۔
- مضمون ان پیج پروگرام میں ہو اور 2500 (پچیس سو) الفاظ سے کم اور 4000 الفاظ سے زیادہ نہ ہو۔
- مضمون میں اعداد و شمار رومن میں لکھیں اور مضمون کے آخر میں حوالے/ حواشی (کتب اور مضامین) کا اندراج ضرور کریں۔
- اچھوتے، نئے اور اہم موضوعات پر بھیجے ہوئے مضامین ترجیحی طور پر شائع کیے جائیں گے اور عمومی نوعیت کے مضامین کی اشاعت موصول ہونے کی ترتیب کے لحاظ سے کی جائے گی۔
- ایسے موضوعات یا شخصیات پر مضامین کی اشاعت ممکن نہیں جن پر بہ کثرت کتابیں یا مقالے شائع ہو چکے ہوں۔ ایسے موضوعات/شخصیات پر مضامین بھیجتے وقت چند سطروں میں نئے نکات اور نئے زاویے کی نشاندہی لازمی ہوگی۔
- جن مضامین میں زبان و بیان کی خامیاں اور حقائق، حوالے املا جملہ کی غلطیاں ہوں گی انھیں کسی بھی صورت میں اشاعت کے لیے منظور نہیں کیا جائے گا۔
- مضمون میں اشعار اور اقتباس کی صحت کا التزام اور ضرورت سے زیادہ اشعار اور اقتباسات سے پرہیز لازمی ہے۔
- شخصیات پر مضمون بھیجتے وقت متعلقہ فنکار کی تصویریں، کتابوں کا عکس اور دیگر ضروری معلومات ضرور ارسال کریں۔
- شہر یا ادارے پر لکھتے ہوئے اس سے متعلق تصاویر اور دیگر اہم معلومات لازمی بھیجیں۔
- درج ذیل تصدیق نامہ موصول ہوئے بغیر مضمون کی اشاعت پر غور نہیں کیا جائے گا:

''میرا مضمون غیر مطبوعہ ہے۔ کسی اخبار/ مجلہ/ اپنی یا مرتب کردہ کتاب میں شامل نہیں ہے۔ یہ کسی کتاب/ مضمون کا سرقہ یا چربہ نہیں ہے۔ اگر کچھ نقص پایا گیا تو اس کے لیے میں خود ذمہ دار ہوں گا/ ہوں گی۔''

- کسی دوسری زبان کا ترجمہ اصل متن کے ساتھ ارسال کریں اور مصنف کا اجازت نامہ بھی منسلک کریں۔
- مضمون میں پہلے یا آخری صفحے پر مضمون نگار کا نام، مکمل پتہ مع پن کوڈ (انگلش میں) اور موبائل نمبر ضروری ہے۔

مضمون کی حتمی منظوری ایڈیٹوریل ریویو کے بعد ہی دی جائے گی۔

قلمکار حضرات اخلاقی ضوابط Ethical guidelines کا پورا خیال رکھیں۔

—ادارہ

صغیر افراہیم

سر سید کے زینو بھیا

(سید زین العابدین)

(14 جون 1832 - 27 ستمبر 1905)

موجودہ ترقی یافتہ دور میں ہر روز یادگاری جلسے ہوتے ہیں۔ دولت مندوں، جنگی سورماؤں، فلمی ہستیوں پر، علاقائی سیاست، لسانی اہمیت، سماجی اور ثقافتی ضرورت پر۔ تحریکات، رجحانات، نظریات یا پھر ان سے وابستہ شخصیات پر سمیناروں کا ایک سلسلہ ہے۔ شہرت کے لحاظ سے اِن برپا ہونے والے یادگاری جلسوں میں اُن چھوٹے بڑے ادیبوں اور دانشوروں کو بھی شامل کرلیا جاتا ہے جو اپنی تشہیر اور تعلقات اور معاملات کے تانے بانے بُننے اور اُن کا پروپیگنڈا کرنے میں ماہر ہوتے ہیں۔ انھیں اعزازات اور انعامات سے نوازا جاتا ہے، جشن ہوتے ہیں، مقدس یادوں کا سیلاب امنڈتا ہے اور پھر ان سب کو یکجا کرنے کے لیے کتابیں ترتیب دی جاتی ہیں، یادگاری مجلّے نکلتے ہیں، سمینار، ویبینار منعقد ہوتے ہیں، البتہ ان دنیاوی منصوبوں کے تناظر وتفکر میں وہ شامل نہیں ہونے پاتے جو حرص وہوس اور شہرت ومقبولیت سے دُور، تعمیری وتشکیلی خدمات انجام دینے میں مشغول رہتے ہیں اور علمی، اصلاحی، فلاحی مقاصد کو پائیداری عطا کرنے کے لیے بھیڑ بھاڑ اور چمک دمک کے ماحول سے خود کو ممکن حد تک الگ رکھتے ہیں۔ اس عمل سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے ابن الوقت، ابوالوقت کی گوشہ نشینی کے اصل مقصد کو فراموش کرتے یا پھر اُن کو اپنے توسط سے اُجاگر کرتے ہیں لیکن نظامِ فطرت ایسے مجاہدِ علم وعمل کے دامن میں رنگا رنگ گُل بوٹے ٹانکنے اور قدم بوسی کے لیے مجبور ہوتا ہے۔

دراصل آج ضرورت ایسے ہی کرداروں کو ابھارنے اور نفسا نفسی کی بھیڑ میں گُم ہوجانے والی شخصیات کی بے لوث خدمات اُجاگر کرنے کی ہے جنھوں نے اپنے آپ کو انسانی خدمت کے لیے وقف کردیا تھا۔ ایسا کرکے ہم نہ صرف اُن کے عزم وحوصلے کا اعتراف کریں گے بلکہ نئی نسل کو ایک تعمیری سوچ بھی مہیا کریں گے۔ اس مثبت قدم سے ہم پردۂ خفا میں رہنے والی شخصیات کی عزت نہیں بڑھائیں گے بلکہ خود اپنی علم دوستی اور مردم شناسی کے طرۂ دستار میں انسانیت اور شرافت کے پھول سجالیں گے۔ اور اس عملِ صالح سے خودستائی اور خودنمائی کے غبار کو تھوڑا کم کرسکیں گے۔

> شخصیت کو احاطۂ تحریر میں لیں تو سید زین العابدین، مفتیوں کے جعفری خاندان میں 14 جون 1832 مطابق 12 محرم الحرام 1248ھ کو محلہ قضیانہ، قصبہ مچھلی شہر، ضلع جونپور میں پیدا ہوئے۔ دادا، سید محمد حسن اور والد سید محمد حسین، عربی وفارسی کے عالم تھے۔ گھر کا ماحول مذہبی تھا۔ والدہ کا تعلق دُور دراز واسطے سے سرسید احمد خاں کے خاندان سے تھا۔ ابتدائی تعلیم قریب کے مدرسے میں اور ثانوی تعلیم قصبہ کے اسکول میں حاصل کی۔ وکالت کی ڈگری کلکتہ یونیورسٹی سے لی۔

ایسے ہی نامور مگر گوشہ نشین شخصیات میں ایک نمایاں نام سید زین العابدین کا ہے، جنھوں نے اپنی 73 سالہ زندگی کا بیشتر حصہ نمود ونمائش سے بچاتے ہوئے ملک وملت کے نام وقف کردیا تھا۔ شاید اسی سبب اُن سے متعلق ادبی، علمی اور تعمیری خدمات کا افسوس ناک حد تک فقدان ہے۔ پھر بھی اس تشنہ پہلو پر حالی، اسماعیل پانی پتی، مرزا حیرت جھنجھانوی، شیخ محمد عبداللہ، سرراس مسعود، عبدالباقی، مولوی بشیر الدین، اخلاق احمد، عبداللہ جان، مولوی عبدالماجد، مصطفیٰ حسین منظر، مقتدیٰ خاں شروانی، ظفر علی خاں، نقاش کاظمی، نواب احمد سعید خاں چھتاری، غلام پنجتن، جسٹس ہدایت اللہ، فرخ جلالی، اشتیاق عارف، افتخار عالم، اصغر عباس، کی تحریروں سے روشنی پڑتی ہے۔ اس روشنی میں جہانِ عابدین کو احاطۂ تحریر میں لینے کے کئی زاویے بنتے ہیں۔ مثلاً بچپن کے واقعات، مدرسے کے احباب، مختلف شہروں کی کیفیات، مناصب، عدالتی خدمات، سماجی سروکار، سرسید سے وابستگی، علی گڑھ تحریک کو استحکام شامل ہوسکتے ہیں۔

شخصیت کو احاطۂ تحریر میں لیں تو سید زین العابدین، مفتیوں کے جعفری خاندان میں 14 جون 1832 مطابق 12 محرم الحرام 1248ھ کو محلہ قضیانہ، قصبہ مچھلی شہر، ضلع جونپور میں پیدا ہوئے۔ دادا، سید محمد حسن اور والد سید محمد حسین، عربی وفارسی کے عالم تھے۔ گھر کا ماحول مذہبی تھا۔ والدہ کا تعلق دُور دراز واسطے سے سرسید احمد خاں کے خاندان سے تھا۔ ابتدائی تعلیم قریب کے مدرسے میں اور ثانوی تعلیم قصبہ کے اسکول میں حاصل کی۔ وکالت کی ڈگری

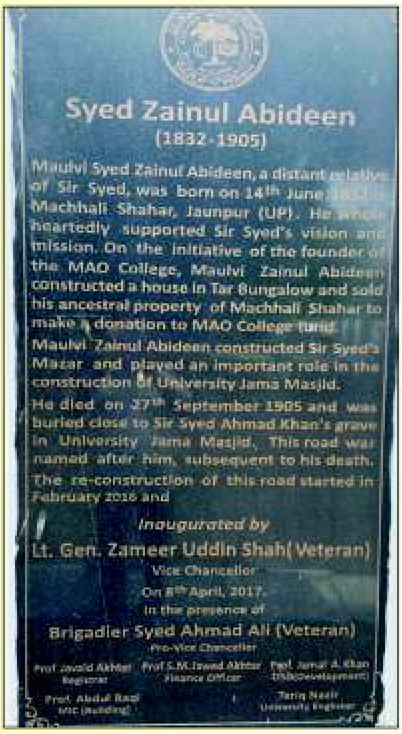

کلکتہ یونیورسٹی سے لی۔

ملازمت کا آغاز بنارس سے ہوا۔ مرزا پور، بریلی، غازی پور، شاہجہاں پور، مرادآباد میں پوسٹنگ رہی۔ سب جج کی حیثیت سے 1885 میں ریٹائر ہوئے۔ اعزازی طور پر جج کہلائے۔ حکومتِ وقت کی جانب سے خان بہادر کا خطاب ملا۔ پنشن کے ساتھ تین سال ریاست رامپور کی جوڈیشیل کونسل کے ممبر بنے۔ 1889 میں مستقل طور پر علی گڑھ آگئے۔

ذمے داری کا احساس اس سے بھی عیاں ہے کہ اہل وعیال کے ساتھ ساتھ تمام متعلقین کا بھی پورا خیال رکھتے تھے۔ اُن کے چار بیٹے اور پانچ بیٹیاں تھیں۔ آل اولاد کی پرورش کے ساتھ اُن کی نگہداشت سے وابستہ افراد کو بھی ممکن مدد پہنچاتے۔ سب سے بڑے بیٹے سید زین الدین ڈپٹی کلکٹر ہوئے۔ 1939 میں اُن کا علی گڑھ میں انتقال ہوا۔ یونیورسٹی قبرستان میں تدفین ہوئی۔ عبدالباقی، اخلاق احمد، خان بہادر مولوی بشیر الدین، مقتدیٰ خاں شروانی، نقاش کاظمی کی تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ میرس روڈ پر انھوں نے ''حمید منزل'' کے نام سے جو مسکن بنوایا تھا، اُسے ان کی بیٹی رفیقہ بیگم نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو دے دیا تھا۔ دوسری روایت کے مطابق حمید منزل نہیں بلکہ اُس کوٹھی کا نام حامد منزل تھا جو عبداللہ گرلس کالج کے چوراہے پر واقع تھی اور جسے یونیورسٹی نے رفیقہ بیگم سے خرید لیا تھا۔ بہرحال سید ضیاء الدین اور سید نور الدین بھی اعلیٰ منصب پر فائز رہے۔ چوتھے بیٹے سید عین الدین نے آئی سی ایس افسر کی حیثیت سے تمام ذمے داریوں کو بخوبی نبھاتے ہوئے اپنے والد کا نام روشن کیا۔ سید عین الدین کا 1952 میں انگلستان میں انتقال ہوا۔ اُن کے بیٹے سید عین العابدین، سرسید نگر علی گڑھ میں یکم جنوری 1983 کو، 62 سال کی عمر میں رحلت فرماگئے۔ بیٹیوں نے بھی اعلیٰ تعلیم حاصل کی خصوصاً بیٹی واجدہ بیگم اور اُن کی بیٹی ساجدہ بیگم اعلیٰ ادبی ذوق رکھتی تھیں۔ چوتھی نسل کی نمائندگی میں نمایاں نام سید نور العابدین اور طیبہ عابدین کے شامل کیے جاسکتے ہیں تو پانچویں پشت میں حنا قدوائی جیسے کئی نام سامنے آتے ہیں۔

سید زین العابدین کی مثالی شخصیت بننے کے مدارج مرادآباد سے شروع ہوتے ہیں، جہاں وہ سرسید کے قریب آتے ہیں۔ 1861 کی ابتدا میں سرسید کی اہلیہ پارسا عرف مبارک بیگم کا مُرادآباد میں انتقال ہوتا ہے اور اسی برس زین العابدین کی بیگم اس جہانِ فانی سے رخصت ہوتی

ہیں۔ دونوں کی تدفین فیض گنج روڈ پر واقع شوکت باغ حویلی کے پاس، دور سہی مگر مسجد کے سائے میں ہوتی ہے۔

سید زین العابدین کی مثالی شخصیت بننے کے مدارج مرادآباد سے شروع ہوتے ہیں، جہاں وہ سرسید کے قریب آتے ہیں۔ 1861 کی ابتدا میں سرسید کی اہلیہ پارسا عرف مبارک بیگم کا مُرادآباد میں انتقال ہوتاہے اور اسی برس زین العابدین کی بیگم اس جہانِ فانی سے رخصت ہوتی ہیں۔ دونوں کی تدفین فیض گنج روڈ پر واقع شوکت باغ حویلی کے پاس، دور سہی مگر مسجد کے سائے میں ہوتی ہے۔ کتبے پر درج ہے ''سرسید کی اہلیہ کے پہلو میں ان کی عزیز ترین سہیلی اور رازدار، اہلیہ مولانا زین العابدین دفن ہیں۔''

کتبے پر درج ہے ''سرسید کی اہلیہ کے پہلو میں ان کی عزیز ترین سہیلی اور رازدار، اہلیہ مولانا زین العابدین دفن ہیں۔'' اس سے اس کا بھی علم ہوتا ہے کہ جیسے ایک سہیلی دوسری کی جُدائی برداشت نہیں کرسکی، اور بعد از مرگ ہمیشہ کے لیے دونوں ایک جگہ آرام فرما ہوئیں۔ اکتوبر 1863 میں سرسید، نواب عبداللطیف کی محمڈن لٹریری سوسائٹی کی دعوت پر 'ترغیب تعلیم انگریزی' کے موضوع پر خطبہ پیش کرنے کے لیے کلکتہ گئے تھے۔ وہاں کی تعلیمی ترقیات سے وہ اس حد تک متاثر ہوئے کہ تین ماہ بعد غازی پور میں انھوں نے محمد عبدالصمد، حافظ محمد علی قادری اور دیگر بہی خواہان کی مدد سے سائنٹفک سوسائٹی کا خاکہ تیار کیا، جس نے جلد ہی عملی شکل اختیار کی۔ 1864 میں زین العابدین اس سائنٹفک سوسائٹی کے ممبر بنے۔

شخص سے دل پذیر شخصیت بننے کے مدارج طے کرنے پر مثالی کردار وجود میں آتا ہے۔ زین العابدین کا یہ اعلیٰ انسانی کردار سرسید کی قربت کا رہین منت ہے۔ وہ 1864 میں فکری اور عملی طور سے سرسید سے وابستہ ہوئے۔ 1889 میں سرسید کی درخواست پر باقاعدہ علی گڑھ منتقل ہوئے، اور پھر اپنے آپ کو باغ سرسید کی آبیاری کے لیے وقف کردیا۔ انھیں علم تھا کہ 1876 میں سرسید نے علی گڑھ کو وطن ثانی بنالیا ہے اور اب اُن کی مستقل توجہ ایم اے. او. کالج اور قوم کی تعلیم وتربیت پر مرکوز ہوچکی ہے۔ 1883 میں جب سرسید نے 'محمڈن سول سروس فنڈ' قائم کیا تو زین العابدین نے بے حد خوشی کا اظہار کیا بلکہ سول سروس کے امتحان میں شرکت کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کے لیے خط لکھا اور چندہ بھی ارسال کیا۔ اُن کے ریٹائر ہونے سے چند ماہ قبل اطلاع ملی کہ سرسید کو لارڈ فرن نے سول سروس کمیشن کا ممبر مقرر کیا ہے، تو وہ اس خبر سے باغ باغ ہوگئے۔ زین العابدین ریاست رامپور کی جوڈیشیل کونسل کے ممبر کی حیثیت سے رامپور میں مقیم تھے کہ سرسید نے انھیں سید محمود کی شادی میں شرکت کے لیے مدعو کیا، اور ساتھ ہی ساتھ یہ درخواست بھی کی کہ آپ میرا ہاتھ بٹانے کے لیے اب مستقل طور پر علی گڑھ آجائیے۔ زین العابدین نے ان کی دعوت پر لبیک کہا اور اگلے

سال 1889 میں علی گڑھ آ گئے۔

علی گڑھ تحریک کے اساسی پہلو اُجاگر کرنے کے لیے عہدِ سرسید کو مختلف زاویوں سے پیش کیا گیا ہے۔ رفقائے سرسید، احباب سرسید، معاون و مددگار اور دستِ راست سرسید پر ان گنت تحریریں موجود ہیں۔ خود سرسید نے اپنے رفیقوں کا ذکر بڑی اپنائیت اور خلوص کے ساتھ کیا ہے لیکن اعتبار، اعتماد، محبت اور جھنجھلاہٹ کا جو برملا اظہار زین العابدین کی شکل میں اُبھرتا ہے، وہ اُن کے دیگر احباب کے ذکر میں جلوہ گر نہیں ہونے پاتا ہے۔ ثبوت کے طور پر سرسید کے اُس خط کا اقتباس ملاحظہ ہو جو انھوں نے 26 اپریل 1894 کو لکھا تھا:

''مکرمی زینو بھیا

ابھی تمھارا خط پہنچا، کچھ شبہ نہیں کہ تم کو مجھ سے جُدا ہونے کا ایسا ہی رنج ہے جیسا کہ تم نے لکھا، مگر تم تو اُس رنج کو کسی قدر لکھ بھی سکے، مگر مجھ کو تمھارے چلے جانے سے جو رنج ہے وہ لکھا بھی نہیں جاسکتا۔ زبان کھجلاتی ہے اور کوئی یہاں نہیں کہ اُس کو بُرا کہوں۔ دل میں غصہ آتا ہے اور کوئی یہاں نہیں ہے جس پر غصہ نکالوں۔ ہاتھ کھجلاتے ہیں اور کوئی یہاں نہیں ہے جس کو ماروں۔ حقیقت میں تمھارے جانے سے مکان سونا نہیں ہوا بلکہ دل سُونا ہوگیا۔ صبح اُٹھ کر خدا یاد نہیں آتا مگر تم یاد آتے ہو۔''

اسلامیہ انٹر کالج اٹاوہ کے بانی ڈاکٹر مولوی بشیر الدین جنھوں نے علی گڑھ تحریک کا ابتدائی دور اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اُن کا سرسید اور رفقائے سرسید کے ساتھ بہت قریبی اور گہرا ربط تھا۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی (صدر شعبۂ اردو، نگراں علی گڑھ میگزین) نے بشیر صاحب کی ضعیفی کے باوجود سید والا گہر اور ان کے احباب کے تعلق سے اپنے تاثرات بیان کرنے کی درخواست کی جسے انھوں نے قبول کیا۔ میگزین کے ایڈیٹر نسیم قریشی نے ایڈیٹوریل بورڈ کے ممبر نثار قریشی کو اس کام پر مامور کیا اور انھوں نے کئی نشستوں میں بشیر صاحب کے تاثرات کو قلم بند کیا، جنھیں 'علی گڑھ تحریک کے معمار' کے عنوان سے مذکورہ میگزین کے خصوصی شمارے (55 تا 1953) میں شائع کیا گیا۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

''زین العابدین دبلے پتلے تھے، قد لمبا تھا، داڑھی لمبی تھی، بڑے خوش مزاج، وضع دار اور شریف طبیعت انسان تھے۔ اُن کا ذکر آتا ہے تو محبت و شرافت کی زندہ تصویر نگاہوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔''

مولوی بشیر الدین مزید فرماتے ہیں:

''مولوی زین العابدین کی ذات محبت و فداکاری کا پیکر جمیل تھی۔ یہ گویا سرسید میں اس قدر کھو گئے تھے کہ من تو شدم تو من شدی کا نقش اُبھر آیا تھا۔ سرسید بھی ان کو بے انتہا چاہتے تھے۔ زینو کہہ کر پکارتے تھے۔ اکثر فحش قسم کا مذاق بھی ہوتا تھا۔ سرسید سے ان کے عشق کا یہ عالم تھا کہ جب سرسید کا انتقال ہوا، اور ان کا مزار بننے لگا تو یہ دھوپ میں چھتری لیے بیٹھے رہتے تھے اور سارا سارا دن اسی طرح گزار دیتے تھے۔ مولوی زین العابدین نے اپنی دولت، قوتِ عمل اور محبت سے سرسید کے کاموں میں جو آسانیاں پیدا کیں، وہ اُن کی فداکاری کا ایک روشن نمونہ پیش کرتی ہیں''۔ (ص 255)

سرسید کے ہم نوا، قدم سے قدم ملا کر چلنے والے، ان کے خلاف ہونے والے اعتراضات کا مدلل جواب دینے، اور تمام حساب کتاب رکھنے والے، مثبت سوچ کے مالک، زین العابدین نے، عمر کے آخری پڑاؤ میں اپنی اکلوتی بہن کو اُس کا حصہ دے کر جو جائیداد بچی اُسے فروخت کر کے سرسید کے مشورے سے ایک ایکڑ زمین خریدی جس میں پکی اینٹوں سے بنگلہ بنا تھا، چھت پھوس سے ڈھکی ہوئی تھی۔ حفاظت کے خیال سے انھوں نے میدان کے چاروں طرف خاردار تاروں سے احاطہ بندی کرائی جس کی وجہ سے وہ تار والے بنگلے کے نام سے مشہور ہوا۔ سرسید کی وفات سے قبل انھوں نے بنگلے کو ایم. اے. او. کالج کے نام وقف کر دیا، اس وصیت کے ساتھ کہ میرے بعد میری اولاد نہ تو اس جائیداد کی حقدار ہوگی اور نہ اپنے تصرف میں لا سکے گی۔ اولاد در اولاد تربیت ایسی کہ انھوں نے نہ صرف وصیت پر فخر کیا بلکہ ہمیشہ ادارے کے لیے کچھ کرنے کی سعادت تلاش کرتے رہے۔

یادگار عمارتوں کا انحصار ان کی پائیدار بنیاد اور مضبوط ستون پر ہوتی ہے۔ نقش و نگار اور چمک دمک کا ذکر تو عام طور پر کیا جاتا ہے، مگر اساس اور اساسی ستون کا ذکر اس اہتمام سے نہیں کیا جاتا ہے۔ علی گڑھ تحریک کی تعمیر و تشکیل میں زین العابدین نے بڑا کردار ادا کیا ہے۔ سرسید مردم شناس اور معاملہ فہم انسان تھے۔ اس لیے وہ ادارے کو ایک ظاہری شکل دینے اور اس کے تنظیمی ڈھانچے کو زین العابدین کے سپرد کر کے مطمئن ہو گئے تھے۔ سرسید کے پیش نظر اُن کے مناصب، عدالتی اور سماجی خدمات کے ساتھ اُن کا بے لوث جذبہ تھا، زین العابدین سرسید کی توقعات پر پورے اُترے اور انھوں نے زندگی کے آخری سترہ برس باغِ سرسید کی آبیاری میں صرف کیے۔ مبصرین رقم طراز ہیں کہ وہ علی الصباح ٹہلنے نکلتے، تعمیرات کا معائنہ کرتے، پھر دن بھر کے منصوبے بناتے۔ اُن کے عزم و حوصلے کو دیکھ کر بیماری بھی اُن کے سائے سے گریز کرتی تھی۔ 1904 میں قوتِ مدافعت لڑکھڑائی۔ بیمار ہوئے، اور سخت بیمار ہوئے۔ انھی دنوں سر لاٹوش، لیفٹیننٹ گورنر صوبہ جات متحدہ (موجودہ اتر پردیش)، ممتاز بورڈنگ ہاؤس کا سنگ بنیاد رکھنے کے لیے علی گڑھ آئے تھے۔ صحت کی خرابی کی اطلاع ملتے ہی سب سے پہلے عیادت کو پہنچے۔ پھر سنگِ بنیاد رکھا۔ انھوں نے آرام کا مشورہ دیا، مگر زین العابدین آرام کو حرام سمجھتے تھے۔ بیماری نے طول پکڑا اور وہ 27 ستمبر 1905، مطابق 2 رجب 1323ھ کو اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملے۔ رفقا نے اس کا خیال رکھا کہ جس طرح دونوں کی بیگمات ایک ہی احاطہ میں (مراد آباد میں) آرام فرما ہیں، اسی طرح، ایک دوست کی اپنے عزیز ترین دوست کے قریب، تدفین ہونی چاہیے۔ ان کی تدفین کا یہ عمل اس کا غماز ہے کہ زین العابدین جس طرح حیات میں سرسید کے بے حد قریب تھے، اسی طرح بعد از مرگ بھی ان کے قریب ہیں۔

■

Prof. Sagheer Afraheim
Ex. Head Dept. of Urdu
Aligarh Muslim University
Aligarh - 202001 (UP)
Email.: s.afraheim@yahoo.in

سعید رحمانی

اکیسویں صدی میں اردو تنقید نگاری کی پیش رفت

ریاستِ اڈیشا کے حوالے سے

ادب کی دیگر اصناف کی طرح تنقید کو بھی صنف کا درجہ حاصل ہے-یہی وہ صنف ہے جو دیگر اصناف کے فن پاروں کی تطہیر کا فریضہ ادا کرتی ہے-اس کا کام کسی بھی فن پارے کی تفہیمِ نو ہے مگر حرفِ آخر نہیں-جن ناقدین نے ادب پاروں کو اپنی عینک سے دیکھنے کی کوشش کی ہے اس کے نتیجے میں کسی فن پارے کا قد اونچا ہوا تو کسی کا سر قلم کیا گیا یا پھر کسی کو نیم وحشی ٹھہرایا گیا-چنانچہ ناقدین کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے فن میں غیر جانبدار ہوں اور دودھ کا دودھ پانی کا پانی کرکے بتائیں-

ادب میں تنقید کو اگرچہ ثانوی حیثیت حاصل ہے، اس کے باوجود اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کیونکہ تنقید ہی معیاری تخلیق کے لیے راستہ ہموار کرتی ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ دونوں ایک دوسرے کا تکملہ ہیں۔تنقید کا تعارف کئی طرح سے پیش کیا جا چکا ہے جس کا ایک معنی فیصلہ صادر کرنا بھی ہے۔مگر اس کا اصل مقصد کسی بھی تخلیق کے محاسن اور معائب کی غیر جانبدارانہ نشان دہی ہے۔اگر ناقد ایک آمر کی طرح فیصلہ صادر کرے تو تنقید کی روح کو ٹھیس پہنچنا ناگزیر ہے۔

ادب کی دیگر اصناف کی طرح تنقید کو بھی صنف کا درجہ حاصل ہے۔یہی وہ صنف ہے جو دیگر اصناف کے فن پاروں کی تطہیر کا فریضہ ادا کرتی ہے۔اس کا کام کسی بھی فن پارے کی تفہیمِ نو ہے مگر حرفِ آخر نہیں۔جن ناقدین نے ادب پاروں کو اپنی عینک سے دیکھنے کی کوشش کی ہے اس کے نتیجے میں کسی فن پارے کا قد اونچا ہوا تو کسی کا سر قلم کیا گیا یا پھر کسی کو نیم وحشی ٹھہرایا گیا۔چنانچہ ناقدین کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے فن میں غیر جانبدار ہوں اور دودھ کا دودھ پانی کا پانی کرکے بتائیں۔اسی بات کو جمیل مظہری نے اپنے شعر میں اس طرح موزوں کیا ہے۔

نہ سیاہی کے ہیں دشمن نہ سپیدی کے ہیں دوست
ہم کو آئینہ دکھانا ہے دکھا دیتے ہیں

مختصراً کہا جائے تو کھرے کھوٹے کے درمیان امتیاز کرنا تنقید کا نصب العین ہے مگر گزشتہ صدی کے ابتدائی برسوں میں تنقید ابتدا سے لے کر ارتقائی مرحلے طے کرنے کے دوران عصبیت اور جانبداری کا شکار رہی۔تنقید کا بنیادی مقصد ہی پسِ پشت جا پڑا۔اس میں خوشگوار تبدیلی بیسویں صدی کی آٹھویں دہائی میں نظر آئی۔منفی رویوں کو ترک کرکے ناقدین نے کشادہ دلی اور لچکدار رویہ اپنایا اور اپنے فن میں غیر جانبداری سے کام لیا۔ان معروضی نظر رکھنے والے ناقدین نے اردو تنقید کو مغربی تنقید کے مقابل کھڑا کرنے میں کامیابی حاصل کی۔اس نوع کے ناقدین میں قمر رئیس کو بلند مقام حاصل ہے۔ان کا کہنا ہے کہ بیسویں صدی کے چوتھے اور پانچویں دہے میں بعض سیاسی ضرورتوں اور وقتی عوامل کے زیر اثر مارکسی تنقیدی رویے میں انتہا پسندی اور میکانیت کا عنصر بڑھ گیا ہے۔ پلیخانوف نے اپنی تحریروں میں فن و ادب کے تخلیقی سرچشموں اور جمالیاتی قدروں کے مطالعوں کا معروضی لیکن محنت طلب طریقِ کار بنایا اور جو مارکسی تنقید کی بنیاد تھا اسے جلد ہی نظر انداز کر دیا گیا۔

ان کے اس خیال سے اس لیے اتفاق کیا جا سکتا ہے کہ ترقی پسندوں کی انتہا پسندی اتنی شدت اختیار کر چکی تھی کہ انھوں نے اردو کے کلاسیکی سرمایے کو بورژوائی ذوق اور زمیندارانہ نظام کی پیداوار قرار دے کر دریا برد کرنے کا حکم صادر فرما دیا۔اس سے آگے بڑھ کر اقبال کو فاشسٹ اور ٹیگور کو فراری بتایا۔اردو شاعری ان کی نگاہوں میں زندگی سے بے تعلق اور عصری مسائل سے بے بہرہ نظر آئی۔ یہ دراصل مارکسی نظریے کی غلط تعبیر کا نتیجہ تھا جس کی بنا پر ترقی پسندوں نے انتہا پسندی کی حد کر دی۔ البتہ بیسویں صدی کے چھٹے دہے میں انھیں اپنی شدت پسندی کا احساس ہوا تو اپنے رویے میں نرمی اور لچک پیدا کی۔ادب کو پروپگنڈہ اور نعرہ بازی کہنے والے یہ حضرات کشادہ دل ہو گئے جسے پریم چند کی کوشش کا نتیجہ ہی کہا جا سکتا ہے۔ پریم چند کا یہ جملہ کہ ''ہمیں حسن کا معیار تبدیل کرنا ہے'' بڑا کارگر ثابت ہوا اور ترقی پسندوں نے اپنے رویے میں مثبت تبدیلی پیدا کی۔

اسی بیسویں صدی میں تنقید کی مختلف جہتیں بھی رونما ہوئیں، جنھیں جمالیاتی تنقید، تاثراتی تنقید، تاریخی تنقید، نفسیاتی تنقید، کلاسیکی تنقید، تقابلی اور تجزیاتی تنقید، عملی تنقید، رومانی تنقید، سماجی یا عمرانی تنقید، مارکسی تنقید، سائنٹیفک تنقید، جدید تنقید وغیرہ وغیرہ سے موسوم کیا گیا۔ ان میں پروفیسر حامدی کاشمیری کی اکتشافی تنقید کو بھی شامل کر لیا جائے جس کو موضوع بنا کر انھوں نے تنقیدی ادب میں ایک نئی بحث کا آغاز کر دیا۔ موصوف کے اکتشافی نظریے کو غور سے دیکھنے پر اس میں کوئی انفرادیت نظر نہیں آتی کیونکہ اس کی جڑیں اسلوبیات، ساختیات، پس ساختیات کے بیشتر مفروضات سے پیوست ہیں۔ اس لیے ان کی اس تھیوری کو منفرد ہونے کا درجہ نہیں دیا جا سکتا۔

بہر حال ان تنقیدی تصورات کی وجہ سے ادب کی تفہیم و تعبیر کے لیے در وا ہونے لگے۔ بشریاتی علوم (Social Science) کے دائرۂ کار میں توسیع کے ساتھ ساتھ تفہیم و تخلیق ادب کی سرحدیں بھی پھیلنے لگیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مروجہ تنقیدی روش کے کلیت پسند عمل سے گریز اور تفہیمی عمل کے رشتوں کو علم کے دوسرے منطقوں سے جوڑنے کی روش عام ہونے لگی۔ مروجہ تنقید پر جو جمود طاری تھا اس کو متحرک کرنے میں مابعد جدیدیت نے کلیدی کردار ادا کیا ہے۔

کلاسیکی تنقید سطحی طریقۂ کار کے سبب تفہیم و تعبیر کا عمل سکہ بند ہو کر رہ گئی۔ اس میں ناقد کی خود نمائی اور خود سری کی وجہ سے ادبی متون کے فعال رشتے بھی منقطع ہو گئے۔ اس ذیل میں حالی اور کلیم الدین کا نام لیا جا سکتا ہے۔ حالی نے ادب کے اصلاحی پہلو پر زور دیا اور کلیم الدین احمد نے اپنی انتہا پسندی کا ثبوت دیتے ہوئے ادب کے ایک بڑے حصے کی تکفیر کی۔ بعد کے دور میں ترقی پسندوں نے ادب کو کمیونسٹ منشور بنایا۔ جدیدیوں نے ہیئت پرست تنقید سے ناطہ جوڑ کر ادب اور ثقافت کے تعامل کو نظر انداز کیا اور متن کی خود مکتفیت کے مبلغ بن گئے۔ وہ متن سے باہر پیدا ہونے والی صورتِ حال کو تفہیم متن کے سلسلے میں بے معنی تصور کرنے لگے۔ یہ دور پروپگنڈہ اور نعرہ بازیوں کا بھی رہا۔

پھر مابعد جدیدیت کی تحریک چلی جس کے سبب تنقیدی عمل پر طاری جمود پگھلنے لگا۔ آمریت دم توڑنے لگی۔ اس تحریک سے جڑے ساختیات، پس ساختیات اور اسلوبیات نے تعبیر و تفہیم کے روایتی زاویوں کی کم مائیگی اور سطحیت کو طشت از بام کیا۔ متن کی لسانی خود مکتفیت پر اصرار کرنے والی غیر منطقی حیثیت کو رد کیا۔ پس ساختیات متن کے غیر سالم وجود پر اصرار کرتی ہے اور معنی مرکز کے ساختیاتی تصور سے گریز کرتے ہوئے متن میں پائی جانے والی متضاد صورتِ حال کو واشگاف کرنے پر زور دیتی ہے۔

الغرض تفہیم کے مذکورہ بالا منطقوں نے قدیم و جدید متون کی باز قرأت کا احساس اجاگر کرنے کے علاوہ ان مذکورہ نظریات کی اہمیت پر بھی روشنی ڈالی۔ اس ضمن میں گوپی چند نارنگ، وزیر آغا، وہاب اشرفی، شمیم حنفی، قاضی افضال، شافع قدوائی، ابوالکلام قاسمی اور حامدی کاشمیری خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

ترقی پسند رجحان کا دور 1953 تک رہا۔ پھر جدیدیت 1953 سے 1970 تک حاوی رہی مگر 1980 کے آتے آتے اس کا اثر بھی زائل ہونے لگا کیونکہ 1985 تک یہ دقیانوسیت، عصبیت اور ادعائیت کا نمونہ بن گئی تھی۔ اب خود کو محفوظ گھونسلے میں سمیٹنے کا وسیلہ بن چکی ہے۔ ان حالات میں مابعد جدیدیت میں شامل نئی فکریات کی تازہ ہوا چلنے لگی اور اکیسویں صدی میں داخل ہو کر تخلیق و تفہیم کے بام و در کو مہکانے لگی۔

بقول نظام صدیقی ''اکیسویں صدی کے عالمی، قومی اور مقامی تناظر میں ہر سطح پر نئے عہد کی تخلیقیت کا جشن جاریہ قائم ہے۔ یہ مابعد جدیدیت کا تیسرا رخ ہے جو مابعد جدیدیت کے پہلے رخ کی فکریاتی، علمیاتی، ثقافتی اور غیر جمالیاتی انتہا پسند رخ کی ہر نوعیت کی مردہ روایت سے یکسر گریزاں ہے اور مابعد جدیدیت کے نسبتاً دوسرے محتاط، مثبت، معقول، زندگی افروز اور فن پرور رخ کی زندہ، نامیاتی اور متحرک روایت کی جست گاہ سے بے محابا زقند بھر کر نئے عہد کے ناقابل تسخیر تحرک سے ہم آہنگ ہو گئی ہے۔''

اکیسویں صدی میں اردو تنقید کی سطح پر مابعد جدید تنقید و ادب کے مرکزی تصورات اور فکریاتی امتیازات کے چند پہلو حسب ذیل ہیں:

(1) اکیسویں صدی کے شعری و افسانوی ادب میں مابعد جدید تنقید اپنی مخصوص شعریات تخلیق کرنے لگی ہے۔ اس کے تحت نئی جمالیات اور نئی قدریات معرض وجود میں آ رہی ہے جن کی اساس رد تشکیل کی فکریات پر ہے۔ یہ تنقید جامد اور ساکن نہیں بلکہ زندہ نامیاتی اور متحرک کردار رکھتی ہے۔ اس سے جدیدیوں کی انتہا پسندی کی رد تشکیل بھی ہو رہی ہے اور نئے توازن کی تلاش بھی جاری ہے۔

(2) یہ جدیدیت پسند موضوعات کی یکسانیت اور سکہ بند رویوں سے بھی گریزاں ہیں۔ اس کے علاوہ نرگسیت اور مریضانہ فردیت پسندی کی بے جا تکرار سے بھی احتراز کرتی ہے۔

(3) مابعد جدید قلم کار ایسے پامال اور فرسودہ راہوں سے گریز کرتے ہیں جو غیر صحت مند دقیانوسیت، ابہام، اشکال اور اہمال سے جڑی ہوئی ہیں۔ اس کے برخلاف وہ شعوری طور پر مشرقی تہذیبی جڑوں کی تلاش کرتے ہیں جن کا واسطہ تہذیبی شناخت، تہذیبی سچائی اور اپنے دیش کی مٹی سے ہے۔ اس کے نتیجے میں لوک گیتوں اور عوام پسند ہیئتوں مثلاً دوہا، اردو دوہا، ماہیا، گیت، کہہ مکرنی، ہکونی، ترہنی جیسی اصناف کے فروغ کی راہیں کشادہ ہوئی ہیں۔

> اکیسویں صدی کے عالمی، قومی اور مقامی تناظر میں ہر سطح پر نئے عہد کی تخلیقیت کا جشن جاریہ قائم ہے۔ یہ ما بعد جدیدیت کا تیسرا رخ ہے جو مابعد جدیدیت کے پہلے رخ کی فکریاتی، علمیاتی، ثقافتی اور غیر جمالیاتی انتہا پسند رخ کی ہر نوعیت کی مردہ روایت سے یکسر گریزاں ہے اور ما بعد جدیدیت کے نسبتاً دوسرے محتاط، مثبت، معقول، زندگی افروز اور فن پرور رخ کی زندہ، نامیاتی اور متحرک روایت کی جست گاہ سے بے محابا زقند بھر کر نئے عہد کے ناقابل تسخیر تحرک سے ہم آہنگ ہو گئی ہے۔

(4) مابعد جدید ادب میں خارجی ساخت اور داخلی ساخت جیسے تصور کے سبب اردو قاری کو یہ احساس دلایا ہے کہ زبان صرف صاف شفاف ہی نہ ہو بلکہ تخلیقیت پرور بھی ہو۔ یہی اول و آخر تخلیقیت پرور ویژن ہے جو علامت (Sign)، فرق (Difference)، اور التوا (Deferment) کی سطح پر عمل پیرا ہے۔ اس لیے مابعد جدید شعرا کا اسلوب روشن اور چابک دست ہوتا ہے۔ جدیدیت پسند شعرا کے مبہم کہرآلود طرز اظہار کے مقابلے میں زیادہ واضح ہے اور ترسیل و ابلاغ کا موقع فراہم کرتا ہے۔

(5) مابعد جدید تنقید فارمولہ، سکہ بند اور فیشن گزیدہ تحریر کے خلاف ہے۔ اس میں موضوعی اعتبار سے کسی طرح کی یکسانیت، یک رنگی، مشروطیت پسندی یا نظریہ بندی نہیں ہوتی ہے کیونکہ یہ باتیں حقیقی تخلیقیت اور معنویت کی دشمن کے برابر ہیں۔ اسی لیے پروفیسر گوپی چند نارنگ فرماتے ہیں: ''ہم ایک ایسے مابعد جدیدیت کے عہد میں زندگی گزار رہے ہیں جو تخلیقیت کا ایک جشن جاریہ ہے''۔

(6) مابعد جدید تخلیقی ادب حقیقت کی جستجو نہیں کرتا بلکہ خود

اپنی حقیقت کی تخلیق کرتا ہے اور یہ اس کا بنیادی نقطہ ہے۔

(7) بین المتونیت اس کا مرکزی تصور ہے۔ مابعد جدید تنقید فوق متن (Para Text) پر زور دیتی ہے اور معنویت کو اس میں اہمیت حاصل ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ بین المتونی جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے درمیان حد فاصل قائم ہے۔

(8) مابعد جدیدیت ترین نظریہ عالم (Carte sian World View) کی ردِ تشکیل کرتی ہے اور سالم نظریہ عالم (Holistic wrold View) کو قبول کرتی ہے۔ اس کے نتیجے میں تخلیق یا کلام کی اپنی جڑوں کی تلاش مزید استوار نظر آتی ہے۔

(9) یہ فطری آزادی پر اصرار کرتی ہے اور آہن پوش مرکزیت نہیں رکھتی۔ یہ ترقی پسندی کی سطحی خارجیت اور جدیدیت کی سطحی داخلیت کو بلندی عطا کرکے اس میں ہمہ جوئی اور ہمہ رنگی کی شان بھی پیدا کرتی ہے۔ چنانچہ اس کی لامحدودیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

(10) مابعد جدید ہر طرح کی یک رنگی، کلیت پسندی، آمریت، فارمولہ سازی اور ہم نظمی کی ردِ تشکیل کرتی ہے۔ اکیسویں صدی کے سیاق و سباق میں اضافی تخلیقیت، معنویت، عصریت اور مقامیت کا جشنِ عالیہ ہے۔ یہ کوئی مہابیانیہ یا کوڈ نہیں ہے۔

اکیسویں صدی میں اردو تنقید کے حوالے سے ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی نے ادب کے تعلق سے ایسے دو خیموں کی نشاندہی کی ہے جو نظریاتی بنیاد پر استوار ہیں۔ ادب کا پہلا خیمہ عمرانیات کا انتہا پسند مبلغ ہے جب کہ دوسرا خیمہ ادب کی جمالیات پر مصر ہے۔ ادب کی امریکی عمرانیات، این ڈی یونیوگراسی کی عمرانیات، میری انگلٹن کی عمرانیات، لوناچارسکی کی عمرانیات نئے تناظر میں نئے معیار و اقدار کی تشکیل کرتی ہے جس سے اردو کے سہل پسند ناقدین اب تک ناواقف ہیں اور اُگلے ہوئے نوالے کو بار بار چبا کر اپنے تابع قلم کاروں کی مٹی خراب کرتے ہیں۔ دوسری طرف فیشن گزیدہ جدید ناقدین عالمی تنقیدی سیاق سے یکسر غافل ہیں اور جدیدیت کی قصیدہ خوانی میں مصروف ہیں۔ انھیں زندگی کے حقائق سے کوئی سروکار نہیں۔ زندگی کی حد بندی کو ختم کرنے کے بجائے اس کی محبوبیت کو بڑھانے میں لگے ہیں۔ اس کا نتیجہ ڈاکٹر مناظر صاحب کے الفاظ میں دیکھیں۔ وہ کہتے ہیں ''اکیسویں صدی میں پوشیدہ مفاد کے تحت ایک دوسرے پر اثر انداز ہونے کا رویہ یقینی طور پر سامنے آئے گا۔ ہم جانتے ہیں کہ تخلیقی بصیرت زندگی کی تجربہ گاہ میں جنم لیتی ہے۔ لسانیات، اسلوبیات اور وضعیات کے لیب میں نہیں۔ زندہ آدمی اور مردہ مینڈک میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ادب و تنقید سے آدمی کو بیدار کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسے سُلانے اور کند ذہن بنانے کی نہیں۔ اس کے برخلاف پوشیدہ مفاد گزیدہ انتہا پسند، ترقی پسند اور فیشن گزیدہ، جدیدیت پسند تنقید اردو میں عمداً وقت کے زندہ مسائل، اقدار اور معیار سے روگردانی کرتی ہے۔ آدمی ہر نئے دور میں نئی جمالیات، نئی اخلاقیات کا فطری طور پر خالق ہوتا ہے۔ صرف پرانے آہن پوش نظریاتی آثار کا روبوٹی اور کمپیوٹری مخلوق نہیں ہوتا''

اکیسویں صدی میں مابعد جدید تنقید کے تحت ساختیاتی تنقید اہم رول ادا کرسکتی ہے۔ ساختیاتی تنقید کو نئی نئی تنقید بھی کہا جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ اکیسویں صدی میں افہام و تفہیم کے نئے نئے باب وا ہونے لگیں گے اور نئی جمالیات و اخلاقیات کے متوازن رویوں کی راہیں کشادہ ہورہی ہیں۔

ادب کے عصری منظر نامہ میں جو قلمکار جدید تنقیدی مباحثے میں سرگرم حصہ لے رہے ہیں ان میں سے چند نام ہیں: حامدی کاشمیری، عتیق اللہ، صادق، انیس اشفاق، طارق چھتاری، شافع قدوائی، ابوالکلام قاسمی، ریاض صدیقی، نظام صدیقی، مہدی جعفر، پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی، بلراج کومل، حقانی القاسمی، احمد سہیل، پروفیسر مولا بخش، قیصر الاسلام وغیرہ۔

اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا اکیسویں صدی میں مابعد جدیدیت نے ہماری ادبی، عمرانی اور ثقافتی دنیا میں ایک نئے عہد کا آغاز کیا ہے۔ اس کی کشادہ ذہنی نے کسی طرح کی پابندی قبول نہیں کی۔ یہ ہر طرح کے ڈسکورس میں آزادی کی تائید کرتی ہے اور ہر قسم کے منفی رجحانات اور پسماندہ میلانات کے لیے ایک چیلنج بن کر ابھرنے لگی ہے۔

اڈیشا میں اردو تنقید:

تنقید نگاری کے تعلق سے اگر ریاستِ اڈیشا کی بات کی جائے تو نثر نگاروں کی کمی شدت سے محسوس کی جائے گی۔ ایسے میں ظاہر ہے کہ تنقید نگاروں کو انگلیوں پر گنا جاسکتا ہے، جو چند نام راقم الحروف کے ذہن میں ہیں ان میں پروفیسر کرامت علی کرامت کو اولیت حاصل ہے۔ ان کے بعد شکیل دسنوی، عبدالمجید فیضی، عبدالمتین جامی، سعید رحمانی، خاور نقیب اور یوسف جمال کا نام لیا جاسکتا ہے۔ یہ حضرات تبصرہ نگاری کے ساتھ ساتھ تنقید نگاری کا پختہ شعور بھی رکھتے ہیں۔

پروفیسر کرامت علی کرامت کی ہمہ جہت شخصیت

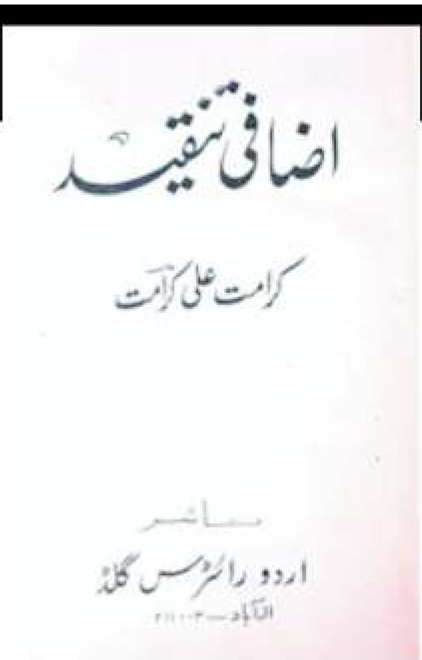

سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ شاعری اگرچہ ان کی اولین ترجیح ہے مگر بحیثیت تنقید نگار انھیں عالمی شہرت حاصل ہے۔ تنقید پر مبنی ان کی نظریہ ساز تصنیف 'اضافی تنقید' کو کافی شہرت ملی ہے۔ اس کتاب کو پیش کرکے انھوں نے تنقید کے باب میں قابلِ قدر اضافہ کیا ہے۔ ان کے نظریۂ اضافیات پر روشنی ڈالنے سے پہلے یہ بتادوں کہ فنِ تنقید سے متعلق ان کا نقطۂ نظر کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

''زمانے کے ساتھ ساتھ انسان کے علوم میں اضافہ ہوتا جارہا ہے اور ان علوم کا اثر ناقدین کے تنقیدی شعور پر بھی پڑتا ہے۔ جس وقت شاعری اپنے فن کی قبا میں زندگی کے نئے مسائل کو جذب کرلینے کی کوشش کرتی ہے، اس وقت فنِ تنقید کو بھی اپنا پیمانہ بدلنا ضروری ہوجاتا ہے۔ ایک ناقد کا فرض تنقید کو روکنا نہیں بلکہ پرانی قدروں کی جگہ نئی قدروں کو پیش کرنا ہے۔ چونکہ انسان کا ذہن و شعور ارتقا پسند ہے اس لیے کسی بھی تنقیدی اصول کو حرفِ آخر تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔''

ان کا یہ خیال مبنی بر حقیقت ہے کیونکہ شعر کی تفہیم ہر قاری یا ناقد اپنے فہم و ادراک کے مطابق الگ الگ ڈھنگ سے کرتا ہے۔ ضروری نہیں کہ سب کی رائے یکساں ہو۔ ایک ناقد کی تنقیدی رائے کا دوسرے ناقد سے جدا ہونا فطری امر ہے۔ چنانچہ کسی بھی تنقیدی اصول کو حرفِ آخر سمجھا نہیں جاسکتا۔

موصوف نے اضافی تنقید کی بنیاد اس بات پر رکھی ہے کہ شاعر کے ذہن کے مختلف مدارج میں جذبات کی اضافی فراوانی پائی جاتی ہے۔ اپنے نظریۂ اضافیات کے بارے میں کہتے ہیں:

''میرا اضافیات کا نظریہ ایک حد تک ٹالسٹائی کی Inflection theory سے بہت قریب ہے جسے انھوں نے ہر طرح کے آرٹ کے لیے پیش کیا ہے۔ شعر

کے Inflection کی مقدار کو مدِ نظر رکھا جائے تو اس میں جذبات کی اضافی فراوانی کی اہمیت کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ Inflection کی مقدار کے تعین کے وقت جو Infelcted ہوتے ہیں کی شرط کی بجائے صرف باشعور قاری یا ناقد کے ذہن میں تخلیقِ ثانی کے دوران کی تکمیل کی کس حد تک جذبات کی فراوانی ہوتی ہے، کی شرط رکھی جائے تو عملی تنقید میں نظریۂ اضافیات کا بآسانی استعمال ہو سکے گا۔"

اس کتاب میں نظریۂ اضافیات کی توضیح کے علاوہ جدید شاعری، غالب کا کلام جدید میزان پر، ترسیل کی ناکامی کا مسئلہ، امجد نجمی اور مظہر امام کی شاعری کا محاکمہ اور آج کے جدید شعرا جیسے موضوعات پر وضاحت سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

تنقید نگاری میں سید شکیل دسنوی (مرحوم) نے اپنی بالغ نظری کا ثبوت پیش کیا ہے۔ ان کی کثیر الجہات شخصیت اظہر من الشمس تھی۔ شاعری کے علاوہ نقد و تحقیق اور افسانہ نگاری میں بھی انھوں نے اپنے کمالِ فن کا ثبوت دیا ہے جس کا اعتراف کرنے والوں میں پروفیسر شکیل الرحمٰن، مجروح سلطانپوری، بشر نواز، تسنیم فاروقی، علی احمد جلیلی، رفعت سروش، یوسف ناظم، عنوان چشتی، مخمور سعیدی جیسی ذی وقار شخصیتیں شامل ہیں۔ ان کے چھ شعری مجموعوں سے جہاں ان کی شاعرانہ بصیرت کا پتہ چلتا ہے وہیں نقد و تحقیق پر مبنی دو تصانیف بازدید اور اندازِ بیاں اپنا، ان کی تنقیدی اور تحقیقی بصیرت کی آئینہ دار ہیں۔ بازدید میں ان کے تبصرے شامل ہیں جبکہ اندازِ بیاں میں مختلف ادبی شخصیات کے خاکے اور ان کے فکر و فن پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

تنقید نگاری ایک مشکل فن ہے۔ شعر و ادب کی پرکھ کرنے والے ناقدین میں گہرے تجرباتی شعور کا ہونا ضروری ہے۔ اس کے ساتھ عمیق مشاہدہ اور ژرف بینی جیسی صلاحیتیں بھی لازمی ہیں۔ اس تناظر میں شکیل صاحب کے تنقیدی مقالات پر نظر ڈالیں تو ان کے منطقی دلائل نتیجہ خیز تنقیدی عمل اور شگفتہ بیانی کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ صرف اتنا ہی نہیں عام روش سے ہٹ کر ان کی تحریریں

ہمہ جہت زاویۂ نگاہ اور تکثیریت کا احساس دلاتی ہیں۔ کسی بھی فن پارے پر اپنی رائے کا اظہار اس طرح کر دیتے تھے کہ ان کی حق گوئی اور بیباکی کا اعتراف ضروری ہو جاتا ہے۔

عبدالمجید فیضی صاحب کا تعلق اڈیشا کے شہر سمبلپور سے ہے جسے اردو کا بنجر علاقہ کہا جاسکتا ہے۔ ایسی جگہ پرورش و پرداخت کے باوجود فیضی صاحب نے اپنی تخلیقیت کے گل بوٹے کھلا کر اردو کی ہمہ گیریت کا ثبوت دیا ہے۔ موصوف اردو کے علاوہ عربی، فارسی، ہندی، سنسکرت اور انگریزی زبانوں پر یکساں عبور رکھتے ہیں اور ان زبانوں کے شہ پاروں کو اردو میں منتقل کر کے گرانقدر خدمات انجام دے رہے ہیں۔ سنسکرت کے 3 سو اشلوکوں کو براہِ راست اس طرح اردو کا جامہ پہنایا ہے کہ ان پر ترجمے کا گمان نہیں ہوتا۔ گلدستۂ نعت کی اشاعت کے بعد ان کا دوسرا مجموعہ 'نغماتِ سرمدی' زیرِ طبع ہے جس میں عربی سے حجۃ الوداع کا منظوم ترجمہ اردو میں کیا گیا ہے۔ ماہرِ عروض بھی ہیں اور نقد و ادب کا پختہ شعور رکھتے ہیں۔ بہت سے شعری مجموعوں کی تقریظ اور پیش لفظ لکھنے کے علاوہ ان کے متعدد تنقیدی مضامین بھی رسائل کی زینت بن چکے ہیں۔ ان کی تحریروں میں سلاست و شگفتگی بھی ہوتی ہے اور ان کی صلابتِ فکری کا پتہ بھی چلتا ہے۔ بنا کسی لاگ لپیٹ کے وہ فن کے محاسن اور معائب کی نشاندہی کر دیتے ہیں۔

عبدالمتین جامی صاحب بھی ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں۔ شعر و ادب، تنقید و تحقیق کے علاوہ افسانہ نگاری اور ناول نگاری میں ان کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ خاص طور پر اڈیشا میں صنفِ رباعی کے فروغ کے لیے ان کی کاوشیں لائقِ ستائش ہیں۔ ایک شعری مجموعہ اور رباعیات کے دو مجموعے منظرِ عام پر آکر پذیرائی حاصل کر چکے ہیں۔ وہ ماہرِ عروض بھی ہیں اور تنقید نگاری میں بھی اپنی ژرف بینی کا ثبوت فراہم کر رہے ہیں۔ تنقیدی مضامین پر مشتمل ایک مجموعہ 'نئی تنقیدی جہت' زیرِ طبع ہے۔ مختلف مجموعوں پر ان کے تبصرے ادبی محاذ کے علاوہ دیگر رسائل میں بھی تسلسل سے شائع ہو رہے ہیں اور پسند بھی کیے جاتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں حق گوئی اور بیباکی ہوتی ہے۔ وہ بلا کسی ذہنی تحفظ کے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں۔ ادبی دنیا میں انھیں معتبر مقام حاصل ہے۔

سعید رحمانی سر دست ایک صحافی کے بطور اپنی شناخت رکھتے ہیں 'ادبی محاذ' گزشتہ 12 رسال سے ان کی ادارت میں بڑی پابندی سے شائع ہو رہا ہے۔ اب کبرسنی کے باعث انھوں نے یہ ذمے داری سید نفیس دسنوی کے کاندھوں پر ڈال دی ہے۔ بہر حال بنیادی طور پر شاعر ہیں اور نقد و ادب میں بھی اپنی بالغ نظری کا ثبوت پیش کر رہے ہیں۔ تبصروں کے علاوہ ان کے بیشتر تنقیدی مضامین رسائل کی زینت بن چکے ہیں۔ بہت سی کتابوں کے لیے پیش لفظ اور تقریظ بھی لکھ چکے ہیں۔ مضامین پر مشتمل ایک مجموعہ 'شناسا چہرے' زیرِ ترتیب ہے۔

خاور نقیب صاحب بھی ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں۔ شاعری کے علاوہ نقد و تحقیق اور صحافت میں قابلِ قدر کارنامہ انجام دے رہے ہیں۔ مجلّہ 'ترویج' ان کی ادارت میں شائع ہوتا ہے اور ادبی حلقوں میں پسند بھی کیا جاتا ہے۔ ان کے تبصرے اور تنقیدی مقالات میں صلابتِ فکری، ژرف بینی اور شگفتگی کا احساس ہوتا ہے۔ منفرد طرزِ تحریر میں دانشورانہ رنگ واضح نظر آتا ہے۔

یوسف جمال صاحب ایک معتبر شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ بالغ نظر تنقید نگار بھی ہیں۔ ان کا ایک شعری مجموعہ 'خشک جزیرے کی دعا' شائع ہو چکا ہے۔ ان کے تنقیدی مقالات بیشتر رسائل کی زینت بن چکے ہیں۔ ان کی تحریریں فکری ارتفاع کا نمونہ ہوتی ہیں۔ ان کے تعلق سے خاص بات یہ ہے کہ آزاد غزل کے ہراول دستے میں ان کا شمار کیا جاتا ہے۔

مندرجہ بالا سطور میں جن شخصیات کا حوالہ دیا گیا ہے انھیں مابعد جدید قلمکاروں کے ذیل میں رکھا جاسکتا ہے کیونکہ وہ ان پامال اور فرسودہ راہوں سے گریزاں ہیں جو غیر صحت مند دقیانوسیت، ابہام، اشکال اور اہمال سے جڑی ہوئی ہیں۔ انھیں مشرقی تہذیب کی جستجو رہتی ہے اور وہ ادب کو دیش کی مٹی سے جوڑنے پر مائل ہیں۔ ان کے یہاں سکہ بند رویہ نہیں پایا جاتا۔ انھیں نرگسیت اور مریضانہ ذہنیت سے بھی احتراز ہے۔ آخر میں اتنا کہنا چاہوں گا کہ جو معدودے چند تنقید نگار ہیں ان کے دم سے ہی اڈیشا میں تنقید نگاری کا بھرم قائم ہے

کتابیات:

1 اضافی تنقید
2 بازدید
3 اندازِ بیاں
4 تمثیلِ نو اکتوبر 2010 تا مارچ 2011
5 ایوانِ اردو ستمبر 2009
6 اردو دنیا اگست 2016
7 مجلّہ ترسیل، سرینگر۔ شمارہ نمبر 12
8 آن لائن رسالہ کائنات، شمارہ نمبر 1، جنوری 2004

Sayeed Rahmani
Editor 'Adabi Mahaz'
Deewan Bazar
Cuttack - 753001 (Odisha)
Email.: sayeedrahmani@gmail.com

مالک رام کی کتاب 'فسانۂ غالب' ایک تحقیقی کاوش

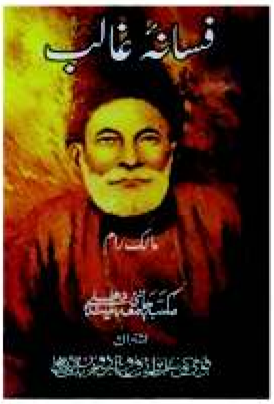

حنا آفریں

اردو ادب میں غالب ایک ایسی شخصیت ہیں جن کی زندگی میں ہی لوگوں نے ان کے متعلق لکھنا شروع کر دیا تھا۔ ایک صدی گزرنے کے بعد متفرق مضامین کے علاوہ غالب کے کلام کی شرحوں اور تنقیدوں کی طویل فہرست سامنے آتی ہے۔ غالب پر سب سے پہلی کتاب الطاف حسین حالی نے 'یادگارِ غالب' لکھی جو 1897 میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد عبدالرحمٰن بجنوری کی کتاب 'محاسنِ کلامِ غالب' بیسویں صدی کی ابتدا میں منظرِ عام پر آئی۔ غالب کی زندگی کے متعلقات کے بارے میں بھی کتابیں لکھی گئیں۔ غلام رسول مہر، شیخ محمد اکرام، امتیاز علی عرشی، قاضی عبدالودود، کالی داس گپتا رضا اور مالک رام نے غالب پر مستقل کتابیں تحریر کیں اور ہر کتاب غالب کی زندگی کے کسی نہ کسی نئے پہلو کو سامنے لے کر آئی جن سے غالب کی شاعری اور شخصیت سے متعلق لوگوں کی دلچسپی ظاہر ہوتی ہے۔

مالک رام نے مستقل کتابوں کے علاوہ غالب پر متعدد مضامین بھی قلم بند کیے۔ غالب پر تحریر مالک رام کے کچھ مضامین کا مجموعہ 'فسانۂ غالب' کے نام سے 1977 میں شائع ہوا۔ غالب کے حالات زندگی کو سمجھنے کے لیے یہ مضامین کافی کارآمد ہیں کیوں کہ مالک رام نے 'ذکرِ غالب' میں جن باتوں کا محض تذکرہ کیا گیا ہے اس کی وضاحت 'فسانۂ غالب' میں موجود ہے۔ 'فسانۂ غالب' میں 15 مضامین شامل ہیں جن میں کسی مضمون کا تعلق براہ راست غالب کی سوانح سے ہے تو کچھ کا ان کے متعلقین سے تو کوئی مضمون غالب کے سکہ کے الزام سے متعلق ہے تو کسی مضمون میں غالب کی مہروں پر بات کی گئی ہے تو کوئی مضمون ان کے پنشن کے مقدمے پر منحصر ہے۔

پہلا مضمون 'توقیتِ غالب' ہے، جس میں غالب کے دادا کے ہندوستان آنے سے لے کر غالب کے منھ بولے بیٹے عارف کے صاحبزادے حسین کے انتقال تک کے واقعات درج ہیں۔ اس کے علاوہ اس میں غالب کی اہم تصانیف کا ذکر مستند تاریخوں کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اس مضمون میں بالواسطہ طور پر غالب کے کچھ معاصرین اور عزیز و اقارب کی بھی تاریخِ وفات اور مکتب میں تعلیم حاصل کرنے کی تاریخ بھی آگئی ہے۔

مالک رام کا تحریر کردہ دوسرا مضمون 'تاریخِ ولادت' ان لوگوں کے دلائل کی رد میں لکھا گیا ہے جو یہ بات ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ غالب کی تاریخِ پیدائش 8 رجب 1212ھ کے علاوہ کچھ اور ہے۔ مالک رام کے مطابق غالب نے اکثر جگہ اپنی تاریخِ پیدائش ہندسوں میں ہی نہیں لفظوں میں بھی لکھی ہے۔ انھوں نے اپنی بات کی تائید میں اس مضمون میں نواب علائی کو لکھا غالب کا خط بھی شامل کیا ہے، جس کی عبارت کچھ اس طرح ہے:

"ہر چند قاعدہ عام یہ ہے کہ عالم آب و گل کے مجرم عالم ارواح میں سزا پاتے ہیں لیکن یوں بھی ہوا ہے کہ عالم ارواح کے گنہگار کو دنیا میں بھیج کر سزا دیتے ہیں۔ چنانچہ میں آٹھویں رجب 1212ھ میں روبکاری کے واسطے یہاں بھیجا گیا۔" (فسانۂ غالب از مالک رام، ص 30)

مالک رام نے عیسوی تاریخ 27 دسمبر 1797 نکالی ہے جسے اردو ادب میں قبول بھی کیا گیا ہے۔

کتاب میں شامل تیسرا مضمون 'ایک فارسی خط کی تاریخ' غالب کے اس خط کے بارے میں ہے جو غالب نے اپنی والدہ کے قرض خواہوں کو تحریر کیا تھا کہ اگر قرض ادا ہونے سے قبل والدہ کا انتقال ہو گیا تو قرض، وہ ادا کریں گے۔ اس خط میں تاریخ 31 جنوری 1804 درج ہے جب کہ مالک رام نے دلائل سے ثابت کیا ہے کہ دراصل خط کا سنہ 1840 ہے جو کتابت کی غلطی ہے کیونکہ 31 جنوری 1804 میں غالب 6 سال کے تھے۔ لہٰذا 6 سال کا بچہ قرض خواہوں کو ایسا تسلی بخش خط نہیں لکھ سکتا۔ مصنف نے اصل خط کا عکس بھی اس کتاب میں شامل کیا ہے۔ مضمون میں مالک رام رقمطراز ہیں:

"میں اسے 1840 کی تحریر مانتا ہوں اور یہی میں نے 'ذکرِ غالب' میں لکھا بھی ہے۔ بیشتر پرانی قلمی کتابوں اور تحریروں میں کتابت کا سال یونہی لکھا ملتا ہے کہ سال کے دو ہندسوں کے دو ٹکڑے خاصے فاصلے سے لکھے گئے ہیں اور سنہ کے نون کا نقطہ دونوں کے درمیان آگیا ہے۔ مثلاً 1225 لکھنا ہو تو اسے یوں لکھیں گے 1225۔ حسن اتفاق سے میرے پاس 'پنج آہنگ' (غالب) کا ایک قلمی نسخہ ہے جس کا سال کتابت بھی 1840 اور یوں لکھا ہے 1840۔" (ایضاً، ص 34)

مالک رام کی اس دلیل کی تائید میں کالی داس گپتا رضا لکھتے ہیں:

"یہ کہنا درست ہوگا کہ بعض پرانی کتابوں میں کتابت کا سال یوں لکھا ملتا ہے مگر بیشتر میں شاید ایسا نہیں ہوتا۔ میں نے اپنے کتب خانے کے تقریباً 100 مخطوطے کے ترقیمے دیکھے۔ صرف دو میں سال کتابت اس طرح پایا، لیکن ہو سکتا ہے ان کے مخطوطوں میں بیشتر ایسے ہی ہوں۔ اس تحریر کے آخری سنہ کو سہو کتابت سے 1840 کی جگہ 1240ھ لکھ دیا ہے۔ اسے درست کر لیا جائے... اس خط کا سال کتابت بگمانِ غالب، 1840 ہی ہے۔" (فسانۂ غالب از کالی داس گپتا رضا مشمولہ مالک رام ایک مطالعہ مرتبہ علی جواد زیدی، ص 44)

اس طرح مالک رام اور کالی داس گپتا رضا کی تحریروں سے یہ ثابت ہو گیا کہ اس فارسی خط کا سنہ 1840 ہی ہے۔

'فسانۂ غالب' کتاب میں چار مضامین غالب کے متعلقین سے وابستہ ہیں۔ پہلا مضمون غالب کے بھائی مرزا یوسف کے احوال پر روشنی ڈالتا ہے۔ اس مضمون میں مالک رام نے قومی آرکائیوز میں موجود دو مسلیں تلاش کر کے مرزا یوسف، ان کی بیوہ، وظیفہ کے متعلق درخواست اور اس وقت کے مختلف عہدہ داروں کی تفصیلات فراہم کی ہیں۔

دوسرا مضمون 'ملا عبدالصمد' (استادِ غالب) پر منحصر ہے، جس میں مالک رام نے یہ بتایا ہے کہ ملا عبدالصمد سے غالب نے کچھ وقت فارسی زبان سیکھی تھی۔ مصنف نے حالی کی بات کے پیش نظر اپنی بات کہی ہے۔ ملا عبدالصمد کے بارے میں 'یادگارِ غالب' میں موجود حالی کی تحریر دیکھیے:

"اگرچہ کبھی کبھی مرزا کی زبان سے یہ بھی سنا گیا ہے کہ مجھ کو مبدا فیاض کے سوا کسی سے تلمذ نہیں ہے، اور عبدالصمد ایک فرضی نام ہے۔ چونکہ لوگ مجھے بے استاد کہتے تھے، ان کا منھ بند کرنے کو میں نے محض ایک فرضی استاد گڑھ لیا ہے مگر اس میں شک نہیں کہ عبدالصمد فی الواقع ایک پارسی نژاد آدمی تھا اور مرزا نے اس سے کم و بیش فارسی زبان سیکھی تھی۔"

مندرجہ بالا سطروں کی قرأت کے بعد یہ غور کرنے والی بات ہے کہ غالب کی زبان سے استاد عبدالصمد کے متعلق بات سننے کے باوجود حالی نے یہ فارسی زبان سیکھنے

والی بات کیوں تحریر کی۔ اس میں کچھ سچائی ضرور ہے۔

غالب کے متعلقین سے وابستہ تیسرا مضمون 'نواب شمس الدین احمد خاں' پر ہے۔ اس مضمون میں ولیم فریزر کے قتل سے وابستہ مستند معلومات تفصیل کے ساتھ شامل کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں مالک رام نے اردوئے معلی، مرقع الور، کلیاتِ نثر غالب، واقعات دارالحکومت دہلی، تاریخ صحافتِ اردو، مکاتیبِ غالب، کارنامۂ سروری اور قومی آرکائیوز کے مراسلات سے مدد لے کر دلائل پیش کیے ہیں۔ خطوط اور کتابوں کی مدد سے مالک رام نے یہ ثابت کیا ہے کہ نواب شمس الدین خاں کی گرفتاری کے پسِ پشت غالب کا ہاتھ نہیں تھا۔ غالب پر لوگوں کا یہ شبہ بے بنیاد تھا۔

متعلقین سے متعلق چوتھا مضمون قتیل کے بارے میں ہے۔ مالک رام نے اس مضمون میں دلائل سے یہ بات ثابت کی ہے کہ قتیل کا اصل وطن بٹالہ (ضلع گورداسپور، پنجاب) تھا اور ان کا اصلی نام دیوانی سنگھ تھا نہ کہ دیوالی سنگھ۔

'غالب کی مہریں' عنوان سے شامل مضمون میں غالب کی دریافت شدہ چھ مہروں کا ذکر کیا گیا ہے جن پر ان کے سال بھی کندہ ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالب کی دو مہریں 1231ھ میں تیار کروائی گئیں۔ ایک میں 'اسد اللہ خان عرف میرزا نوشہ' اور دوسری میں 'اسد اللہ الغالب' کندہ ہے۔ تیسری مہر 'محمد اسد اللہ خان' 1238ھ، چوتھی مہر 'نجم الدولہ دبیر الملک اسد اللہ خان بہادر نظام جنگ' 1267ھ، پانچویں مہر 'اسد اللہ الغالب' 1269ھ اور چھٹی مہر 'غالب' 1278ھ کی ہے۔ غالب کی ان مہروں سے مالک رام نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ یہ مہریں غالب کے ماحول، ان کے خیالات اور حالات کی ترجمان ہیں۔ وہ مہر جس میں غالب نے 'اسد اللہ خان عرف میرزا نوشہ' کندہ کروایا ہے اس سے ان کی سرمستی و رنگینی ظاہر ہوتی ہے جبکہ دوسری مہر جس پر 'اسد اللہ الغالب' کندہ ہے اس سے غالب کی حضرت علی کے لیے عقیدت ظاہر ہوتی ہے۔ یہ مہروں کے ذریعے ایک نفسیاتی مطالعہ ہے۔

اس کے بعد 'فسانۂ غالب' میں شامل مضمون بعنوان 'مقدمہ پنشن کا عرضی دعویٰ' ہے۔ اس میں مصنف نے غالب کی پنشن سے متعلق پہلی درخواست دریافت کی ہے جو انھوں نے کلکتے میں گورنر جنرل کو پیش کی تھی۔ یہ درخواست مالک رام کو لندن میں مقیم 'انڈیا آفس لائبریری' سے ملی۔ اس مضمون کے ذریعے غالب کے حالاتِ زندگی کی کچھ گمشدہ باتوں کو دریافت کرنے میں مدد ملی۔ جیسے درخواست کی تاریخ 28 اپریل 1828 ہے جبکہ غالب 21 فروری 1828 کو کلکتہ پہنچے تھے۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ غالب نے تقریباً دو مہینے کے بعد وہاں کے حالات کا جائزہ لینے کے بعد گورنر جنرل کی خدمت میں درخواست پیش کی تھی۔ اس مضمون سے غالب کے کئی چھوٹے چھوٹے سفروں کے متعلق بھی معلومات فراہم ہوتی ہیں جو انھوں نے دہلی سے باہر کیے تھے۔ ان سفروں کے بعد غالب دہلی نہیں آئے بلکہ ادھر اُدھر ہوتے ہوئے کلکتے چلے گئے کیوں کہ دہلی آنے کی صورت میں انھیں قرض خواہوں کا سامنا کرنا تھا۔ درخواست میں غالب نے اپنا نام محمد اسد اللہ خان اور اپنے بھائی کا نام یوسف علی خان تحریر کیا تھا۔ مالک رام کی اس دریافت کے ذریعے بہت سی نئی باتیں سامنے آئیں۔

'ایک معاصرانہ اندراج' میں مالک رام نے آتش کے شاگرد آغا جو شرف لکھنوی کی ایک غیر مطبوعہ مثنوی بعنوان 'شکوہ فرہنگ' کو شامل کیا ہے جس میں شرف نے 1857 کے زمانے میں شمالی ہند کے مختلف شہروں کے حالات بیان کیے ہیں۔ دہلی کے اصحاب میں اور دوسرے لوگوں کے ساتھ غالب کا بھی منظوم تذکرہ ہے۔ غالب سے متعلق اشعار دیکھیے۔

جو دہلی میں یہ مرزا نوشہ ہیں — یہ شاعر عمائد ہیں، ذیجاہ ہیں
تخلص ہے غالب، بڑے نامور — عجب زندہ دل، عالم و خوش سیر
یہ بیشک ہیں اوستادِ اہلِ زباں — سمندر طبیعت ہے، ہر علم داں
یہ ہیں فارسی گوئی میں بےمثال — بڑے ذو فنون اور اہلِ کمال
ہوئی گفتگو ان سے جب غدر میں — جگہ پائی حکام سے صدر میں
کلام ان کا لندن روانہ ہوا — عجائب وہ افسوں فسانہ ہوا
مؤثر جو تھی نظم، اثر کر گئی — جہاں کے دلوں میں وہ گھر کر گئی
ہوا حکم ملکہ کے دربار سے — کہ پنشن ملے ان کو سرکار سے
عمائد تو تھے، اور نامی ہوئے — ہوئی پنشن ان کی، یہ نامی ہوئے
یہ نامی تو تھے، نامور رہ گئے — جو دشمن تھے، مونھ دیکھ کر رہ گئے

(فسانۂ غالب، ص 69)

غالب سے متعلق معاصرین کی تحریریں نایاب ہیں۔ مالک رام نے اپنی کتاب 'فسانۂ غالب' میں اسے شامل کرکے اردو ادب کو ایک تحفہ دیا ہے۔

غالب پر سکّے کے الزام سے وابستہ دو مضامین اس کتاب میں شامل ہیں۔ پہلے کا عنوان 'سکّہ کا الزام اور اس کی حقیقت' جبکہ دوسرا مضمون 'غالب سے منسوب دوسرا سکّہ' ہے۔ پہلے مضمون میں مالک رام نے اپنے دلائل سے غالب پر لگے سکّے کے الزام کو خارج کیا ہے۔ الزام کے مطابق جسے غالب نے بہادر شاہ ظفر کے لیے کہا تھا۔ مالک رام کو حسنِ اتفاق سے 'صادق الاخبار' دہلی کا 13 ذی قعدہ 1273ھ (جلد نمبر1) کا وہ شمارہ مل گیا جس میں غلط مخبری کے سبب غالب سے منسوب وہ سکّہ تحریر تھا جو ذوق کے شاگرد ویران نے کہا تھا۔ مالک رام کی اس دریافت سے غالب پر لگا الزام دور ہو گیا جسے غالب بہت کوششوں کے باوجود دور نہ کر سکے تھے۔

سکّے سے منسلک دوسرے مضمون میں مصنف نے خواجہ احمد فاروقی اور خلیق انجم کے قیاسوں اور نتیجوں کی تردید کی ہے اور دلائل سے یہ ثابت کیا ہے کہ غالب پر دو سکّے کے بجائے ایک سکّے کا الزام تھا جو ان کی دریافت سے دور ہو چکا ہے۔

'دربار رام پور سے متعلق' مضمون میں مالک رام نے نواب محمد یوسف علی خان سے غالب کے اچھے روابط ظاہر کیے ہیں۔ ان کے یہ روابط نواب صاحب کی زندگی تک چلے مگر ان کے انتقال کے بعد نواب کلب علی خاں سے غالب کے روابط کچھ اچھے نہیں رہے۔ انھوں نے غالب کو سو روپے ماہانہ وظیفہ تو مقرر کیا مگر اس کے علاوہ کسی قسم کی کوئی مدد نہیں کی۔ غالب نے قرض خواہوں کی رقم کا بوجھ اٹھائے ہوئے آخری سانس لی۔ مالک رام نے اس مضمون میں امتیاز علی عرشی کے مرتب کردہ خطوط کو اپنی دلیل میں پیش کیا۔

'غالب سوسائٹی' عنوان سے شامل کتاب مضمون میں مصنف نے مختلف اوقات میں قائم غالب سوسائٹیوں کی تفصیل درج کی ہے۔ جس سے یہ نتیجہ اخذ کرنے میں آسانی ہوئی کہ سب سے پہلے غالب سوسائٹی قائم کرنے کا منصوبہ 1869 میں غالب کے شاگرد مروان علی خان رعنا نے بنایا تھا۔ اس کتاب کا آخری مضمون 'آزاد بنام غالب' ہے جس میں مالک رام یہ بات منظرِ عام پر لے کر آئے کہ محمد حسین آزاد نے 'آبِ حیات' میں کس طرح غالب کی مذمت کی۔ بظاہر مدح مگر دراصل غالب کی ہجو بیان کی ہے۔

اس طرح 'فسانۂ غالب' کتاب کے مشمولات سے غالب کی زندگی کے بہت سارے گوشوں سے پردہ اٹھتا ہے۔ وہ گوشے خالص نجی بھی ہیں اور عمومی بھی۔ مالک رام نے ان پندرہ مضامین میں غالب اور متعلقاتِ غالب کے مختلف پہلوؤں کو روشن کیا ہے۔ غرض بہت سے نامعلوم حقائق کو سمجھنے میں اس کتاب سے مدد ملی۔

■

Dr. Hina Afreen
Assistant Professor, Academy of Professional
Development of Urdu Medium Teachers
Jamia Millia Islamia
New Delhi - 110025

الیاس احمد گدی کی سفرنامہ نگاری

'لکشمن ریکھا کے پار' کے حوالے سے

فیروز عالم

الیاس احمد گدی نے 1968 میں بغیر پاسپورٹ اور ویزا کے غیر قانونی طور پر بنگلہ دیش (اس وقت کا مشرقی پاکستان) کا سفر کیا تھا۔ اس حیرت انگیز لیکن پُر خطر سفر کی روداد انھوں نے دلچسپ انداز میں بیان کی ہے۔ اس زمانے میں کچھ ایجنٹ تھے جو معقول معاوضہ لے کر لوگوں کو سرحد پار کرایا کرتے تھے۔ اس طرح سرحد پار کرنے کے طریقے کو 'گر دنیا پاسپورٹ' کہا جاتا تھا۔ ایجنٹ پولیس والوں سے ملے ہوتے تھے۔ پولیس والے آنے جانے والوں کو اس انداز میں گردن پکڑ کر سرحد کے اس طرف دھکیل دیتے تھے جیسے وہ اُدھر سے ہی ادھر آنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ عام طور سے یہ سفر پدماندی کے چیک پوسٹ سے ہوتا تھا جس کے ایک طرف ہندوستان تھا اور دوسری طرف مشرقی پاکستان (موجودہ بنگلہ دیش)۔ سرحد کے دونوں طرف دیہات میں رہنے والوں کے درمیان آپس میں رشتے داریاں تھیں۔ تقسیم کی فرضی لکیر خون کے رشتوں اور دلوں کی محبت کو ختم نہیں کر سکی تھی اور دونوں طرف کے لوگوں کا آنے جانے کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ نیا ملک بننے کے باوجود آپس میں شادی بیاہ کا سلسلہ بھی تھا۔ مشرقی پاکستان سے لڑکوں کی ٹولیاں کولکاتا آتیں اور فلم دیکھ کر واپس چلی جاتیں۔ دونوں طرف کے بارڈر والوں کو اس کے بارے میں معلوم تھا اس لیے کوئی تعرض نہ کرتا۔ لوگ آرام سے اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر آتے جاتے رہتے تھے۔ اس موقع کا فائدہ الیاس احمد گدی اور ان کے دو دوستوں انعام اور صادق نے اٹھایا۔ جھریا میں الطاف نام کا ایک نوجوان آیا ہوا تھا جو اجرت لے کر لوگوں کو سرحد پار کراتا تھا۔ الیاس احمد گدی کے دوستوں کو معلوم ہوا تو انھوں نے فوراً یہ ایڈونچر بھرا پروگرام بنا لیا اور انھیں بھی اس میں شامل کر لیا۔ الیاس احمد گدی کو بھی ڈھاکہ جانے کا شوق تھا کیونکہ ان کے سگے ماموں وہاں جا کر بس گئے تھے اور ان سے ملے زمانہ گزر گیا تھا۔ ڈھاکہ جانے کی دوسری وجہ یہ تھی کہ وہ اس سرزمین کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتے تھے جس کی حسن و دلکشی کے ذکر سے شعر و ادب کی کتابیں بھری پڑی تھیں۔

''میں دراصل 'افکار' کے ایڈیٹر صہبا لکھنوی کی 'میرے خوابوں کی سرزمین' کو اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا تھا۔ میں قرۃ العین حیدر کے اس ابوالمنصور سے ملنا چاہتا تھا، ناؤ کھیتے ہوئے جس کی پیٹھ پر بید سے ٹھوکا دے کر اس کا انگریز آقا ناؤ تیز چلانے کے لیے کہتا ہے تو وہ اس کو دیکھ کر سر جھکا لیتا ہے۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ ابوالمنصور کیا آج بھی ویسا ہی ہے۔ کیا اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ اور میں دیکھنا چاہتا تھا ستیہ پیر کے بھکتی گیتوں میں رچا بسا، مرشدی نغموں میں نہایا بنگال...... بنگال جس کے اَن گنت تالابوں میں سبز پتوں کے آسن پر سرخ کنول سر اٹھائے جھومتے رہتے ہیں۔ جس کی ندیوں میں چاندی جیسی مچھلیاں جل پری کی طرح تیرتی رہتی ہیں۔ جس کے سبز درختوں کے جھنڈ میں بے شمار پرندے الہیاتی نغمے الاپتے رہتے ہیں۔ جہاں سبز میدانوں اور روپہلی ندیوں کا جال بچھا ہوا ہے۔ اور جہاں حسن بخشتے وقت فطرت بڑی فیاض ہو گئی تھی۔'' (لکشمن ریکھا کے پار، ص 12-13)

بہر طور پروگرام بن گیا اور آناً فاناً تینوں دوست الطاف کی قیادت میں مشرقی پاکستان کے سفر پر نکل پڑے۔ آگے چل کر الطاف کا دوست اماج الدین بھی ان کے ساتھ ہو گیا جو اصل ایجنٹ تھا۔ اگرچہ یہ سفر بے حد مشکل تھا لیکن اماج الدین کی سوجھ بوجھ اور مختلف مقامات پر اس کے تعلقات کی وجہ سے کسی طرح بہ خیر و عافیت تینوں دوست ڈھاکہ پہنچ گئے۔ ڈھاکہ پہنچ کر انھوں نے اپنے مختلف رشتے داروں، دوستوں، جاننے والوں اور ادیبوں اور شاعروں سے ملاقاتیں کیں۔ ان تمام کا ذکر الیاس احمد گدی نے دلکش انداز میں کیا ہے۔

اس سفرنامے کا عنوان 'لکشمن ریکھا کے پار' بے حد معنی خیز ہے۔ خدا کی بنائی زمین پر ایک ایسی لکیر کھینچ دی گئی جو نظر نہیں آتی لیکن اسے پار نہیں کیا جا سکتا۔ وہ لوگ جو صدہا سال سے ایک دوسرے کے ساتھ رہتے آئے تھے، انھیں مذہب کے نام پر دو ملکوں کے باشندوں میں بانٹ دیا گیا۔ ایک ہی خاندان کے کچھ لوگ ہندوستان میں رہ گئے اور کچھ لوگ پاکستانی قرار پائے۔ اس غیر منطقی تقسیم نے نہ جانے کتنے خاندانوں کو اجاڑ دیا اور کتنی بستیاں ویران کر دیں۔ الیاس احمد گدی لکھتے ہیں:

''ٹرین کی کھڑکی سے باہر ہماری آنکھوں کے سامنے ایک نیا ملک پھیلا ہوا تھا۔ مشرقی پاکستان، وہی خوبصورت، زندہ، پرسکون بنگال جس کے بیچ میں ایک سیکڑوں میل لمبی لکشمن ریکھا کھینچ دی گئی۔ تم مشرق ہو۔ ہم مغرب ہیں۔ مگر تہذیب جو کسی غیر جغرافیائی تقسیم کو کبھی تسلیم نہیں کرتی اس لکیر کو بھی نہیں مانتی۔ سیکڑوں لوگ ادھر سے ادھر ہوتے ہیں۔ کتابوں کے حروف ہواؤں کے دوش پر کہاں سے کہاں پہنچتے ہیں۔'' (ایضاً، ص 50-51)

'لکشمن ریکھا کے پار' میں بنگال کی تہذیب و ثقافت، اس کی سنہری تاریخ، شاندار ماضی اور بدتر حال، عوام کی غربت، شناخت کا مسئلہ، اردو اور بنگلہ کی کش مکش، مغربی پاکستان کے ذریعے مشرقی پاکستان کے عوام کا استحصال، ان پر زبردستی اپنی تہذیب و ثقافت اور زبان تھوپنے کی کوشش، بنگالیوں کا اس پر شدید احتجاج، بنگالیوں اور بہاریوں (تمام مہاجرین کو وہاں بہاری کہا جاتا ہے) میں بڑھتی غلط فہمیاں، ایک دوسرے کے تئیں شک، عداوت اور نفرت اور اس کے اسباب، بنگالیوں میں اپنے آپ کو ٹھگے جانے کا احساس، ہند و پاک جنگ، بنگلہ دیش کے قیام کا پس منظر وغیرہ سے بہ خوبی واقف کرایا گیا ہے۔ سفرنامہ نگار نے اس میں چوری چھپے سرحد پار کرنے والوں کو راستے میں درپیش خطرات، ان کی خوف زدگی اور احتیاط، رکشے والوں کی مکاری اور طے شدہ سے زیادہ رقم کا مطالبہ، پولیس والوں کی عیاری اور قدم قدم پر رقم اینٹھنے کی کوشش، مقامی غنڈوں اور داداؤں اور سرحد کے آس پاس کے گاؤوں کے لوگوں کے ذریعے آنے جانے والے مسافروں کو لوٹنے کی کوششوں سے بھی پوری طرح واقف کرایا ہے۔ اس سفرنامے میں اپنی مٹی، اپنی زبان اور تہذیب سے محبت، اپنے لوگوں سے ملنے کی خوشی اور ان سے بچھڑنے کے غم کا اظہار بھی الیاس احمد گدی نے بے حد جذباتی انداز میں کیا ہے۔ ڈھاکہ پہنچنے کے بعد جس والہانہ انداز میں الیاس احمد گدی اور ان کے دوستوں کا ہر

جگہ استقبال کیا گیا اور جھریا کے پرانے باشندوں نے جس طرح انھیں ڈھاکہ میں بس جانے کی دعوت دی اس سے ان کے خلوص اور محبت کا اندازہ ہوتا ہے۔ الیاس احمد گدی جب لالہ چچا سے ملے جو ڈھاکہ کے بڑے کاروباری بن گئے تھے تو انھوں نے بھی یہ پیش کش کی۔ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''سامنے ایک بڑا آفس ٹیبل جس پر آٹھ دس ٹیلی فون قرینے سے رکھے تھے۔ ایک نوجوان ٹیبل پر کچھ لکھنے میں مصروف تھا۔ ہر دو ایک منٹ پر کسی نہ کسی فون کی گھنٹی بج اٹھتی۔ نوجوان کبھی داہنی طرف سے اور کبھی بائیں طرف سے فون اٹھا کر ایک آدھ جملہ کہتا پھر رکھ دیتا۔ یہ سارا منظر فلموں جیسا تھا۔ لالہ چچا کہہ رہے تھے:

''بیٹا۔ ہم لوگ یہاں آ کے بہت پیسہ کمایا۔ کاروبار اتنا پھیل گیا ہے کہ خود ہمیں نہیں معلوم کہ ہمارا کاروبار کہاں کہاں چلتا ہے۔ یہ سارا کاروبار تمھارا یہ بھائی دیکھتا ہے۔ اس نے ٹیبل والے نوجوان کی طرف اشارہ کیا۔ تم لوگ وہاں کیا کر رہے ہو؟ میری بات مانو تو یہاں آ جاؤ۔ پورے سید پور کے سول ایجنٹ بن جاؤ۔ جتنا مال چاہو اٹھا لو اور بیچ کر پیسہ دو۔ تم لوگوں کے لیے رقم لگانے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لمبا کام ہے۔ ٹھیک سے کرو گے تو سال چھ مہینے میں بڑے آدمی بن جاؤ گے۔'' (ایضاً ص 115)

اس سفرنامے میں مغربی اور مشرقی پاکستان میں جا کر بسے افراد کی اس ذہنیت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے کہ وہ عموماً ہندوستانی مسلمانوں کو ترحم کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور وہ یہ سوچتے ہیں کہ ہندوستان میں مسلمان بالکل غیر محفوظ ہیں۔ ہندوستان میں ان کا مذہبی تشخص اور ان کی تہذیب و ثقافت خطرے میں ہیں۔

بنگال کی روشن تاریخ اور یہاں کی عظیم تہذیب و ثقافت کا ذکر مصنف نے مختلف مقامات پر کیا ہے۔ پوری دنیا میں جس کی دھوم تھی۔ جس کی حسیناؤں، ندیوں، آبشاروں، گیتوں اور قصے کہانیوں کے ذکر سے کتابیں بھری پڑی تھیں۔ الیاس احمد گدی نے جب اس خوابوں کی سرزمین کا سفر کیا اور وہ مقامات تلاش کرنے کی کوشش کی اور وہ سب کچھ دیکھنا چاہا جس کا اتنا ذکر سنا تھا تو انھیں شدید مایوسی ہوئی۔ لکھتے ہیں:

''یہ ایک ایسی دنیا تھی جس کے متعلق اَنگنت قصے اور کہانیاں، واقعات اور حادثات سنے تھے۔ جس کے متعلق ڈھیروں کتابیں پڑھی تھیں۔ جو 'سونار بنگلہ' تھا۔ جو سین اور پال راجاؤں کا دیس تھا۔ جو راگ راگنیوں کا ملک تھا۔ جس کی ہواؤں میں مرشدی اور چنڈی نغمے رچے تھے۔ جس کے گلی کوچوں میں، دیہاتوں میں، بنوں میں اور ندیوں پر نغموں کی پھوہار گر رہی تھی۔ اکتارے پر باول گانے والے جوگیوں کی ٹولیاں اس گاؤں سے اس گاؤں، اس شہر سے اس شہر، اس گھاٹ سے اس گھاٹ چلا کرتی تھیں۔ اور بغیر بلاؤز صرف ساڑی میں لپٹی بڑی بڑی آنکھوں اور لمبے بالوں والی لڑکیاں پیتل کی گاگریں اٹھائے تالابوں کے منڈیروں پر اترتی چڑھتی دکھائی دیتی تھیں۔ مگر یہ سب کہاں تھا؟ کہاں تھا یہ سب......!''

(ایضاً، ص:120)

مشرقی پاکستان (موجودہ بنگلہ دیش) کی بدحالی کی تصویریں ''لکشمن ریکھا کے پار'' میں جا بجا ملتی ہیں۔ پہلے انگریزوں نے اسے لوٹا، یہاں کی بہترین صنعت کو برباد کر دیا اور اسے معاشی اعتبار سے کھوکھلا کر دیا۔

''یہ وہی ملک تھا جہاں کی مصنوعات خاص طور پر کپڑے دور دراز کے ملکوں کی منڈیوں میں ہاتھوں ہاتھ لیے جاتے تھے۔ بنکروں نے ہاتھ کرگھے سے وہ کمال دکھلایا تھا کہ دنیا حیران تھی۔ ڈھاکے کی ململ کی کتنی ہی کہانیاں مشہور ہیں۔ مگر بھلا ہو...... ایسٹ انڈیا کمپنی کے بدھاتاؤں کا کہ جنھوں نے تمام خام مال پر کنٹرول عائد کر کے سارا مال بازار سے غائب کر دیا...... بنکروں اور صنعت کاروں کو مال ملنا بند ہو گیا۔ وہ بھوکوں مرنے لگے اور کاشت کاری کی طرف دوڑے اور ادھر خام مال بڑی بڑی ناؤوں پر لدا چاٹگام کی بندرگاہ سے بڑے بڑے جہازوں میں بھر کر یورپ کی منڈیوں میں پہنچنے لگا۔'' (ایضاً ص 67)

بنگال کی روشن تاریخ اور یہاں کی عظیم تہذیب و ثقافت کا ذکر مصنف نے مختلف مقامات پر کیا ہے۔ پوری دنیا میں جس کی دھوم تھی۔ جس کی حسیناؤں، ندیوں، آبشاروں، گیتوں اور قصے کہانیوں کے ذکر سے کتابیں بھری پڑی تھیں۔ الیاس احمد گدی نے جب اس خوابوں کی سرزمین کا سفر کیا اور وہ مقامات تلاش کرنے کی کوشش کی اور وہ سب کچھ دیکھنا چاہا جس کا اتنا ذکر سنا تھا تو انہیں شدید مایوسی ہوئی۔

انگریزوں سے نجات ملی تو اپنے لوگوں نے بھی منافقانہ رویہ اختیار کیا اور مشرقی پاکستان پر مغربی پاکستان کے سیاست دانوں کی اجارہ داری قائم رہی۔ بنگالیوں کو ہمیشہ نیچی نگاہ سے دیکھا گیا۔ ان کی زبان اور ان کی تہذیب و ثقافت کو کبھی وہ مقام نہیں دیا گیا جس کے وہ حق دار تھے:

''پہچان بچانے، زندہ رہنے اور اس کڑے امتحان سے گزر جانے کی جدوجہد میں مصروف۔ جس کا اکتارہ چھین لیا گیا تھا اور جو اپنے نغموں، اپنے گیتوں، اپنے ادب، اپنے فلسفے اور اپنے کلچر پر ہوئی یلغار سے پریشان تھا۔ جو لاتعداد اجنبی انجانے لوگوں میں اپنے آپ کو گم ہونے سے بچا رہا ہے۔ یہ اجنبی انجان لوگ، یہ نامعلوم ملکوں کے لوگ جو سیکڑوں میل لمبی سرحد سے در آئے تھے اور آہستہ آہستہ چھائے جا رہے تھے۔'' (ایضاً، ص 121)

یہ وہی بنگالی ہیں جنھوں نے تقسیم ملک کے وقت ہجرت کر کے آنے والوں کے لیے اپنے گھروں کے ساتھ دلوں کے دروازے بھی کھول دیے تھے۔ ان لٹے پٹے لوگوں کو اپنی زمینیں دی تھیں، ان سے اپنی بیٹیوں کی شادیاں کر دی تھیں، انھیں اپنے کاروبار میں حصہ دار بنایا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ان احسانات کے بدلے انھیں دھوکہ کھانا پڑا۔

''وہ ایک عجیب عالم تھا، بٹوارے کے فوراً بعد کا۔ ہندوستان سے جوق در جوق مہاجر چلے آ رہے ہیں۔ لٹے ہوئے، برباد، تباہ حال، فسادات کے کچلے ہوئے اور ادھر مشرقی پاکستان کی سرحد پر ہزارہا لوگ ان کے استقبال کو کھڑے ہیں۔ آشو آشو آمادیر بھائی بھایا شچے۔ گاؤں گاؤں کھانا بن رہا ہے۔ گھر گھر بچوں اور عورتوں کے لیے بستر لگایا جا رہا ہے۔ بینا پل سے ڈھاکہ اور چاٹگام تک مہاجروں کا قافلہ گزر رہا ہے۔ لوگ گلے مل رہے ہیں رو رہے ہیں۔ چھلکتی آنکھوں سے خوش آمدید کہہ رہے ہیں۔ آیشو آیشو تو می امار بھائی آچھو، آمار خون آچھو، امادیر مسلمان بھائی۔ کی چائی؟ زومین؟ کی چائی چاکری، کی چائی بھات.....

انھوں نے مہاجرین کو زمینیں دیں اور ان کو آباد کرنے میں ہر ممکن تعاون بہم پہنچایا۔ یہاں تک کہ اپنی لڑکیاں بھی دھڑا دھڑ بیاہ دیں۔ شہروں میں سیکڑوں کیمپ لگے اور ہزارہا نوجوان بازوؤں پر والنٹیر کے بِلّے باندھے ان کی خدمت گزاری میں لگ گئے۔ اور بنگال کا وہ معصوم جولاہا جو پہلے بھی سیاسی بساط پر پٹ چکا تھا ایک بار اور مات کھا گیا کہ جب یہ مہاجر اور یہ مسلمان بھائی ان کی زمینیں ہڑپنے لگے اور پہلے کسان اور پھر چھوٹے چھوٹے زمیندار بننا شروع ہوئے اور ادھر شہروں میں جب انھیں اپنی لیاقت سے تین گنی اونچی نوکریاں دی گئیں۔ تمام سرکاری ٹھیکوں اور کاروبار پر، تمام اونچی اور اہم نوکریوں پر تمام عیش و عشرت پر جب بہاریوں کا قبضہ ہو گیا تو اقتدار کا نشہ ان پر ایسا چڑھا کہ غریب بنگالی انھیں کم تر درجے کے انسان نظر آنے لگے۔ انھوں نے ہندوستان سے اپنی منکوحہ اور چھوڑی ہوئی عورتوں کو بلوا لیا اور جس تیزی سے انھوں نے بنگالی لڑکیوں سے شادی کی تھی اسی تیزی سے انھیں طلاقیں دینی شروع کیں اور وہ غریب مسلمان بھائی جس نے اپنی عزت تک ان کے قدموں

میں ڈال دی تھی، اب ڈبڈبائی آنکھوں سے، غم وغصہ سے اور نفرت سے انھیں دیکھتا ہے۔'' (ایضاً ص 79-78)

دراصل یہی وہ پس منظر ہے جس نے مہاجرین اور مقامی لوگوں میں نفرت کی دیوار کھڑی کی۔ اقتدار مغربی پاکستان کے لوگوں کے ہاتھوں میں تھا جو اپنے لوگوں اور مہاجرین کو ہر ممکن فائدہ پہنچا رہے تھے۔ بنگالیوں کو کمتر سمجھا جاتا تھا اور انھیں حقارت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ ملازمتوں میں بھی ان کے ساتھ امتیازی سلوک کیا جا رہا تھا اور ان کی جگہ غیر بنگالیوں کو ترجیح دی جاتی تھی۔ اس صورتِ حال میں بنگالیوں نے اپنے آپ کو ٹھگا ہوا محسوس کیا اور ایک وقت آیا کہ انھوں نے مغربی پاکستان سے نجات حاصل کرنے کے لیے مسلح جدوجہد کا آغاز کیا اور بنگلہ دیش ایک آزاد اور خود مختار ملک کے طور پر دنیا کے نقشے پر ابھرا۔

ڈھاکہ کے مختلف علاقوں مثلاً محمد پور، میر پور، سید پور، نیو مارکیٹ، نیو کیپٹل، بیت المکرّم وغیرہ کی سیر کا احوال بھی بیان کیا ہے۔ اس ضمن میں ڈھاکہ یونی ورسٹی بھی زیرِ بحث آئی ہے اور اس کی علمی حیثیت کے ساتھ ساتھ ظلم و ناانصافی کے خلاف اس کے احتجاجی رویے سے بھی مصنف نے واقف کرایا ہے:

''ڈھاکہ یونی ورسٹی جو ایک درس گاہ ہی نہیں ایک اہم سیاسی مرکز بھی ہے۔ ایک ایسا مرکز جس نے ہر دور میں سیاسی ناانصافی کے خلاف آواز اٹھائی ہے۔ پون صدی سے جس کے طالب علموں کا نام ہر احتجاج میں شامل رہا ہے اور آج بھی لال ہوتے سیاسی افق پر انھیں کے نام جگمگا رہے ہیں۔'' (ایضاً ص 100)

اس سفرنامے میں اس عہد کے سماج اور معاشرے کی مختلف جھلکیاں بھی ملتی ہیں۔ پیڑ کے نیچے لالٹین کی روشنی میں پڑھتے ہوئے بچے، بیل گاڑی کا سفر، رکشے کی سواری، رکشے والوں کے ذریعے اجنبی مسافروں کو ٹھگنے کی کوشش، بھاپ کے انجن والی ٹرین کا سفر، لہلہاتے کھیت، کچی سڑکیں اور اس طرح کے بہت سارے نظارے مصنف نے اس میں دکھائے ہیں۔ مہمان نوازی، اپنے وطن کے لوگوں سے لگاؤ، اپنی زبان بولنے والوں سے محبت، انسانی جذبات و احساسات وغیرہ کی بھی عکاسی بڑی خوبی سے کی گئی ہے۔ مختلف مقامات کی منظر نگاری بھی الیاس احمد گدی نے دلکش انداز میں کی ہے۔ منظر نگاری کی ایک مثال دیکھیے:

''اب پَو پھٹ رہی تھی اور آہستہ آہستہ سفید دودھیا روشنی تمام چیزوں کو اجالتی جا رہی تھی۔ اندھیرے میں جو سیاہ دھبے نظر آتے تھے وہ اب درختوں اور جھاڑیوں کی شکل میں دکھائی دینے لگے تھے۔ جگہ جگہ گڈھوں میں چمکیلے پانی کی جھلک بھی ملنے لگی تھی۔ کبھی کبھی پرندوں کے بولنے کی آواز بھی سنائی دے جاتی۔'' (ایضاً ص 100)

اپنی زبان بولنے والوں سے اپنائیت اور اپنی پسند کا کھانا ملنے پر جو طمانیت حاصل ہوتی ہے اس کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یہ لوگ آپس میں اردو میں بات چیت کر رہے تھے۔ انھیں دیکھ کر عجیب طرح کی اپنائیت کا احساس ہوا۔ ساتھ ہی اس بات کا بھی اطمینان ہوا کہ ہم لوگ گھور بنگالی علاقوں سے نکل آئے تھے۔ ہم لوگوں نے وہیں ریلوے کینٹین میں کھانا کھایا۔

کینٹین چونکہ بہاری کا تھا اس لیے مرغ اور پراٹھے مل گئے۔ خدا کا شکر ہے۔ چاول اور مچھلی کھاتے کھاتے ہم اوب چکے تھے۔'' (ایضاً ص 51)

اردو سے محبت کی ایک اور مثال ملاحظہ کیجیے کہ کس طرح ایک بنگالی سیٹھ کو جب یہ معلوم ہوا کہ اس علاقے میں تین لوگ آئے ہیں جن کی زبان اردو ہے تو اس نے انھیں اپنے یہاں بلوایا اور خوب آؤ بھگت کی۔ جب مصنف نے پوچھا کہ آپ نے اردو کہاں سیکھی تو ان کا جواب تھا:

''لاہور میں میری ایک مرشد آبادی سلک کی دکان ہے۔ میں وہاں کافی عرصہ رہا ہوں۔ وہیں مجھے اس زبان کی چاٹ لگی۔ ...... یہاں کا یہ عالم ہے کہ برسوں اردو کا جملہ نہ سننے کو ملتا ہے اور نہ کہنے کی نوبت آتی ہے۔ اسی وجہ سے آج جب یہ معلوم ہوا کہ تین بہاری یہاں آکر پھنسے ہیں تو میں اپنے آپ کو روک نہ سکا۔'' (ایضاً ص 47)

انھوں نے نہ صرف انھیں رات میں اپنے یہاں ٹھہرایا اور ان کی خوب خاطر مدارات کی بلکہ چلتے وقت اپنے لڑکے کو ان کے ساتھ اسٹیشن بھی بھیجا تا کہ کوئی بدمعاش انھیں تنگ نہ کر سکے۔

سفرنامے میں ادیبوں اور شاعروں سے ملاقات کا حال بھی دلچسپ انداز میں بیان کیا گیا ہے اور ایک ایک لفظ سے خلوص ٹپکتا ہے۔ الیاس احمد گدی جب نظیر صدیقی سے ملنے ان کے گھر پہنچے تو وہ اس وقت وہاں موجود نہ تھے۔ وہ اپنا نام پتہ بتا کر چلے آئے۔ صبح جب یہ لوگ ناشتہ کر رہے تھے اسی وقت نظیر صدیقی ان سے ملنے آگئے۔ ان کے علاوہ شہزاد منظر سے ان لوگوں نے ملاقات کی۔ احمد سعید جنھوں نے بمل مترا کے شہرہ آفاق ناول 'کوری دے، کنلام' (جس پر گرو دت نے مشہور فلم ''صاحب، بی بی اور غلام'' بنائی) کا اردو ترجمہ کیا تھا اور جو اس وقت 'نقوش' لاہور میں قسط وار چھپ رہی تھیں سے ملاقات کی تفصیلات بھی درج کی ہیں۔

''دکشن ریکھا کے پار'' درجنوں دلچسپ واقعات سے بھرا ہوا ہے۔ ہر واقعے کا بیان الیاس احمد گدی نے اس قدر دل نشیں انداز میں کیا ہے کہ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہم بھی ان کے ساتھ اس سفر میں شریک ہیں۔ اس کی زبان بالکل آسان اور سادہ ہے اور کہیں بھی کسی قسم کی پیچیدگی کا احساس نہیں ہوتا۔ کوئی بھی واقعہ غیر فطری یا مبالغہ آمیز نہیں ہے۔ بالکل فطری انداز میں وہ سفر کا حال بیان کرتے چلے گئے ہیں۔ کہیں کہیں وہ حال کی بدحالی دیکھ کر ماضی میں کھو جاتے ہیں اور پھر ان کے اندر کا افسانہ نگار بیدار ہو جاتا ہے۔ اس سفرنامے کی ایک اہم خوبی یہ بھی ہے کہ شروع سے آخر تک کہیں بھی قاری کی دلچسپی میں کمی نہیں آتی بلکہ تجسس میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اور اس پر کسی مہماتی ناول کا گمان ہوتا ہے۔ آخری حصے میں جب الیاس احمد گدی اپنے دوستوں اور ایجنٹ کے ہمراہ ہندوستان واپس آ رہے تھے تو پولیس کی چیکنگ سے بچنے کے لیے انھیں ایک جنگل سے گزرنا پڑا۔ وہ اس وقت کے احساسات یوں بیان کرتے ہیں:

''اس گھنے اور خوف ناک جنگل میں ہم چلے جا رہے تھے۔ یہ کتنی مضحکہ خیز بات تھی کہ ہمیں جنگلی درندوں کا ڈر نہیں تھا۔ سیکڑوں قسم کے حشرات الارض، کیڑوں، مکوڑوں، سانپوں، بچھوؤں، سے ہم خائف نہیں تھے بلکہ ہمیں ڈر تھا تو صرف انسانوں سے۔ ہم دعا کر رہے تھے کہ ہمیں کوئی آدمی نہ ملے۔'' (ایضاً ص 51)

واقعی خدا کی بنائی اس دنیا میں انسانوں نے ہی انسانوں کا جینا دوبھر کر دیا ہے۔ اور یہی وجہ تھی کہ مصنف اور ان کے ساتھی رات بھر یہ دعا کرتے رہے کہ انھیں کوئی آدمی نہ ملے۔

تحیر آمیز فضا بندی، دلکش منظر نگاری، دلچسپ واقعات، بہترین اندازِ بیان اور افسانوی طرز کی وجہ سے 'دکشن ریکھا کے پار' اردو کے سفرناموں میں نمایاں اہمیت کا حامل ہے۔ مصنف کے پرخلوص لہجے اور تمام بنی نوع انسان سے یکساں محبت کا احساس ہمیں اس سفرنامے کے مطالعے کے درمیان قدم قدم پر ہوتا ہے۔ ان کا بنیادی سروکار انسان اور انسانی رشتے سے ہے اور وہ انسانوں کو غیر فطری سرحدوں میں بانٹنے کے سخت مخالف ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مشرقی پاکستان کے باشندوں کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں سے حد درجہ دکھی نظر آتے ہیں۔

■

Dr. Firoz Alam
Asst. Professor, Dept of Urdu
Maulana Azad National Urdu University
Gachibowli
Hyderabad - 500032 (Telangana)
Email.: firozdde@gmail.com

تحقیق کے معلم اوّل

پروفیسر حافظ محمود شیرانی

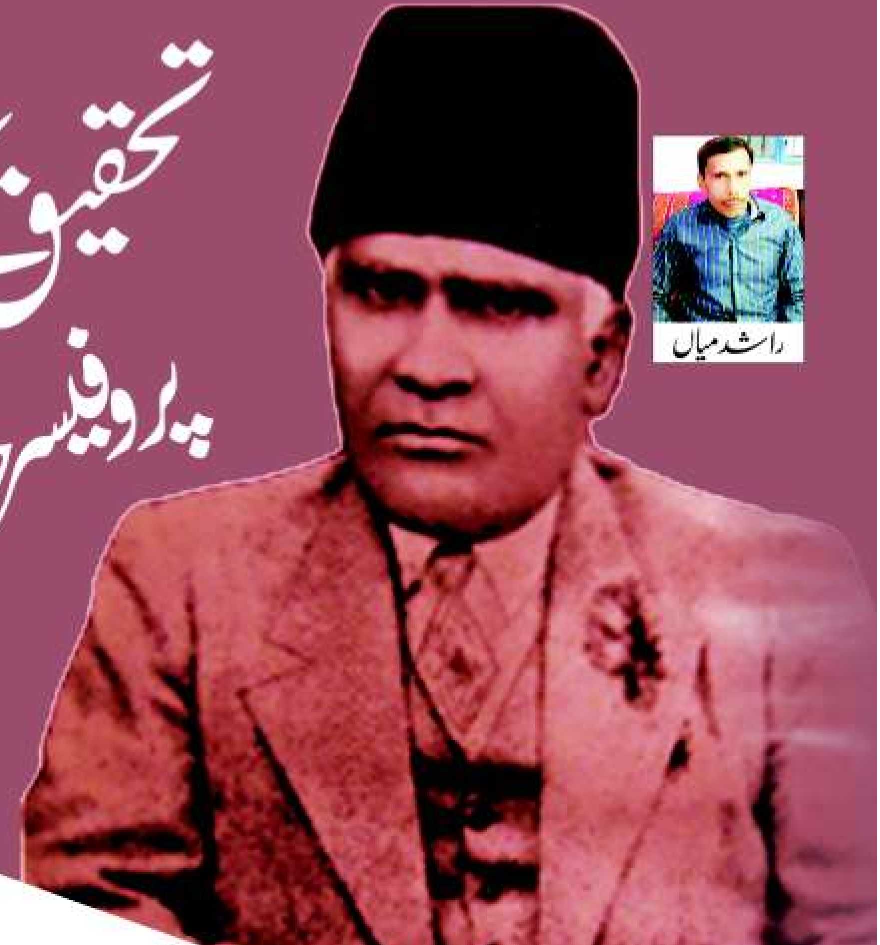

راشد میاں

اردو میں تحقیق کے معلم اول کہلانے کا شرف حافظ محمود شیرانی کو حاصل ہے۔ان کے لافانی تحقیقی کارنامے ناقابل فراموش ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بیشتر محققین اور ناقدین نے ان کے تحقیقی کارناموں کا نہ صرف اعتراف کیا ہے بلکہ انھیں قابل وقعت سمجھتے ہوئے بہترین الفاظ سے نوازا بھی ہے۔اس سلسلے میں پروفیسر نذیر احمد نے لکھا ہے:

''محمود شیرانی نے ادبی دنیا میں اوہام ومفروضات کے پچاسوں بت توڑے ہیں۔فردوسی کی طرف یوسف زلیخا کا انتساب، فردوسی کی ہجو محمود، فارسی دیوان کا حضرت شیخ معین الدین چشتی کی طرف انتساب، پرتھی راج راسا منسوب بہ چندر برداتی... وغیرہ موضوعات پر انھوں نے جس دقیق نظری سے بحث کی ہے اور جعلی انتساب کا جس طرح پردہ چاک کیا ہے، وہ تحقیقی دنیا کے شاہکار ہیں۔ان کے علاوہ بعض متداول کتابوں پر انھوں نے جیسا عادلانہ محاکمہ کیا ہے اس سے ان کے وسعت مطالعہ اور باریک بینی کا بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے۔اس سلسلے میں ان کی تنقید شعرالعجم، ترجمہ خزائن الفتوح اور تنقید آب حیات سرفہرست ہیں۔ پھر بعض کتابوں پر ان کے بے لاگ تبصرے ضخیم کتابوں پر بھاری ہیں... شیرانی صاحب نے اردو فارسی زبان وادب کے سیکڑوں موضوعات پر قلم اٹھایا ہے اور ہر موضوع پر جتنا نیا اور اچھوتا مواد فراہم کردیا ہے اس سے ادبی تاریخ مالامال ہوگئی ہے۔ان کی حیثیت ایک تاریخ ساز محقق ونقاد کی ہے... یہ بات بلا تامل کہی جاسکتی ہے کہ ایرانیات میں مشرق میں اس پائے کا کوئی اور محقق نظر نہیں آتا جس نے اتنے اہم موضوعات پر ایسی مختتم گفتگو کی ہو۔ایران کے نامور محقق مرزا قزوینی اپنی گوناگوں صلاحیت کی وجہ سے تحقیق کی دنیا میں غیر معمولی شہرت کے مالک ہیں لیکن فارسی ادب وزبان کے تعلق سے ان کا کارنامہ شیرانی کے برابر نہیں۔''[1]

محمود شیرانی کی ولادت 15 اکتوبر 1880 کو ریاست ،ٹونک میں ہوئی تھی، ابتدائی تعلیم کے ساتھ یہیں حفظِ قرآن کی سعادت بھی حاصل کی۔مزید تعلیم جودھپور، لاہور اور لندن جاکر حاصل کی۔ ملازمت کے سلسلے میں اگرچہ آپ کو لاہور قیام کرنا پڑا لیکن وطن کی محبت کے زیر اثر بار بار ٹونک آتے رہے۔یہیں 15 فروری 1946 کو بروز جمعہ ان کی وفات ہوئی۔ ان کی وصیت کے مطابق یہیں بناس ندی کے کنارے ٹکراج کلاں میں ان کا جسدِ خاکی سپردِ خاک ہوا۔وفات سے قبل آخری ایام میں اکثر اپنا ایک شعر پڑھا کرتے تھے۔

جاتے ہیں خالی ہاتھ گلستانِ دہر سے
اک سنگِ آرزو ہے جو سینے پہ دھر چلے

یہ سنگِ آرزو غالباً وہی خوابِ آرزو ہے جو ہر اس صالح فکر شخص کے ذہن میں رہتا ہے جس کے خوابوں کی تکمیل دم آخر تک نہیں ہوتی۔ دنیائے تحقیق میں اپنے بیش بہا اور لازوال کارنامے انجام دینے کے باوجود شاید انھیں زندگانی عمل وعلم میں عدیم الفرصتی کا گلہ رہا۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

ہم ایسے ٹھہرے منزل فانی میں جس طرح
آتے سرا میں شب کو مسافر، سحر چلے
فرصت ٹھہرنے کی نہ ملی باغ دہر میں
مثلِ نسیم ہم ادھر آئے، اُدھر چلے

محمود شیرانی میدانِ تحقیق کے ماہرِ فن ہونے کے ساتھ بہترین شعری صلاحیتوں کے بھی مالک تھے۔ان کا کلام بالخصوص ان کی نظمیں نخلستان، ٹیپو سلطان اور موت کا وقت' رسالہ مخزن میں شائع ہوئیں۔ان کے فرزند شاعر رومان اختر شیرانی نے ابتداً والد ماجد سے ہی مشورہ سخن کیا۔اختر شیرانی کی ایک مشہور نعت جس کا مطلع یوں تھا۔

اگر اے نسیم سحر ترا ہو گزر دیار حجاز میں
مرے آنسوؤں کا سلام کہنا حضور بندہ نواز میں

اختر نے جب یہ نعت والد محمود شیرانی کو دکھائی تو انھوں

نے 'آنسوؤں کا سلام' کے عوض 'چشمِ تر کا سلام' تحریر کر اصلاح کی۔[2]

محمود شیرانی علم کے شیدائی تھے، غریبی ان کے نزدیک کوئی عیب نہ تھا۔ وہ اپنے ایک مکتوب میں اپنے بھائی مودود خاں کو لکھتے ہیں:

''مودود تم یہ یاد رکھو کہ میں غریب آدمی کی صحبت سے نہیں گھبراتا کیونکہ غریبی میں کوئی عیب نہیں۔ لیکن جہالت عیب ہے۔ اس عیب کو تم دور کرو..... میری یہی آرزو ہے کہ علم میں نام پیدا کروں۔ والد مرحوم کی یہی آرزو تھی۔''

ایک دیگر خط میں اپنے بھائی مسعود خاں کو لکھتے ہیں:

''تم اور تمام خیالات کو دور کرو، صرف تجارت کرلو، اور اس میں خدا تم کو کامیابی دے گا۔ میں علم کا جویا ہوں اور تم کو خوشحالی کی ضرورت ہے۔ خدا ہم دونوں کو کامیاب کرے۔''

برادران کی بے اعتنائی کے باوجود علم حاصل کرنے میں ان کے ارادے بلند رہے، لہٰذا ایک جگہ مکتوب میں لکھتے ہیں:

''مجھ کو ابھی بہت کچھ سیکھنا ہے اور بہت کچھ پڑھنا ہے، لیکن جلد ان امتحانات سے فراغت ملے۔''

حقیقتاً انھوں نے اپنی زندگی کا بیشتر وقت علمی حقائق کو منظرِ عام پر لانے میں گزارا۔ ان کا پہلا مضمون 'گناہ' کے عنوان سے جون 1902 کو رسالہ 'مخزن' لاہور میں شائع ہوا۔ اس وقت ان کی عمر 22 سال تھی۔ اس کے بعد متواتر تادم آخر تحقیق و تحریر کا سلسلہ جاری رہا۔ تعلیمی سلسلے میں انھیں علی گڑھ تحریک سے بعض اختلاف تھے اس کا ذکر انھوں نے اپنے ایک دوست کے نام لکھے خط میں کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''اگرچہ شخصی طور پر میں سرسید کا مداح ہوں، لیکن ان کے کالج سے مجھ کو ہمدردی نہیں۔ اگرچہ کالج کا تماشائی اس کی لمبی چوڑی عمارت اور مسلمان بچوں کا ایک گروہ کثیر وہاں دیکھ کر خیرہ ہوجاتا ہے، لیکن میں اس تعلیم کو 'ینگ اسلامک موومنٹ' کے نام سے یاد کروں گا کیونکہ وہ کالج مسلمانوں کو اچھا خاصا انگریز بنا دیتا ہے اور جب یہ انگریز زیادہ پڑھ لکھ جاتا ہے تو وہ اسلامی علما، حکما اور فلسفیوں کو تو بھول جاتا ہے اور بات بات میں کسی قول کی تائید میں کسی انگریز کو پیش کرے گا۔''[3]

1904 میں ان کے والد نے ان کے شوقِ علم، بلند ہمتی اور حوصلہ کی قدر کرتے ہوئے انھیں لندن (انگلینڈ) تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھیجا۔ ڈاکٹر اویس احمد ادیب نے رسالہ 'آجکل' دہلی کے یکم فروری 1947 کے شمارے میں اس ضمن میں لکھا ہے:

''حافظ محمود شیرانی پہلے ایسے ہندوستانی فرد تھے جو راجپوتانہ کی سرزمین سے نکل کر انگلستان گئے۔''[4]

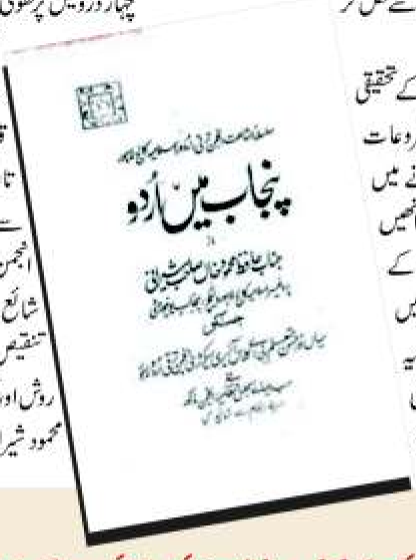

محمود شیرانی کے تحقیقی اور علمی کاموں کی شروعات قیامِ لندن کے زمانے میں ہی ہوئی۔ وہاں انھیں ڈاکٹر ہنری اسٹپ کے مسودے کی شکل میں ایک کتاب ملی۔ یہ کتاب تقریباً ڈھائی سو سال سے شائع نہیں ہوئی تھی، اور نہ ہی کوئی انگریزی پریس اسے شائع کرنا چاہتا تھا۔ وجہ اس کی غالباً یہ تھی کہ اس اشاعت سے کہیں محاسنِ اسلام عوام پر ظاہر نہ ہوجائیں۔ ساتھ ہی بہت سے مذہبی اختلاف اور غلط فہمیاں دور ہونے کا امکان تھا۔ محمود شیرانی نے احباب کے تعاون سے لوزک اینڈ کمپنی لندن سے 1911 میں اسے شائع کروایا۔ کتاب میں ان کا فاضلانہ دیباچہ اور ضمیمہ بھی شامل ہے، جس سے کتاب کی وقعت میں اضافہ ہوگیا ہے۔ علمی دنیا میں محمود شیرانی کا یہ اوّلین اور قابلِ فخر کارنامہ تھا۔

محمود شیرانی کے تحقیقی مقالات کو ان کے پوتے مرحوم ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی نے 'مقالاتِ شیرانی' کے عنوان سے دس جلدوں میں مرتب کرکے لاہور سے شائع کیا تھا۔ محمود شیرانی کا ہر مضمون و مقالہ آپ اپنی اہمیت کا حامل ہے۔ ان کی تصانیف کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ علمیت کا خزانہ اور معلومات کا دریا تھے۔ ان کی وہ تصانیف جنھیں زیادہ شہرت اور وقار حاصل ہوا ان میں تنقید شعرالعجم، ترجمہ خزائن الفتوح، پنجاب میں اردو، فردوسی اور شاہنامے پر مقالے، مجموعۂ نغز، تصحیح، تنقید قصہ چہار درویش پرتھوی راج راسا کے بارے میں بعض خوش فہمیوں کا ازالہ، تنقید آبِ حیات اور خالق باری کا اصل مصنف وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

تاریخی تنقید کے تعلق سے ان کی سب سے اہم تصنیف 'تنقید شعرالعجم' ہے جو انجمن ترقی اردو ہند دہلی سے 1942 میں شائع ہوئی۔ شعرالعجم پر تنقید کا مقصد شبلی کی تنقیص و مخالفت نہ ہوکر مصنفین کی عام روش اور تقلیدی رویہ کے خلاف احتجاج تھا۔ محمود شیرانی نے مذکورہ تصنیف میں شبلی کے تاریخی اور تحقیقی اغلاط کی جانب توجہ دلائی ہے۔ اس کتاب کے دیباچے میں وہ اس طرح رقم طراز ہیں:

''تنقید ہذا مولانا شبلی مرحوم کی فضیلت علمی کی منقصت نہیں ہے بلکہ محض احتجاج ہے اس مروجہ روش کے خلاف، جس میں ہمارے مصنفین تحقیق کی جگہ تقلید سے اور عقل کی جگہ نقل سے کام لیتے ہیں۔

ہم تاریخی واقعات اور سوانح لکھتے وقت اس قدر تکلیف گوارا نہیں کرتے کہ ان کو نقد و نظر کی کسوٹی پر پرکھ لیں اور ان کی صحت و درستی کے متعلق اطمینان کرلیں...

فارسی نظم کی تاریخ میں اردو زبان کی بے بضاعتی محسوس کرکے علامہ نے شعرالعجم تصنیف کی۔ اس موضوع پر اب تک فارسی اور اردو میں جس قدر کتابیں لکھی گئی ہیں، شعرالعجم ان میں بغیر کسی استثنا کے بہترین تالیف مانی جاسکتی ہے۔''[5]

تنقید شعرالعجم محمود شیرانی کی علمیت، وسعت نظری،

محمود شیرانی کے تحقیقی مقالات کو ان کے پوتے مرحوم ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی نے 'مقالاتِ شیرانی' کے عنوان سے دس جلدوں میں مرتب کرکے لاہور سے شائع کیا تھا- محمود شیرانی کا ہر مضمون و مقالہ آپ اپنی اہمیت کا حامل ہے- ان کی تصانیف کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ علمیت کا خزانہ اور معلومات کا دریا تھے- ان کی وہ تصانیف جنھیں زیادہ شہرت اور وقار حاصل ہوا ان میں تنقید شعرالعجم' ترجمہ خزائن الفتوح' پنجاب میں اردو' فردوسی اور شاہنامے پر مقالے' مجموعۂ نغز' تصحیح' تنقید قصہ چہار درویش پرتھوی راج راسا کے بارے میں بعض خوش فہمیوں کا ازالہ' تنقید آبِ حیات اور خالق باری کا اصل مصنف وغیرہ قابل ذکر ہیں-

دوربینی، تحقیق شناسی، تاریخ دانی اور قوی استدلال کا شاہکار نمونہ ہے۔ انھوں نے شعرالعجم کے مطالعے کے بعد جورائے قائم کی اس کے مطابق:

''علامہ شبلی اس تصنیف کے دوران میں مورخانہ و محققانہ فرائض کی نگہداشت سے بڑی حد تک غافل رہے ہیں۔ رطب ویابس جو کچھ ان کے مطالعے میں آجاتا ہے، بشرطیکہ دلچسپ ہو، حوالہ قلم کردیتے ہیں۔ بعض وقت دیکھا جاتا ہے کہ مولانا اپنے پچھلے بیانات کی آگے جاکر خود ہی تردید کرجاتے ہیں۔ پہلے کچھ رائے قائم کی، بعد میں جاکر کوئی اور نظریہ قائم کرلیا۔ ممکن ہے کہ شبلی تاریخ اسلام میں بہتر نظر رکھتے ہوں لیکن شعراءعجم کے حالات میں ان کے طاقتور قلم نے بہت لغزشیں کی ہیں۔ سن وتاریخ جوفنِ تاریخ کا ایک شاندار و قیع پہلو ہے اس پر اوّل تو پوری توجہ نہیں اور ضرورتاً کہیں ایسا کیا بھی تو غلطیوں سے خالی نہیں۔ بعض متاخرین کو متقدمین کا پہلونشیں بنادیا اور بعض متقدمین کو متاخرین کا ہم بزم کردیا... جو جو اطلاعات آسانی سے مولانا شبلی کی دسترس میں آسکیں انھیں پر قناعت کی۔ زیادہ تحقیق اور تلاش سے کام نہیں لیا۔''[6]

پروفیسر سید امیر حسن عابدی نے اس ضمن میں لکھا ہے:

'علامہ شبلی کے پاس اس زمانے تک اتنا مواد نہ تھا جتنا حافظ صاحب کو میسر ہوا، نیز علامہ نے اپنا وقت شعر پرکھنے اور اس کے حسن وخوبی کی دریافت میں صرف کیا، تحقیق کو ہاتھ نہیں لگایا... حافظ صاحب کی تحریریں ہم سب کے لیے قابلِ قدر، مگر علامہ کے خلاف جو لہجہ اختیار کیا ہے، وہ قطعاً قابلِ افسوس ہے، جو ایک عالم کے شایانِ شان نہیں ہے، نیز انھوں نے جو موشگافیاں کی ہیں، وہ بھی ضرورت سے زیادہ ہیں۔''[7]

چونکہ علامہ شبلی ایک فاضل بزرگ اور عالمی شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی گراں قدر علمی وادبی خدمات کی بنا پر ملک میں ان کے پرستار و معتقدین کی وافر تعداد موجود تھی۔ لہٰذا اس تنقید پر بحث واعتراضات کی گنجائش تھی لیکن قیامِ ٹونک کے زمانے میں محمود شیرانی نے بعض احباب سے یہ فرمایا تھا کہ اگر 'تنقید شعرالعجم' کا جواب دیا گیا تو میرے پاس اس کا جواب الجواب موجود ہے۔ اپنی حیات کے آخری زمانے میں انھوں نے پروفیسر ابراہیم ڈار کو جو خط تحریر کیا، اس سے بھی یہ تصدیق ہوتی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ:

''میں نے اس خیال سے کہ تنقید پر اعتراضات ہوں گے اور بحث چھڑے گی، بعض جدید امور کے لیے اطلاع بغرض مدافعت محفوظ کرلی تھی۔ اب مجھے افسوس ہے کہ وہ ساری باتیں میرے ذہن سے نسیا منسیا ہوگئی ہیں۔''[8]

بعض اعتراضات و بحث سے قطع نظر تاریخی تنقید کے زمرے میں محمود شیرانی کا یہ گراں قدر کارنامہ ہے۔

'پنجاب میں اردو' محمود شیرانی کی دوسری اہم مقبول کتاب ہے جو 1928 میں لاہور سے شائع ہوئی۔ لسانی تحقیق کے اعتبار سے یہ بڑی اہم کتاب ہے۔ اس میں اردو زبان کے آغاز سے متعلق تفصیلی معلومات قوی استدلال کے ساتھ فراہم کی گئی ہے۔ علم داں حلقے میں اس کی خاطر خواہ پذیرائی ہوئی۔ کتاب میں اپنا نظریہ پیش کرنے سے قبل انھوں نے اردو کے مشہور مصنفین (میرامن، سرسید، آزاد وغیرہ) کے ذریعے اردو کی ابتدا کے سلسلے میں تحریر کیے گئے اقوال کی تردید کرتے ہوئے اپنا نظریہ پیش کیا ہے۔

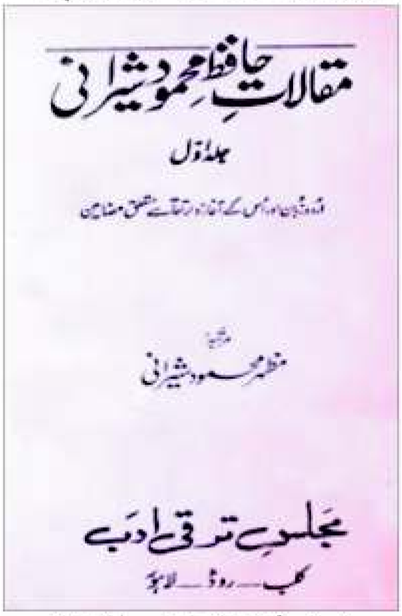

محمود شیرانی کے نزدیک ''اردو دہلی کی قدیم زبان نہیں بلکہ وہ مسلمانوں کے ساتھ دہلی جاتی ہے اور چونکہ مسلمان پنجاب سے ہجرت کرکے جاتے ہیں اس لیے ضروری ہے کہ وہ پنجاب سے کوئی زبان اپنے ساتھ لے کر گئے ہوں۔''[9]

اپنے نظریے میں شیرانی نے تاریخی دلائل اور قیاس آرائیوں کے ساتھ لسانی شواہد بھی پیش کیے ہیں، وہ لکھتے ہیں:

''اردو اپنی صرف میں پنجابی و ملتانی زبان کے بہت قریب ہے... دونوں زبانیں تذکیروتانیث کے قواعد افعال مرکبہ وتوابع میں متحد ہیں، پنجابی اور اردو میں ساٹھ فیصدی سے زیادہ الفاظ مشترک ہیں۔''[10]

اپنی علمیت اور لسانی بصیرت کی روشنی میں شیرانی نے جو نتائج پیش کیے ان میں بڑی کشش تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اہلِ علم پر ان کی اس تحقیق کا بڑا گہرا اثر ہوا۔ متعدد رسائل میں اس پر تبصرے بھی شائع ہوئے۔

محمود شیرانی نے 1933 میں میر قدرت اللہ قاسم کے مجموعہ نغز کی ترتیب وتصحیح کی۔ یہ کتاب اسی سال پنجاب یونیورسٹی لاہور سے شائع ہوئی۔ اس کی تدوین میں انھوں نے بڑی محنت، دقتِ نظر اور دیدہ ریزی سے کام لیا تھا۔ اس کی اہمیت وافادیت پر تبصرہ کرتے ہوئے علامہ اقبال نے لکھا ہے کہ:

''اگرچہ ظاہری صفات میں بھی کتابت، طباعت، کاغذ اور جلد کی دیدہ زیبی کے لحاظ سے 'مجموعہ نغز' ہماری ستائش کی حقدار ہے لیکن جس چیز نے اس کو نغز تر بنا دیا ہے وہ اس کے فاضل مرتب حافظ محمود شیرانی صاحب کی دقتِ تحقیق ہے، حافظ صاحب کا نام محتاج تعارف نہیں۔ ان کے علمی مضامین، اربابِ ذوق سے ان کو اچھی طرح روشناس کراچکے ہیں۔ اردو فارسی ادب کے وہ مشہور محقق ہیں اور ان کی تحقیقات کا معیار نہایت بلند تسلیم کیا جاچکا ہے۔ مجموعہ نغز کی ترتیب وتصحیح میں انھوں نے اس جانفشانی اور دقتِ نظر سے کام لیا ہے، جس کے لیے وہ مشہور ہیں۔''[11]

مجموعہ نغز کی تدوین متنی تنقید کا ایک قابلِ فخر نمونہ ہے۔ یہاں یہ ذکر بھی برمحل ہوگا کہ علامہ اقبال سے ان کی ملاقات لندن میں ہوئی تھی۔ ان کی (محمود شیرانی کی) تحقیقی کاوشوں کے مداح ہونے کے ساتھ ان کی قدر اور احترام کیا کرتے تھے۔ ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی نے لکھا ہے کہ ''ان کے پاس ایسے رقعے موجود ہیں جن میں اقبال مرحوم نے ان سے بعض فارسی کتابوں یا الفاظ کے متعلق استفسار کیا ہے۔''[12]

محمود شیرانی نے اسی سال (1923) تنقید قصہ چہار درویش سالنامہ کارواں کے ذریعے شائع کی۔ قصہ چہار درویش کے خالق اب تک امیر خسرو کو تسلیم کیا جاتا رہا۔ پہلی مرتبہ محمود شیرانی نے تاریخی حقائق اور لفظیات کے ذریعے اسے غلط ثابت کیا۔ ان کے نزدیک جو الفاظ اور اشیا، چہار درویش میں تحریر ہیں وہ جدید الاستعمال ہیں (مثلاً اشرفی، تومان اور دوربین وغیرہ) یہ الفاظ واشیا اس زمانے تک بالکل رائج نہیں تھے۔ اسی طرح ان کے مطابق 'قصہ چہار درویش' میں جن شاعروں کا کلام استعمال ہوا ہے ان میں سے بیشتر شعرا خسرو سے کافی بعد کے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے میر کے 'نکات الشعرا' میں اقبال کا کلام شامل ہو۔ مذکورہ حقائق کی روشنی میں شیرانی امیر خسرو کو قصہ چہار درویش کا مصنف تسلیم نہیں کرتے۔ انھوں نے قوی استدلال کے ذریعے یہ ثابت کیا کہ اس کا مولف فرقہ اثنا عشری کا فرد

تھا۔ جب کہ خسرو کا مسلک سنی تھا۔

تنقید پرتھی راج راسا 1942 میں طبع ہو کر انجمن ترقی اردو (ہند) سے شائع ہوئی۔ پرتھی راج راسا پرتھوی راج چوہان کے درباری کوی چندر بردائی سے منسوب کی جاتی ہے۔ یہ ایک مجہول کتاب ہے جو گیارہویں صدی عیسوی کی تصنیف بتائی جاتی ہے۔ دیسی زبانوں (جدید پراکرتوں) میں یہ سب سے قدیم کتاب کا درجہ حاصل کیے ہوئے ہے۔ کتاب پرتھوی راج اور سپاہیوں و جنگجوؤں کی داستانیں قلمبند کی گئی ہیں۔ یہ ایک منظوم قصہ ہے جو ہندی و راجستھانی زبان میں ہے لیکن اس میں عربی و فارسی زبان کے الفاظ بھی استعمال ہوئے ہیں۔ محمود شیرانی کے مطابق یہ الفاظ اس زمانے تک رائج ہی نہیں تھے جو بعد میں اضافہ کیے گئے ہیں۔ راجپوت اور بعض دیگر عقیدت مند مذکورہ کتاب کو صحیفۂ آسمانی کی طرح سمجھتے ہیں۔ وہ اپنے نسب ناموں کے سلسلے میں اسے قدیم ماخذ بھی تسلیم کرتے ہیں۔

محمود شیرانی کے مطابق راسا کا مصنف چندر بردائی نہ ہو کر کوئی بھاٹ یا نقال ہے، جس نے راجہ کو خوش کرنے کے لیے یہ خود ساختہ اور مبالغہ آمیز داستان کہی۔ یہ بھاٹ ایسا لاعلم شخص ہے کہ اس لفظ 'گوری' جو لفظ غوری کا ہندی تلفظ ہے، اس سلسلے میں وہ یہ من مانی اور خود ساختہ بات بیان کرتا ہے کہ چونکہ سلطان کی ماں نے ایک 'گور' یعنی قبر میں پرورش پائی تھی اس لیے وہ 'غوری' کہلایا۔ کوی چندر بردائی نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ پرتھوی نے غوری کو جنگ میں بیس بار ہرایا، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ دونوں کے مابین دو جنگیں ہوئی تھیں۔ دوسری جنگ میں پرتھوی راج کو شکستِ فاش ہوئی اور وہ مارا گیا۔ اس طرح اس بھاٹ نے نہ صرف تاریخی حقائق کے ساتھ کھلواڑ کیا ہے، بلکہ قومی اتحاد کو بھی چوٹ پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ شیرانی سے قبل ہندی زبان کے عالم کوی راج شیامل داس نے بھی 1886 میں تحریر کردہ ایک تحقیقی مضمون میں 'راسا' کو جعلی تصنیف قرار دیا تھا لیکن محمود شیرانی نے تاریخی شواہد اور واقعات کی دریافت سے 'راسا' کی جو تنقید کی ہے وہ مکمل اور لاجواب ہے۔ ان کا بیان ہے:

''یہ ادبی تفنن جو ابتدا میں کسی معمولی علمیت کے بھاٹ نے محض ذاتی خیال کے فائدے سے راجپوتانہ کے کسی راجا کو اپنے دامِ تزویر میں لانے کی امید میں کیا تھا اور انجام کار مغرب کے بڑے بڑے علما کو جن کے نام تاریخ و لسانیات میں بڑے ادب سے لیے جاتے ہیں، کامل طور پر گمراہ کرنے میں کامیاب ہوا، مضحکہ کا ایسا شاندار پہلو وہ ہمارے سامنے پیش کرتا ہے جس کی نظیر تاریخ میں مشکل سے نظر آتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس تالیف کو بحیثیت کتاب تاریخ تسلیم کرنا ایک عظیم الشان غلطی تھی جو ہمیشہ قابلِ افسوس رہے گی۔''[13]

> **محمود شیرانی کے مطابق یہ الفاظ اس زمانے تک رائج هی نہیں تھے جو بعد میں اضافہ کیے گئے ہیں۔ راجپوت اور بعض دیگر عقیدت مند مذکورہ کتاب کو صحیفہ آسمانی کی طرح سمجھتے ہیں۔ وہ اپنے نسب ناموں کے سلسلے میں اسے قدیم مآخذ بھی تسلیم کرتے ہیں۔**

'راسا' پر شیرانی کی تنقید کو ہندی ادب کے بیشتر ناقدین نے بھی درست اور قابلِ اعتبار تسلیم کیا ہے۔ تحقیقی کاوش کے اعتبار سے یہ شیرانی کے لیے ایک بڑی کامرانی ہے۔

حفظ اللسان معروف بہ خالق باری 1944 کی شائع شدہ کتاب ہے۔ خالق باری کو ایک عرصۂ دراز تک امیر خسرو کی تصنیف مانا جاتا رہا۔ اولاً محمد حسین آزاد نے 'آبِ حیات' میں اس کی ضخامت کا ذکر کرتے ہوئے اسے امیر خسرو کی تصنیف بتایا ہے۔ آزاد کے بعد خالق باری کے خسرو کی تصنیف ہونے نہ ہونے کے سلسلے میں اپنی تحریروں سے متواتر رائے زنی کرنے والے حضرات میں محمد امین عباسی چریاکوٹی، وحید مرزا، مسعود حسین رضوی، صفدر آہ، جمیل جالبی، ممتاز حسین، افسر صدیقی، گوپی چند نارنگ اور گیان چند جین وغیرہ کے نام شامل ہیں لیکن محمود شیرانی نے مختلف دلائل و شواہد سے یہ ثابت کیا ہے کہ خالق باری امیر خسرو کی نہیں بلکہ ان کے برسوں بعد ضیاء الدین خسرو نامی ایک شخص کی تحریر و تصنیف ہے۔ خالق باری میں بحور و اوزان کی اغلاط کو واضح کرتے ہوئے شیرانی نے بتایا کہ خسرو جیسا استاد شاعر ایسی غلطیاں نہیں کر سکتا۔ زمانہ مسکوکات اور تاریخی شواہد کے ذریعے بھی شیرانی نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ خالق باری خسرو کے بہت بعد کے زمانے گیارہویں صدی ہجری کی تصنیف ہے۔

تنقید آبِ حیات 1941 کے درمیان تین قسطوں میں اورینٹل کالج میگزین لاہور میں شائع ہوئی تھی۔ آبِ حیات محمد حسین آزاد کی مابہ الامتیاز تصنیف و تذکرہ ہے جس میں اس عہد تک بیشتر مشہور شعرا کی سوانح و نمونۂ کلام موجود ہے۔ شیرانی صاحب نے آبِ حیات میں شعرا کی ترتیب، تقدم و تاخر اور دیگر تاریخی اغلاط پر اعتراضات کیے ہیں۔ دراصل اس اہم کتاب کی تنقید محمود شیرانی نے اپنی عمر کے اس آخری عہد میں کی تھی جب وہ بسترِ علالت پر تھے۔ یہی وجہ رہی کہ یہ کتاب نامکمل رہ گئی ہے۔

محمود شیرانی نے اردو کے علاوہ فارسی زبان و ادب سے متعلق بھی نہایت اہم تحقیقی موشگافیاں کی ہیں۔ فارسی ادب کے متعدد موضوعات ان کے دائرۂ کار میں رہے۔ اس سلسلے میں ان کا مرغوب ترین موضوع فردوسی اور شاہنامہ فردوسی رہا۔

فردوسی کے مذہب و عقیدے کی وضاحت کے ساتھ ان کا اہم ترین کارنامہ فردوسی کی جانب یوسف زلیخا کے انتساب کو تحقیق سے غلط ثابت کرنے کا ہے۔ اس ضمن میں پروفیسر نذیر احمد رقم طراز ہیں:

''انھوں نے اس موضوع پر جتنا اچھوتا کام کیا ہے اور جتنا نیا مواد فراہم کردیا ہے، مشرق و مغرب کے سارے محققین مل کر نہیں کر سکے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ فردوسی اور شاہنامے پر ہزاروں صفحے لکھے گئے ہیں لیکن ان میں تکرار ہے''[14]

تحقیق میں کوئی حرفِ آخر نہیں ہوتا۔ تحقیقاتِ شیرانی سے متعلق مزید تحقیقات و تخلیقات منظرِ عام پر آتی رہیں گی لیکن محمود شیرانی اولاً اپنے مخصوص و منفرد تحقیقی کارہائے نمایاں کی بدولت اردو میں تحقیق کے معلمِ اول کہلانے کے بجا طور پر مستحق رہیں گے۔

حوالہ جات

1. حافظ محمود شیرانی: تحقیقی مطالعے مرتب: پروفیسر نذیر احمد دہلی، 1991، ص 47-48
2. بحوالہ جرنل خصوصی شمارہ 1، 82-81، ایم اے اپارٹ ٹونک، ص 159
3. ایضاً، ص 21,22
4. ایضاً، ص 111
5. مقالات حافظ محمود شیرانی، جلد پنجم، لاہور، 1970، ص 1,3
6. ایضاً، ص 4,6
7. بحوالہ حافظ محمود شیرانی تحقیقی مطالعے، ص 254
8. مکاتیب حافظ محمود شیرانی، لاہور 1981، ص 296
9. پنجاب میں اردو، ص 4
10. ایضاً، ص 4,5
11. رسالہ کاروان، مرتب: ملک مجید لاہور 1922، (دسمبر) مشمولہ جرنل خصوصی شمارہ 1، ایم اے اپارٹ، ٹونک، ص 107
12. بحوالہ جرنل شمارہ 1، ص 47
13. پرتھی راج راسا، انجمن ترقی اردو ہند، دہلی 1942، ص 6
14. بحوالہ حافظ محمود شیرانی تحقیقی مطالعے، ص 248

Dr. Rashid Miyan
Mohalla Ghol Near Masjid Goul
C/o Gamar Gallab
Tonk - 304001 (Raj)
Mob.: 7240302056

سرفراز جاوید

دولت وصحت کی نعمت کا فلسفہ اور کلامِ نظیر

کائنات کی ہر شے فانی ہے۔ کائنات کی تمام مخلوقات میں باہمی ربط ہے، انسان، حیوان، شجر، حجر کے خدانے جوڑے بنائے ہیں۔ جس کے بغیر شے کا وجود بے معنی ہے۔ یہ باہمی روابط ایک دوسرے کی بقاوارتقا میں معاون ومددگار ہیں۔ نوع بشران سب سے استفادہ کا مجاز ہے۔ خالق حقیقی نے کرۂ ارضی پر بنی نوع انسان کو اشرف المخلوقات بنایا ہے۔ دیگر جاندار پر نطق وعقل کے باعث فکروپیام کی شعوری ترسیل کی سبقت سے بھی نوازا ہے۔ انسان شعوری طور پر دنیاوی امور میں اختیاروانتخاب کی آزادی کا مکلّف بھی ہے۔ مگر انسان نے ذاتی مفاد کی خاطر مثبت ومنفی اقدام کی پرواہ کیے بنا، اختیارات کا بے دریغ استعمال کیا ہے۔

ذریاتِ آدم نے ذاتی فکرومزاج کی خاطر خودکو غیر فطری طور پر طبقات میں منقسم کردیا نیز معاشرتی سطح پر بہت سی ایسی پابندیاں بھی عائد کی گئیں۔ جونہ صرف مذہب وذات تک ہی محدود ہیں، بلکہ زبان والفاظ کے استعمال پر بھی لگائی گئیں۔ اسی امتیاز کے سبب شیخ ولی محمد نظیرا کبرآبادی جیسے خالص انسانی تہذیب وثقافت کے شاعر کو، طبقہ اشرافیہ نے قابل توجہ ہی نہیں سمجھا۔

اکبرآبادی فطرتاً نظم کے بڑے شاعر ہیں۔ ان کی نظموں کے عناوین ومضامین عوام الناس کے مزاج سے میل کھاتے ہیں۔ یوں تو انھوں نے غزلیں بھی کہی ہیں مگر ان کے مزاج سے نظم کی مناسبت حددرجہ ہے، جو مربوط خیال کی حامل ہوتی ہے۔ ان کے طبعی میلان کے باعث بہت سی غزلیں غزل مسلسل کے زمرے میں آتی ہیں۔

کلام نظیر کے اس موضوع پر گفتگو کرنے کے ساتھ فلسفہ کے متعلق عرض کرنا مناسب سمجھتا ہوں، انگریزی میں اسے Philosohy کہتے ہیں۔ یہ دولفظوں یعنی Philo اور Sophia سے تشکیل پایا ہے۔ Philo اور Sophia کے معنی محبت اور حکمت کے ہیں۔ اس سیاق میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ فلسفہ، حکمت سے محبت کرنے کا عمل ہے۔

دراصل فلسفہ کسی شے کے مادی یا خیالی وجود کے ہونے پر انتہائی منطقانہ استدلال کے ذریعے ثبوت فراہم کرنے کا نام ہے۔ اسی خوش عقیدت مندی میں کلیاتِ نظیر اکبرآبادی کے مرتب نے ان کی چندشعری تخلیقات کو فلسفیانہ نظموں کے ذیل میں رکھا ہے۔ میں نے مضمون کے مباحث میں اپنے مطالعے کو دولت وصحت کی نعمت سے متعلق، حکیمانہ نظموں تک ہی محدود رکھا ہے۔ ان نظموں پر غور کرتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے، کہ شاعر نے نظموں کے عنوانات سے متعلق نفس مضمون کو انتہائی کمال تک پہنچا دیا ہے۔ جس پر اضافہ ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔

اس تمہید کے بعدان کی فلسفیانہ نظموں میں نوع بشر کے لیے دولت وصحت کی نعمت اوراس کی احتیاجات اور مسائل پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ نظیرا کبرآبادی کی نظموں کا اصل موضوع ابن آدم اوراس کی ضروریاتِ زندگی پر ہی مرتکز ہے۔ انھوں نے اپنے عہد کے انسانی وسائل ومسائل میں عوامی احتیاجات کو اپنی تخلیقات کا مرکز بنایا ہے۔

شاعر نے ہندوستانی مشترکہ تہذیبی طرز معاشرت کے ساتھ خاص طور سے عام آدمی کی فرمائش کو شعری فن میں ڈھال دیا ہے۔ انھوں نے ہر پیشے کے فرد وبشر اور مذہب وملت سے متعلق نظمیں لکھی ہیں۔

’کلیات نظیر‘ میں عنوانات کی تکرار کے ساتھ مخمس اور مسدس کی ہیئت میں 16 فلسفیانہ نظمیں ہیں۔ پہلی نظم ’کوڑی کی فلاسفی‘ کے عنوان سے 11 بندوں پر مشتمل ہے۔ جو ہر زمانے کے انسان کے لیے کوڑی یعنی دولت کی اہمیت کو بڑے مدلل انداز میں پیش کرتی ہے۔ دنیا میں آدمی کو معاشرتی معاملات کے لیے کوڑی یعنی دولت و پیسہ از حد ضروری ہے۔ جس شخص کے پاس یہ نعمت ہوتی ہے۔ وہ اپنے سماج میں قابل یقین، بہترین نعمتوں کا مالک، عمدہ لباس زیب تن کرنے کا مجاز، مزید یہ کہ عوام اسے فہم وشعور کا مالک بھی گردانتے ہیں۔ جس کا مشاہدہ معاصر دور میں بھی عام طور پر صاحب اقتدار ہستیوں کے تعلقات سے کیا جاسکتا ہے۔

نظیرا کبرآبادی کوڑی کی اہمیت کا اظہار ہر بند میں ٹیپ کے شعر یا مصرع میں کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں ہمیں جہانِ فانی کی معاشرتی زندگی میں جو بھی نقش ونگیں یعنی مرصع سازی، عیش وآرام اور اشیا کی قدر وقیمت ہے سب پیسے کی بدولت نظر آتی ہیں۔ ورنہ چیزیں کوڑی کی کمی کے باعث بڑے سستے داموں میں بکتی ہیں۔ شاعر نے ٹیپ کے شعر میں ’کوڑی کے تین تین بکنا‘ محاورے کو مدنظر رکھ کر یہ بات کہی ہے۔

کوڑی کے سب جہاں میں نقش ونگین ہیں ‫ ‫ ‫ ‫ کوڑی نہ ہو تو کوڑی کے پھر تین تین ہیں

ہمارے معاشرے میں پیسے کے بغیر انسان زمین پر سونے کے لیے مجبور محض ہے مگر پیسہ ہوتے ہی شہ نشیں ہوجانا، جاموں میں سنہرے پٹکے بندھ جانا، گھوڑے کی زین پر موتیوں کے گچھے لگ جانا، مزید بادشاہت کی چاہ، فوج وسپاہ کی ثابت قدمی، لیکن فقیر چھڑی، رومال لے کر دکانوں پر کوڑی کے لیے گداگری کرتا پھرتا ہے۔

شاعر کے نزدیک دنیا میں جو بھی جھمیلے یعنی ضروریاتِ وسائل کی فراہمی، جنگ وجدل کا ساز وسامان، سپاہیوں کا فوج میں تلوار وبندوق کاندھے پر رکھنا، ایک دوسرے ملک پر چڑھائی کرنا، ابن آدم کا باہم خونریزی کرنا، انسان کی پیسے کے واسطے جان بھی قربان کردینا، عموماً یہ سب کوڑی کے لیے ہی ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو بہت سے کاموں کا ہونا محال ہے۔ جب ہم اپنے معاشرے کا مشاہدہ کرتے ہیں تو ایسے حضرات بھی ملتے ہیں جو کوڑی کے لیے لوگوں سے مار کھاتے اور بے عزت بھی ہوتے ہیں۔ مگر بہت سے انسان ایسے بھی ملیں گے، جو کوڑی کے لیے گندگی میں منہ ڈالنے، حتیٰ کہ آنکھوں سے اٹھانے میں بھی عار وشرمندگی محسوس نہیں کرتے۔ اگر انسان کے پاس کوڑی نہیں تو اس کی عزت نہیں ہوتی۔ ہاں جب اس کے پاس پیسہ ہوجاتا ہے تو وہی فرد سیٹھ بن بیٹھتا ہے۔ انسان کوڑی کی بدولت رفاہِ عام، ملکی وعوامی فلاح وبہبود کے کام یعنی سیر وتفریح کے واسطے باغ

ونخلستان، سرائیں اور پکے کنوئیں بنواتا ہے۔ دولت و کوڑی ہی کے لیے مفلس، فقیر، بادشاہ اور وزیر سب دلچسپی لیتے ہیں۔ حتیٰ کہ بچے، جوان اور بوڑھے بھی جان دینے پر آمادہ نظر آتے ہیں۔ یعنی کوڑی ایسی دلربا شے ہے، جو سب کے لیے دلپذیر بن جاتی ہے۔ نظم کا آخری بند ملاحظہ ہو۔

لے مفلس اور فقیر سے تا شاہ اور وزیر   کوڑی وہ دلربا ہے کہ ہے سب کی دل پذیر
دیتے ہیں جان کوڑی پہ طفل و جوان و پیر   کوڑی عجب ہی چیز ہے میں کیا کہوں نظیر
کوڑی کے سب جہاں میں نقش و نگین ہیں
کوڑی نہ ہو تو، کوڑی کے پھر تین تین ہیں

نظیر اکبرآبادی نے پیسے کی فلاسفی کے عنوان سے دو نظمیں کہی ہیں۔ دونوں مخمس اور مسدس کی ہیئت میں 11 اور 16 بندوں پر مشتمل ہیں۔ انھوں نے نظم میں یہ پیش کیا ہے، کہ دنیاوی سطح پر جس کی دسترس میں پیسہ ہے، اسی کے سب نقش ونگار، ٹھاٹ باٹ، بہترین عمارت، کھانے پینے کی اشیا، فاخرہ لباس زیب تن یعنی وسائل کے ذریعے فراہم ہونے والے تمام عیش و آرام ان کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ انسان پر عیش وعشرت کی آمد اور باغ وگلشن میں سرو وسمن، لالہ وگل کا حصول پیسے ہی کی دین ہیں۔ مگر نظیر بھی آخر ایک انسان ہیں جب ایک مکان کو دیکھ کر حیرت واستعجاب کی کیفیت میں اپنی ذات سے استفسار کر بیٹھتے ہیں، تو انھیں عقل وشعور سے جواب ملتا ہے۔

واں سے نکلا تو مکاں اک نظر آیا ایسا   در و دیوار سے چمکے تھا پڑا آبِ طلا
سیم چونے کی جگہ اس کی تھا اینٹوں سے لگا   واہ وا کر کے کہا میں نے یہ ہوگا کس کا
عقل نے جب مجھے چپکے سے کہا پیسے کا

نظیر فطرتاً یار دوستوں سے بڑی رسم وراہ رکھتے تھے اور ان کو یہ مشورہ بھی دیتے تھے کہ اگر عاشق روٹھ کر منت وسماجت سے بھی راضی نہ ہو تو اسے پیسوں کی خوبیوں کی بدولت موم ونرم کیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ انسان کی عام طور پر بہت سی احتیاجات اور خوشیاں پیسے کی بدولت پوری ہوجاتی ہیں۔ نظیر کے نزدیک پیسہ ہی مادی جہان میں رنگ وروپ اور مال و دولت ہے۔ اگر انسان کے پاس پیسہ نہیں ہے۔ تو پھر وہ چرخے کی مال کے مانند ہے۔ دوسری نظم کے ٹیپ کا شعر دیکھیے جو صنعت تجنیس کی بہترین مثال بھی ہے۔

پیسا ہی رنگ روپ ہے پیسا ہی مال ہے   پیسا نہ ہو تو آدمی چرخے کی مال ہے

یہ حقیقت ہے کہ انسان کے دل ودماغ میں پیسے کی فراوانی کے باعث بہت سے خیالات بروئے کار آتے ہیں۔ مگر مفلس وفقیر کے دل میں پیسے کی کمی کی بابت سوالیہ تصورات ہی پیدا ہوتے ہیں۔ انسان کو پیسے کے زور شور سے ٹھاٹ باٹ، کوٹھیاں اور دیگر لوازماتِ عیش وآرام حاصل ہوجاتے ہیں۔ بہ قول کسی دانشور کے پیسہ ہونے اور نہ ہونے کی بدولت ہی کوئی شے مہنگی اور سستی ہوتی ہے۔ اگر انسان کے پاس پیسے کی آسودگی ہوتی ہے تو ہر روز چہرے پر تیوہار کی خوشی کا منظر رہتا ہے۔ پیسہ نہ ہونے کے باعث ضروریاتِ زندگی کی عام چیزیں بھی میسر نہیں ہوتیں۔ انسان مضمحل اور یاسیت کا شکار ہوجاتا ہے۔ آدمی پیسے کے ذریعے دیوؤں کو بھی قابو میں کرسکتا ہے۔ اورنہیں تو مکڑی کے جالے سے بھی خوف کھاتا ہے۔ بشر پیسے سے لالہ جی، بھیا جی اور چودھری کہلاتے ہیں۔ نہیں تو ساہوکار بھی چور سا دکھائی دیتا ہے۔ انسان پیسے ہی کے ذریعے مرصع کاری، نقش ونگار اور خوشبو وعنبر سے جسم کو معطر اور چہرے کو پرنور بناتا ہے۔ ورنہ چہرے پہ دھول ہی لپٹی رہتی ہے۔ معاشرے میں پیسہ اعتبار ووقار دلانے میں بے حد معاون ہوتا ہے۔ نظیر نے مزید بڑے نکتہ وراز کی بات کہی ہے کہ اگر پیسے کی فراوانی میں کسی انسان پر غم کے حالات آجائیں، تو بھی بہار کا سماں پیدا ہوجاتا ہے، مگر پیسہ نہ ہونے پر شادی میں بھی خواری نظر آتی ہے۔ پیسے کی کمی کا شدید افسوس تو وہاں ہوتا ہے جب ایک بھائی دولت کی فراوانی اور فارغ البالی میں بھی اپنے نادار بھائی کا حال نہیں پوچھتا۔ نظیر آگے بڑھ کر یہ بھی اظہار کرتے ہیں کہ جس مکان میں پیسہ ہوتا ہے وہاں پر فرشتوں کے بال و پر بھی پھنستے ہیں۔ پیسے کے آگے محبوبِ خوش جمال بھی کچھ نہیں، وہ تو پرستان سے بھی پری نکال لاتا ہے۔ ہاں انسان کا تلوار اٹھانا، اس پر دھار لگانا، زخم کھانا، سر کٹانا۔ سب عمل پیسہ ہی کراتا ہے۔ طرفہ تو یہ ہے کہ آدمی ہی آدمی کو پیسے کے ذریعے غلام بناتا ہے۔ انسان خیر وبھلائی کے بہت سے کام پیسے کے باعث ہی سہولت و آرام سے کرتا کراتا ہے۔ آخر پیسہ ہی جہاں کے بیچ میں بہت سی چیزوں کے قائم مقام کی خدمات انجام دیتا ہے۔

دین دار اس سے دہر میں کہلاتا نام ہے   پیسا جہاں کے بیچ وہ قائم مقام ہے
پیسا ہی جسم وجان ہے پیسا ہی کام ہے   پیسے ہی کا نظیر یہ آدم غلام ہے
پیسا ہی رنگ روپ ہے پیسا ہی مال ہے
پیسا نہ ہو تو آدمی چرخے کی مال ہے

'آٹے دال کی فلاسفی' کے عنوان سے دو نظمیں ہیں۔ اوّل نظم مخمس کی ہیئت میں سات بندوں میں ہے۔ ہر بند کے آخری مصرع میں ٹیپ کی تکرار ہے۔ دوسری مسدس کی ہیئت میں 8 بندوں میں ہے۔ نظم کے مطالعے سے یہ بات واضح ہے کہ انسانی حیات وزیست کی بقا کے لیے خورد ونوش کی چیزوں کا استعمال ناگزیر ہے۔ نظیر نے اشیائے خوردنی میں آٹے دال کی اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے، یہ اظہار کیا ہے کہ ان کے لیے ہر انسان فکرمند ہے۔ اگر انسان کو اس سے آزادی میسر ہوتی تو وہ جہاں میں اِدھر اُدھر کیوں مارا مارا پھرتا، بند پر غور کیجیے۔

گر نہ آٹے دال کا یاں کھٹکا ہوتا بار بار   دوڑتے کاہے کو پھرتے دھوپ میں پیادے سوار
اور جتنے ہیں جہاں میں پیشہ ور اور پیشہ دار   ایک بھی جی پر نہیں ہے اس سوا صبر وقرار
سب کے دل کو فکر ہے دن رات آٹے دال کا

شاعر نظیر نے دوسری نظم میں یہ بات کہی ہے کہ دنیا میں اگر بنی نوع انسان کے چہرے پُرنور ہے تو وہ سب آٹے دال یعنی اشیائے خوردنی کی سہولت کے سبب ہیں۔ عالم مادی میں بیشتر انسان اسی کے مزدور ہیں۔

اس آٹے دال ہی کا جو عالم میں ہے ظہور   اس سے ہی منہ پہ نور ہے اور پیٹ میں سرور
اس سے ہی آکے چڑھتا ہے چہرہ پہ سب نور   شاہ و گدا امیر اسی کے ہیں سب اسیر
سب چھوڑو بات طوطی و پدڑی و لال کی
یارو کچھ اپنی فکر کرو آٹے دال کی

نظیر نے آٹے کو نور اور دال کو پری وحور بتایا ہے۔ مزید یہ باور کرانے کی سعی کی ہے کہ جو اسے سمجھ گیا وہ صاحب شعور ہے۔ اردو شاعری میں یہ انوکھی مثال ہے شاعر کے الفاظ پر توجہ دیجیے۔

آٹا ہے جس کا نام وہی خاص نور ہے   اور دال بھی پری ہے کوئی یا کہ حور ہے
اس کا ہی کھیل کھیلنا سب کو ضرور ہے   سمجھے جو اس سخن کو وہ صاحب شعور ہے
سب چھوڑو بات طوطی و پدڑی و لال کی
یارو کچھ اپنی فکر کرو آٹے دال کی

'روٹی کی فلاسفی' نظم، مذکورہ بالا نظم کے بالمقابل معاش ومعیشت کے سلسلے میں بے حد مقبول اور زبان زد خاص وعام ہے۔ مخمس کی ہیئت میں 18 بندوں میں ہے۔ شاعر نے نظم میں یہ اظہار کیا ہے۔ کہ دنیا میں بیشتر انسان روٹیوں کے سبب ہی زندہ ہیں۔ اگر کسی انسان کو آسانی سے روٹیاں میسر ہیں تو وہ اس شخص کی خوش حالی کی نشانی ہیں۔ وہ آدمی بھی اسی خوش حالی کے سبب پھولا نہیں سماتا۔ وہ غرور میں بہت سے اچھے

بُرے کام انجام دیتا رہتا ہے۔ شاعر کے نزدیک انسان کو جتنے بھی مزے اور عیش و آرام میسر آتے ہیں وہ سب روٹیوں کی فراوانی سے ہی آتے ہیں۔ یہ کہاوت ہے کہ 'بھوکے پیٹ بھجن نہ ہوئے' انسان کی اچھل کود، بھاگ دوڑ اور جملہ حرکات وسکنات پیٹ بھرنے کے مرہون ہیں۔ یعنی سو طرح سے دھوم دھام روٹیوں کے سبب ہی ہوتی ہے۔ شاعر یہ بھی بتاتا ہے کہ ہانڈی، چولہا، توا اور تنور یہ سب خالق کائنات ہی کا ظہور ہیں۔ انسان کے لیے سب سے خاص نور چولہے کی جلتی ہوئی آنچ ہے۔ اسی کے طفیل سے روٹیاں اور چپاتیاں نظر آتی ہیں۔ شاعر کی نظر میں سب انسانوں کے دل روٹیوں کے نور سے ہی نور پور ہوتے ہیں۔

ان روٹیوں کے نور سے سب دل ہیں نور پور   آٹا نہیں ہے چھلنی سے چھن چھن گرے ہے نور
پیڑا ہر ایک اس کا ہے برفی و موتی چور   ہرگز کسی طرح نہ بجھے پیٹ کا تنور
اس آگ کو مگر یہ بجھاتی ہیں روٹیاں

یہ حقیقت ہے کہ دنیا میں انسانی حیات وزیست کی بقا اور حرکت وعمل کے لیے یہ روٹیاں ناگزیر ہیں۔ جس کی ضرورت انسان کو یہ کہنے پر مجبور کرتی ہے۔

پوچھا کسی نے یہ کسی کامل فقیر سے   یہ مہر و ماہ حق نے بنائے ہیں کاہے کے
وہ سن کے بولا بابا خدا تجھ کو خیر دے   ہم تو نہ چاند سمجھیں نہ سورج ہیں جانتے
بابا ہمیں تو یہ نظر آتی ہیں روٹیاں

جب انسان کا پیٹ روٹیوں سے بھر جاتا ہے۔ تو اس پر دنیاوی معاملات کے بہت سے بھید منکشف ہونے لگتے ہیں۔ یعنی روٹیوں کی آسودگی کشف وکمال کا موجب بن جاتی ہے۔

کرۂ ارض پر آدم زاد نے جتنے بھی پیشہ ورانہ کاروبار ایجاد کیے ہیں وہ سب پیٹ ہی کے وسیلے ممکن ہوئے ہیں۔ دنیا میں انسانوں کا عمومی مشاہدہ کرنے سے یہ انکشاف ہوتا ہے کہ لاکھوں آدمیوں میں صرف چند حضرات ہی محبت وعقیدت سے خالق حق کا نام پکارتے ہیں۔ ورنہ سب پیٹ ہی کے لیے سب کچھ کرتے ہیں۔

لاکھوں میں کوئی لے ہے محبت سے حق کا نام   ورنہ سب اپنے پیٹ کے ہیں کلمے اور کلام
نہ عاقبت کی فکر نہ راہِ خدا سے کام   سمجھے نہ کچھ حلال نہ جانا کہ کچھ حرام
جو جس سے ہو سکا سو کیا پیٹ کے لیے

'تندرستی کی فلاسفی' (بشمول حرمت) نظم مسدس کی ہیئت میں 14 بندوں میں ہے۔ انسانی حیات وزیست میں خالق ومالک کی عطا کردہ بہت سی نعمتوں میں تندرستی بہت بڑی نعمت ہے۔ اگر انسانی صحت ٹھیک نہیں، تو دیگر نعمتیں اس کے لیے بے سود اور بے معنی ہو کر رہ جاتی ہیں۔ اگر انسان کی صحت خوب ہے تو اسے دیگر نعمتوں کی کوئی خاص پرواہ بھی نہیں رہتی ہے۔ نظیر کے نزدیک تندرستی سب پر مقدم ہے۔ وہ اسی سبب تندرستی اور آبرو کی خاطر خالق کائنات سے دعا گو نظر آتے ہیں۔

پروا نہیں اگرچہ لکھا یا پڑھا نہ ہو   محتاج حق سوا یہ کسی اور کا نہ ہو
حسن و جمال وعلم و ہنر گو ملا نہ ہو   اک تندرستی چاہیے کچھ ہووے یا نہ ہو
جتنے سخن ہیں سب میں یہی ہے سخن درست
اللہ آبرو سے رکھے اور تندرست

درحقیقت انسان کو معاشرتی زندگی میں صحت وتندرستی کے ساتھ آبرو بڑی عزیز اور دل پذیر ہوتی ہے۔ اس حوالے سے نظیر کے شعر پر غور کیجیے۔

ادنیٰ ہو یا غریب تونگر ہو یا فقیر   یا بادشاہ شہر کا یا ملک کا وزیر
ہے سب کو تندرستی وحرمت ہی دل پذیر   جو تو نے اب کہا، سو یہی سچ ہے اے نظیر
جتنے سخن ہیں سب میں یہی ہے سخن درست
اللہ آبرو سے رکھے اور تندرست

'تندرستی اور آبرو' نظم میں 6 بند ہیں۔ خالق کائنات نے جس انسان کو بھی یہاں پر صحت وحرمت اور رتبے سے نوازا ہے۔ شاعر کی نظر میں اس انسان پر فضل الٰہی کا خاص پرتو ہے۔

صحت وحرمت سے گر اللہ یاں کردے نباہ   اس برابر کون سا ہے پھر جہاں میں عز و جاہ
اب جو ہم اس بات کے رتبے کو کرتے ہیں نگاہ   کیا کسی عاقل نے یہ نکتہ کہا ہے واہ واہ
تندرستی کو نپٹ فضل الٰہی بوجھیے
آبرو سے جگ میں رہنا بادشاہی بوجھیے

اللہ نے انسان کو جتنے بھی نعمتوں سے نوازا ہے ان سب میں صحت وحرمت کی دولت سب سے بڑھ کر ہے۔ انسان کی آبرو موتی کے آب سی ہوتی ہے۔ تمام عیش و آسائش تندرستی کے لطیف حیلے ہیں جو مادی اسباب سے حاصل ہوتے ہیں۔ مگر بوڑھا، جوان، عالم، فاضل، گدا، بادشاہ، میر، وزیر، تونگر، غنی، بے نوا اور فقیر سب کے سب صحت وحرمت کے نکتے کی تقدیم کے قائل ہیں۔

ہیں جہاں تک خلق میں پیر و جواں خرد و کبیر   عالم و فاضل گدا و بادشہ میر و وزیر
کیا تونگر کیا غنی کیا بے نوا اور کیا فقیر   سب جہاں میں ہیں اسی نکتے کے قائل اے نظیر
تندرستی کو نپٹ فضل الٰہی بوجھیے
آبرو سے جگ میں رہنا بادشاہی بوجھیے

ناچیز نے نظیر کی شاعری کو ایک دوسرے زاویۂ نظر سے دیکھنے کی طالب علمانہ کوشش کی ہے۔ اس کی شاعری کا محور ومقصد کچھ بھی ہو، لیکن یہ بسہولت کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے انسانی زندگی کے بنیادی امور پر بڑی توجہ صرف کی ہے۔ زندگی میں صحت وتندرستی کے ساتھ سب سے بڑی حقیقت معاش ومعیشت، روزی روٹی کے لیے پیسہ ہی کمانا ہے۔ یہ ہماری حیات وزیست کا مرکزی مسئلہ ہے۔ جس پر ہر دور کے دانشوروں اور فکر وشعور رکھنے والے تخلیق کاروں نے خاصی توجہ دی ہے۔ نظیر اکبرآبادی کا کلام بنی نوع انسان کے لیے ایک طرح کا جام جہاں نما ہے۔ جس میں متنوع موضوعات واسالیب کی فراوانی ہے۔ لیکن میں نے اپنے مطالعے کو عنوان تک ہی محدود رکھا ہے۔ جس کی حقیقت کا اوپر تذکرہ ہو چکا ہے۔ جہانِ فانی میں ہر فرد وبشر دولت وصحت کی نعمت حاصل کرنے کے لیے پریشان وسرگرداں ہے۔ نظیر نے عام موضوع کو فکری بصیرت سے ایک موضوع کو سو رنگ سے باندھ کر شعری تخلیق کو انتہا پر پہنچا دیا ہے۔ شاعر نے اس موضوع پر جن حکیمانہ بصیرتوں سے اظہار خیال کیا ہے۔ وہ دیگر اردو شعرا کے یہاں اس مرتبے پر نظر نہیں آتا۔ نظیر نہ کارل مارکس سے واقف اور نہ ہی خواجہ مزدور کی کشاکش سے آگاہ تھے۔ ان کی نظر میں نہ فرانس کا انقلاب تھا اور نہ ہی روسی انقلاب کی آمد کی بشارت تھی۔ حیرت ہوتی ہے کہ نظیر کو آفتاب تازہ کے طلوع سے پہلے ہی بنی نوع انسان کی روزی روٹی کے لیے اس قدر فکر دامن گیر تھی۔ ان کی دولت وصحت سے متعلق نظمیں فلسفیانہ نقطۂ نظر کی عکاس ہیں۔ یہ بڑے حکیمانہ اور منطقانہ انداز میں پیش کی گئی ہیں، جن میں تفکر، تنوع اور موضوعات کا فلسفیانہ بیان ہے۔ نظم کا بیانیہ عوامی اور کوچہ وبازار کا غماز ہے۔ نظیر نہ فلسفی اور نہ ہی مشرق ومغرب کے اصول فلسفہ سے گہری واقفیت رکھتے تھے۔ ہاں وہ ایک باشعور بالغ نظر عوامی احتیاجات اور ترجیحات پر نظر رکھنے والے فن کار تھے۔ انھوں نے اقتصادی ابتری اور اسباب کے مختلف روپ کو منظوم کرکے ہماری شعریات میں ایک نئی طرز فکر کو فروغ دیا ہے جس پر اہل دانش کی توجہ درکار ہے۔

■

Dr. Sarfaraz
Satyawati College
Dept of Urdu (Guest Faculty)
New Delhi -

اردو افسانے میں تقسیمِ ہند کے مسائل اور کرب

ساجد علی قادری

برصغیر ہمیشہ سے دنیا کی نگاہ میں پرکشش اور پراسرار رہا ہے۔ اس کشش نے کئی قوموں اور نسلوں کو یہاں بسنے پر نہ صرف مجبور کیا بلکہ انھوں نے اسے وطن ثانی بنالیا لیکن سترھویں صدی میں ایک ایسی قوم نے سرزمین ہند پر قدم رکھا۔ جو تجارتی حدود کو پار کر کے دیکھتے ہی دیکھتے یہاں کے سیاہ وسفید کی مالک بن گئی۔ اور 1857 کے ناکام انقلاب کے بعد پوری طرح سے اپنے مقصد میں کامیاب ہوگئی اور اس طرح برطانوی حکومت کا دور شروع ہوگیا۔ 1857 کے خونی انقلاب کے بعد ہندوستان کی سیاسی، سماجی، معاشی، تہذیبی، اور اخلاقی و مذہبی زندگی دگر گوں ہوگئی۔ دوسرے لفظوں میں کہا جائے کہ بساط ہند پر اماوس کی کالی رات کی تاریکی چھاگئی۔ جسے ہر ہندوستانی اپنا لہو دے کر آزاد کرانا چاہتا تھا۔ یعنی ملک کو انگریزوں کی غلامی کی زنجیر سے آزاد کرانے کے لیے ہندو مسلم نے یکجا ہوکر اپنے سر پر کفن باندھ لیا۔ اہل ہند کی حب الوطنی اور اتحاد و اتفاق نے برٹش حکومت کی نیند حرام کر رکھی تھی۔ یہی سبب ہے کہ انگریزوں نے ایک نہایت گھٹیا پالیسی۔ 'پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو' اپنائی جس کا مکروہ چہرہ 1947 میں نظر آیا اور وہ مکروہ چہرہ ہندوستان کی تقسیم اور اس کے بعد رونما ہونے والے فسادات تھے۔ ایک چہرے کا نام تھا ہندوستان اور دوسرے کا پاکستان۔ برصغیر کے اس خط فاصل نے جغرافیائی سطح پر کوئی لائن نہیں کھینچا تھا بلکہ انسانی رشتے، ناطے، محبتیں اور یادیں، اخلاقیات، تہذیب و ثقافت، جذبات، انسانیت گویا سب کچھ کا بٹوارہ کردیا۔ اس خطِ تنسیخ کے اثرات نے دونوں ملکوں کی سیاسی، سماجی، واقتصادی زندگی کو تباہ و برباد کردیا۔ آزادی کے نام پر ہونے والی تقسیم کی تاریخ بے حد دل سوز واقعات وحادثات سے پر ہے۔ انسان کے ہاتھوں انسان کے قتل نے ہماری برسوں کی مشترکہ تہذیب پر سوالیہ نشان لگا دیا اور انسانیت سر جھکائے سسکتی رہ گئی۔ سینہ ہند پر ایک ایسی آگ جل رہی تھی جو ہر چیز کو خاکستر کردینے پر آمادہ تھی۔ جان، مال عفت و ناموس اور اقدار غرض سب کچھ اس کی زد میں تھا۔ تقسیم کے بعد ہجرت کے دوران بچے، بوڑھے، جوان، مرد، عورتوں کا بے دریغ قتل عام روز کا معمول بن گیا تھا۔ سرسبز وشاداب کھیت کھلیان اجڑ کر شہر خموشاں میں تبدیل ہوگئے۔

تقسیم ہند کے بعد فسادات کے سیلاب نے اپنی تمام تر تباہیوں اور بربادیوں کے ساتھ اخلاق و اقدار اور باہمی اخوت کا ایسا جنازہ نکالا کہ دہائیوں تک کے لیے پنجاب کی گلیاں ہیر اور رانجھا کے عشقیہ گیت سے محروم ہوگئیں۔ وحشیانہ قتل عام کے اتنے دلدوز مناظر سامنے آئے کہ آج بھی ان کے خیال سے لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔ اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ کیا برصغیر میں قتل و غارت گری یا جنگ و جدل کے واقعات اس سے قبل وقوع پذیر نہیں ہوئے تھے؟ دراصل بات یہ ہے کہ اس سے قبل خانہ جنگی نے زندگی کو اس وسیع پیمانے پر نیست و نابود نہیں کیا تھا، دیکھا جائے تو دوسری عالمی جنگ میں ایٹم بم کا استعمال

ایک مخصوص خطے میں کیا گیا تھا۔ بیشک ایٹم بم نے لاکھوں انسانوں کی زندگی کو صفحۂ ہستی سے مٹادیا۔ لیکن 47 کے بعد ہجرت کے نام پر قسطوں میں انسانی زندگی کو تباہ کیا گیا۔ ایسے پر آشوب ماحول میں اردو کے ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں نے، ظلم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ جن افسانہ نگاروں نے فسادات اور ہجرت کے مسائل اور اس کے کرب کو اپنے فن کے کینوس پر بکھیرا ان میں کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، مہندر ناتھ، بلونت سنگھ، احمد ندیم قاسمی، خواجہ احمد عباس، عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی، قرۃ العین حیدر، حیات اللہ انصاری، انتظار حسین وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان افسانہ نگاروں نے فسادات کے مختلف مسائل بالخصوص قتل و غارت گری، عورتوں کی بے حرمتی، بے گناہ

انتقام کی آگ نے صرف تباہی وبربادی کو جنم دیا. اشفاق احمد کا افسانہ 'گڈریا' میں فرقہ وارانہ جھگڑے کے واقعات کی سچی تصویر کشی کی گئی ہے. نفرت کی آگ نیک انسان کو شیطان بنادیتی ہے اور دوست کو دشمن. خواجہ احمد عباس نے اپنے افسانے ''اجنتا'' میں اس پہلو کو بطور خاص اجاگر کیا ہے کہ انسانی عقل کس قدر نا قص ہے. مذہب کے نام پر تعصب کا ایک ایسا کھیل کھیلا کہ انسانیت ایک بے معنی سی چیز بن گئی.

و معصوم افراد کا قتل، لاپتا افراد، نفسیاتی کشمکش، وغیرہ کو اپنے افسانے کا موضوع بنایا۔ کرشن چندر کا افسانہ 'پشاور ایکسپریس' تقسیم ہند کے بعد نقل مکانی کے حالات کے درد و کرب کا مرقع ہے۔ وہ محض ایک ایکسپریس ٹرین نہیں تھی جو لاہور سے چلی تھی ہندوستان کے لیے، اور ہندوستان سے پاکستان جانے کے لیے۔ دراصل یہ ٹرین لاشیں ڈھونے والی ایک ارتھی تھی۔ ہزاروں بے گناہ انسانوں کی لاشیں جیسے پشاور ایکسپریس اپنے کندھے میں لاد کر چل رہی تھی۔ آزادی کے نام پر ملنے والی تقسیم نے انسانی زندگی اور انسانیت دونوں کو تہس نہس کر دیا تھا۔ فرقہ وارانہ فسادات نے جن جن علاقوں کو سب سے زیادہ نقصان پہنچایا ان میں خصوصاً پنجاب، دلی، لاہور، بنگال، حیدر آباد ہیں۔ ان ریاستوں میں قتل و غارت، جنگ و جدال اور درندگی کی تمام حدیں پار کر دی تھیں۔ بقول فرمان فتح پوری:

''آزادی کا دیا پوری طرح روشن بھی نہ ہونے پایا تھا کہ فسادات کے نام سے برق و باد نے گھیر لیا۔ گاؤں کے گاؤں اور شہر کے شہر قتل و غارت کی آندھیوں میں تنکے کی طرح اُڑ گئے۔ بادلوں سے پانی کے بجائے خون برسنے لگا۔ گلی کوچے اور بستیاں ڈوب گئیں۔ آدمی کے روپ میں درندے نکل پڑے۔ برسوں کی یاری اور ہمسائیگی کچھ کام نہ آئی۔ سارے رشتے آن کی آن میں منقطع ہو گئے۔'' (اردو افسانہ اور افسانہ نگار، ص 91)

کرشن چندر نے اپنے افسانے 'امرت سر آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد' میں اپنے غم و غصے کا اظہار کیا ہے۔ اور انسانی زندگی کے اس کرب کو واضح کیا ہے جہاں انسانی زندگی کی کوئی قدر و قیمت نہیں تھی۔ انسان کا خون بہانا جیسے Fundamental Rights ہو۔ ہر کوئی حیوانیت کا سردار بن گیا تھا۔ بچوں بوڑھوں، جوان اور عورتوں کا بے دریغ قتل کیا جا رہا تھا۔ افسانہ 'لالہ باغ' میں انسانی زندگی کی قیمت طے کی گئی۔ ایک انسان کو مارنے کی قیمت پچاس روپے، چاہے وہ ہندو ہو یا مسلم یا سکھ۔ جبکہ ایک گلاس پانی کی قیمت ایک سو روپیہ تھی۔ بقول کرشن چندر:

''پانی ہندوستان میں بھی تھا اور پانی پاکستان میں بھی تھا۔ لیکن پانی کہیں نہیں تھا، کیونکہ آنکھوں کا پانی مر گیا تھا اور یہ دونوں ملک نفرت کے صحرا بن گئے تھے... جس دیس میں لسی اور دودھ پانی کی طرح بہتے تھے وہاں آج پانی نہیں تھا۔ اس کے بیٹے پیاس سے بلک بلک کر مر رہے تھے۔'' (ہم وحشی ہیں، ص 95)

انتقام کی آگ نے صرف تباہی و بربادی کو جنم دیا۔ اشفاق احمد کا افسانہ 'گڈریا' میں فرقہ وارانہ جھگڑے کے واقعات کی سچی تصویر کشی کی گئی ہے۔ نفرت کی آگ نیک انسان کو شیطان بنا دیتی ہے اور دوست کو دشمن۔ خواجہ احمد عباس نے اپنے افسانے ''اجنتا'' میں اس پہلو کو بطور خاص اجاگر کیا ہے کہ انسانی عقل کس قدر ناقص ہے۔ مذہب کے نام پر تعصب کا ایک ایسا کھیل کھیلا کہ انسانیت ایک بے معنی سی چیز بن گئی۔ اس افسانے کا ہیرو نرمل ایک صحافی ہے۔ جو فسادات کی بربریت اور حیوانیت کے زد میں آئے افراد کی مدد کے لیے امن کمیٹی کی تشکیل میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا ہے۔ لیکن اس کو اس بات کا شدید صدمہ ہوتا ہے کہ امن کے پرچار کرنے والوں میں درندے بھی موجود ہیں تو وہ مایوسی اور ذہنی تناؤ کا شکار ہو جاتا ہے۔ خواجہ احمد عباس نے 'اجنتا' میں نرمل کی ذہنی کیفیت کی تصویر کشی یوں کی ہے:

''اس دبلے پتلے نو جوان کی صورت اب بھی میری آنکھوں کے سامنے پھرتی ہے۔ بھارتی! اس کی آخری چیخ اب بھی میرے کانوں میں گونج رہی ہے اور اس نے میری نیند اڑا دی ہے۔ رات کو سوتا بھی ہوں تو خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں ایک خون کے سمندر میں ڈوب رہا ہوں اور کوئی میری مدد کو نہیں آتا۔''

(اجنتا مجموعہ زعفران کے پھول ص نمبر 37)

عزیز احمد کا افسانہ 'کالی رات' میں بربریت اور حیوانیت اپنے بام عروج پر نظر آتی ہے، اس رات کی تاریکی میں انسانیت آخری دم تک درندگی سے مقابلہ کرتی ہے۔ بلوائی ریل کے ڈبے کو توڑ کر نئی نویلی دلہن کو اس کے شوہر کے سامنے قتل کر دیتے ہیں۔ حیات اللہ انصاری کے افسانے 'شکر گزار آنکھیں' میں بھی بربریت کے سامنے عزت بچانے کی خاطر جان دینے کا دل سوز واقعہ ہے۔ قرۃ العین حیدر نے اپنے افسانے 'جلاوطن' میں لکھنؤ کی مشترکہ تہذیب کے بکھرنے کے درد و کرب کو کہانی کا روپ بخشا ہے۔ بٹوارہ صرف ایک زمین کا نہیں ہوا تھا بلکہ ایک تہذیب کا تھا، جس کا ماتم ہر ہندوستانی نے کیا تھا۔ تقسیم ہند کے بعد سب سے بڑا المیہ یہ ہوا کہ ہر انسان کو اپنی قوم پرستی کا ثبوت دینا پڑ رہا تھا۔ افسانہ جلاوطن کا یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''پولیس ہر لمحے ان کو تنگ کرتی۔ آپ کے بیٹے کا پاکستان سے آپ کے پاس کب خط آیا تھا۔ آپ نے کراچی میں کتنی جائیداد خرید لی ہے۔ آپ خود کب جا رہے ہیں۔...... اور یہ جو بابا کی ساری قوم پرستی تھی سارا جون پور عمر بھر سے واقف ہے کہ بابا کتنے بڑے نیشنلسٹ تھے۔ تب بھی پولیس پیچھا نہیں چھوڑتی۔''

(افسانہ جلاوطن، ص 129,30)

فسادات کی آگ نے انسانی زندگی کو تہس نہس کر دیا تھا۔ اس آگ کے شعلے نے انسان کی نفسیات کو چکنا چور کیا۔ افسانہ 'ٹوبہ ٹیک سنگھ' میں بشن سنگھ کی دماغی کیفیت کی منٹو نے جو تصویر کشی کی ہے بے حد دردناک ہے۔ تقسیم ہند کے دو سال کے بعد دونوں ملکوں کے سیاسی لیڈروں کو مذہبی نقطہ نگاہ کی بنا پر یہ فیصلہ لینا پڑتا ہے کہ جو ہندو پاگل ہیں وہ ہندوستان میں بھیج دیے جائیں اور مسلمان پاگل پاکستان میں رہیں گے۔ شاید حکومت کا یہ فیصلہ دونوں ملکوں کے مذہبی لیڈروں کو اپنا قد اونچا کرنے کا سنہرا موقع مل گیا تھا۔ منٹو کے نزدیک یہ فیصلہ مذہب کے نام پر نہیں کیا گیا بلکہ انسان کو اپنی زمین اور اپنی شناخت سے جدا کرنے کی ایک گھناونی سازش تھی

جو 47 کے بعد کامیاب ہوئی۔

اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ تقسیم ہند کے بعد فسادات کی آگ نے معاشرے کے ہر فرد کو نقصان پہنچایا۔ جانی و مالی نقصانات سے لے کر روحانی تک، لیکن تقسیم ہند کے بعد ہجرت کے نام پر فسادات کی سب سے بھاری قیمت خواتین نے اپنی جان وآبرو کی قربانی دے کر ادا کی۔ ان قیامت خیز حالات میں مردوں نے اپنی جنسی تسکین کے لیے عورتوں کی آبرو کو تار تار کیا اور جنسی تشدد کا نشانہ بنایا۔ انھیں اغوا کیا گیا اور قحبہ خانوں کی زینت بننے پر مجبور کیا گیا۔ یہاں تک کہ سر بازار عورتوں کی بولی بھی لگائی گئی۔ تقسیم ہند کے بعد سب سے بڑا کرب عورتوں کی حرمت کا المیہ ہے۔ خواتین نے مردوں کی زیادتی اور استحصال کے ساتھ ساتھ درندگی اور حیوانیت کے بے شمار ستم برداشت کیے اس موضوع پر منٹو کے افسانے کھول دو، ٹھنڈا گوشت، شریفن قابل ذکر ہیں۔ افسانہ شریفن میں بملا اور شریفن کی عصمت کی بے حرمتی کی جامع تصویر ملتی ہے۔ افسانہ کھول دو میں ایک ایسی لڑکی سکینہ کی کہانی ہے جو مشرقی پنجاب میں سکھ مردوں کی درندگی کا نشانہ بنتی ہے تو پاکستان میں رضا کار بھائیوں کی دل بستگی کرتی ہے۔ رضا کاروں کے کردار میں منٹو نے اس شیطانی چہرے کو ظاہر کیا ہے جو فرشتہ صفت بن کر عورتوں کی عصمت کو داغدار کرتے ہیں۔ اسی طرح 'ٹھنڈا گوشت' میں ایشر سنگھ کی حیوانیت بامِ عروج پر نظر آتی ہے۔ فساد کے دوران ایک گھر کے تمام افراد کو قتل کر دیا جاتا ہے ایک درندہ صفت ایک لڑکی کو اُٹھا کر لے جاتا ہے مگر جب اپنی حیوانی خواہش پوری کرنے کی کوشش کرتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ لڑکی پہلے ہی مر چکی ہے۔ اس طرح کے کردار کے ذریعے افسانہ نگاروں نے عورتوں کی بے بسی اور لاچاری کے کرب کو واضح کیا ہے۔

مہندر ناتھ کا افسانہ 'پاکستان سے ہندوستان تک' میں ایک بازیافتہ عورت کو اپنے گھر والوں کی نفرت اور حقارت کا نشانہ بنتے دکھایا گیا ہے۔ افسانے کی ہیروئن پشپا اور صفدر ایک ہی گاؤں میں رہتے ہیں اور ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔ لیکن گھر والوں کی خوشی کی خاطر پشپا سوہن لال سے شادی کر لیتی ہے۔ کچھ عرصے بعد فرقہ وارانہ فساد شروع ہو جاتا ہے۔ سوہن لال اپنی بیوی کو چھوڑ کر اپنی ماں اور اپنے بچوں کو لے کر دلی چلا آتا ہے۔ پشپا کو تنہا دیکھ کر حملہ آور اس کے گھر پر حملہ کرتے ہیں۔

''پھر پشپا کی باری آئی۔ لوٹنے والوں نے اسے بھی مال غنیمت سمجھا...... عورت کی حیثیت ہمارے معاشرے میں ایک تہائی کی سی ہے...... یوں تو ہمارے گرنتھ صاحب میں، وید میں قرآن مجید میں عورت کو بہت اونچا مقام دیا گیا ہے لیکن موقع ملنے پر ہم لوگ سب کچھ بھول جاتے ہیں...... مسلمان نوجوانوں نے پشپا کو ایک کوٹھری میں بند کر دیا اور اس کی تنہائی اور بے بسی کا فائدہ اُٹھایا۔'' (افسانہ پاکستان سے ہندوستان تک، ص 184)

''قدرت اللہ شہاب کا افسانہ 'یا خدا' میں عورت کی ٹریجڈی بڑی درد ناک نظر آتی ہے۔ دلشاد پاکستان کی سر زمین کو مقدس سمجھ کر آتی ہے جہاں اس کے زخموں پر مرہم رکھنے والے بھائی ہوں گے مگر بھائی کے روپ میں درندے ملتے ہیں۔''

راجندر سنگھ بیدی کا افسانہ 'لاجونتی' ایک بد قسمت عورت کی کہانی ہے۔ جسے فساد میں اغوا کر لیا جاتا ہے۔ اور وہ اپنے شوہر سندر لال سے بچھڑ جاتی ہے۔ کچھ دنوں کے بعد لاجونتی کی ملاقات سندر لال سے ہوتی ہے، لیکن اس ملاقات میں لاجو ایک پتنی کے روپ میں اپنے پتی سے نہیں ملتی بلکہ ایک ناپاک جسم کے طور پر، یہاں پر بیدی نے سندر لال اور لاجو کے اس ذہنی کرب اور نفسیاتی کشمکش کو اجاگر کیا ہے جو عورتیں بازیاب ہو کر اپنے گھروں میں واپس آتیں ہیں۔ ان کے اپنے انہیں اپنانے سے انکار کر دیتے ہیں۔ جبکہ ان خواتین کی بے گناہی کے چشم دید گواہ ان کے بھائی، رشتے دار خود ہیں۔ دراصل تقسیم ہند کے بعد قیامت خیز حالات نے خواتین کی زندگی کو جہنم زار بنا دیا تھا۔ ایک مصیبت سے نکلتی تو فوراً دوسرے مصائب کا شکار ہو جاتی تھی۔

قدرت اللہ شہاب کا افسانہ 'یا خدا' میں عورت کی ٹریجڈی بڑی درد ناک نظر آتی ہے۔ دلشاد پاکستان کی سر زمین کو مقدس سمجھ کر آتی ہے جہاں اس کے زخموں پر مرہم رکھنے والے بھائی ہوں گے مگر بھائی کے روپ میں درندے ملتے ہیں۔ اس طرح ممتاز مفتی کا افسانہ 'گوبر کے ڈھیر پر' اور سید انور کا 'ظلمت' اور شکیلہ اختر کا 'آخری سہارا' میں عورتوں کی ٹریجیڈی کی منہ بولتی تصویریں ہے۔ عورت اپنے ہی وطن میں اپنے ہی رشتے داروں کے ہاتھوں ظلم وستم سہنے والی کٹھ پتلی بن جاتی ہے افسانہ نگاروں نے اپنی کہانیوں میں عورتوں کے اپنے ہی وطن میں ان کے خوابوں کو ٹوٹتے اور بکھرتے دکھایا ہے۔ دوسرے لفظوں میں کہا جائے کہ تقسیم ہند کا سب سے بڑا درد اور کرب کسی نے اگر جھیلا ہے تو وہ خواتین ہیں۔ عورتوں کا سب سے بڑا المیہ یہ تھا کہ معاشرے میں مقام اور عزت کا مسئلہ تھا۔ کہ اس کی حیثیت کیا تھی؟ وہ ایک ناپاک جسم تھا یا دل شکستہ آئینہ تھا۔'' جسے سماج سنبھال کر رکھنا نہیں چاہتا تھا۔ جس خاموشی اور جواں مردی کے ساتھ عورتوں نے تقسیم ہند کے کرب کو سہا ہے شاید ہی اس آگ میں کوئی اور جھلسا ہو۔

رام لعل نے اپنے افسانے 'نئی دھرتی پرانے گیت' میں ان افراد کی سماجی اقتصادی زندگی کے درد و کرب کو واضح کیا ہے جو اپنے وطن کو چھوڑ کر دوسرے ملک میں جا بستے ہیں اور مہاجر کے نام سے پکارے جاتے ہیں۔ اس افسانے میں رام لعل نے نئی بستیوں میں بسنے والوں کی شناخت کے کرب کو پیش کیا ہے۔ سیاست کے مفاد پرست اماموں نے برصغیر کو دو حصوں میں تقسیم کر کے صرف غیر دانشورانہ عمل کا ثبوت ہی نہیں پیش کیا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ کتاب زیست میں بربریت اور درندگی کا ایک ایسا باب بھی رقم کیا۔ جس کی قیمت آج تک ہم اپنے لہو سے ادا کر رہے ہیں۔

الغرض تقسیم ہند کے عنوان پر لکھے جانے والے افسانے فنی اعتبار سے اپنے فن کی معراج سے تعبیر کیے جا سکتے ہیں اور یہی افسانے موضوعاتی اعتبار سے اپنے دور کی وہ تصویریں پیش کرتے ہیں جہاں انسان اور انسانیت کی قبائیں تار تار ہو جاتی ہیں وہ خوبصورت ملک ہندستان جنت نشان جہاں ہر ہندستانی نے اپنے ملک عزیز کی آزادی کے لیے انقلاب اور ولولہ انگیز جذبوں کے درمیان اپنے جانوں کی قربانی پیش کر کے ملک کی نئی صبح کی امید کی تھی وہ صبح تو آئی ضرور لیکن اس قیامت کے ساتھ آئی کہ آسمان امید پر شفق کی لالی کی جگہ انسانی جذبوں اور جسموں کا خون چڑھا ہوا تھا۔ ایسے دور کے میں لکھے گئے افسانے آج بھی ان خون آشام دن اور رات کی قیامت خیز کہانیاں اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہیں۔

لہو میں ڈوب کے پہنچے ہیں جو کنارے تک
وہ جانتے ہیں کہ یہ راہ کس قدر تھی کٹھن

■

Dr. Sajid Ali Qadri
Ho.D, Urdu & Research Guide (KBC NMU)
S.P.D.M. College
Shirpur, Dist: Dhulia - 425405 (MS)
Mob.:9423288786

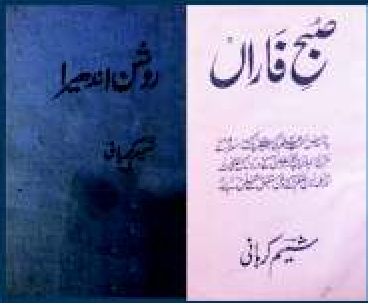

اعظم عباس شکیل

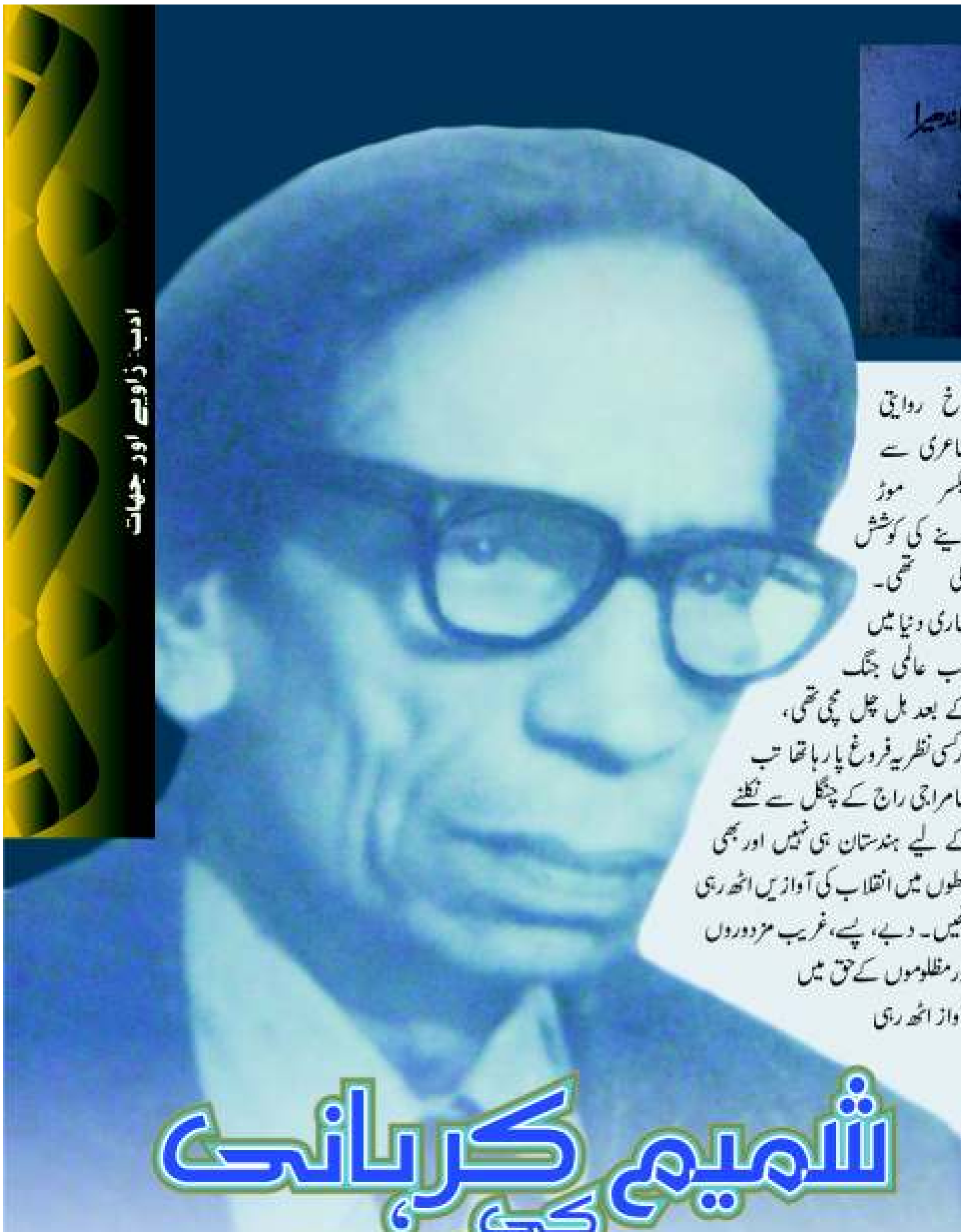

شمیم کرہانی کی انقلابی شاعری

بیسویں صدی کے اوائل میں ایسے شعرا کی لمبی فہرست ہے جو آزادی ملنے سے پہلے اپنے قلم سے وار کرتے رہے اور آزادی کے بعد بھی عوام میں حب الوطنی کے جذبے سے سرشار گیتوں، نغموں اور نظموں سے مجاہدین وطن کو حوصلہ اور ہمت دیتے رہے ہیں۔ آزادی ملنے سے پہلے یہ اہل قلم اپنے نوک قلم کو ہتھیار بنا کر غیر ملکی حکومت پر کاری وار کرتے رہے ہیں اور ساتھ ہی مظلوم عوام کے دلوں میں جوش، جذبہ اور ہمت پیدا کر رہے تھے اور عمل کی ترغیب دے رہے تھے۔ انھیں شعرا میں ایک ممتاز نام تھا شمیم کرہانی۔

سید شمس الدین حیدر عرف شمیم کرہانی کی پیدائش 1913 میں ہوئی تھی جب یہ ملک غلام تھا۔ ان کے شباب کے دن آئے تو جنگ آزادی بھی اپنے شباب پر تھی۔ انقلاب نے اپنے قدم گاڑ دیے تھے۔ زمانہ انگڑائی لے رہا تھا۔ فنکار اور بالخصوص شاعر کا دل عموماً بہت حساس ہوتا ہے۔ اپنے اردگرد کے ماحول سے متاثر ہونا فطری ہے۔ آٹھ سال کی عمر میں غزل کے ایک شعر سے شاعری شروع کرنے والے شمیم کرہانی بھی جلد ہی انقلاب کے بل کھاتے ہوئے سمندر میں کود پڑے۔ علی جواد زیدی، حسرت موہانی جیسے فنکار تو عملی طور پر میدان کارزار میں سینہ سپر تھے جنھوں نے نوجوانوں کی رہبری کی اور جیل کی صعوبتیں بھی جھیلی ہیں۔ تو پھر شمیم کرہانی جیسا حساس شاعر بھلا کیسے چپ رہ سکتا تھا۔

'برق و باراں' شمیم کرہانی کا شائع ہونے والا پہلا شعری انتخاب تھا۔ اسے انجمن ترقی پسند مصنّفین نے خود 1939 میں انڈین بک ڈپو، لکھنؤ کے زیر انتظام سرفراز قومی پریس، لکھنؤ سے چھپوایا تھا۔ اس کے بعد اگست 1942 میں ہندوستان میں بڑے پیمانے پر آزادی کے حصول کے لیے جو حالات نے ایک نیا موڑ لیا اس سے متاثر ہو کر شمیم کرہانی نے جو نغمے لکھے انھیں 1946 میں 'روشن اندھیرا' کے نام سے سرفراز پریس، لکھنؤ سے چھپوایا۔ اس کتاب میں جناب علی جواد زیدی کا بیش قیمت مقدمہ بھی ہے جس سے اس وقت کے حالات کے ساتھ شمیم کرہانی کی انقلابی شاعری پر بھی ان کا خاطر خواہ تبصرہ موجود ہے۔

انجمن ترقی پسند مصنّفین کی بنیاد سجاد ظہیر، ملک راج آنند وغیرہ نے 1935 میں رکھی تھی جس نے اردو ادب کا رُخ روایتی شاعری سے یکسر موڑ دینے کی کوشش کی تھی۔ ساری دنیا میں جب عالمی جنگ کے بعد ہل چل مچی تھی، مارکسی نظریہ فروغ پا رہا تھا تب سامراجی راج کے چنگل سے نکلنے کے لیے ہندستان ہی نہیں اور بھی خطوں میں انقلاب کی آوازیں اٹھ رہی تھیں۔ دبے، پسے، غریب مزدوروں اور مظلوموں کے حق میں آواز اٹھ رہی تھی۔ ایسے حالات میں انجمن ترقی پسند مصنّفین نے طے کیا کہ ادبی تخلیقات کا رُخ بدلنا چاہیے۔ چنانچہ ادیبوں اور افسانہ نگاروں نے پسماندہ لوگوں کی مشکلوں اور مصیبتوں کو محور بنا کر ادب تخلیق کرنا شروع کیا۔ شمیم کرہانی نے پوری طرح اس سے متاثر ہو کر نظمیں اور گیت تخلیق کرنے شروع کیے۔ ایسی ہی تخلیقات کے انتخاب کا نام 'برق و باراں' ہے۔ یہ کتاب فہرست کے بعد سب سے پہلے جس صفحے سے شروع ہوتی ہے اس پر صرف ایک مصرع لکھا ہے۔

مرا ہندوستاں بے چین ہے آزاد ہونے کو
(شمیم)

شاعر کے دل میں آزادی حاصل کرنے کی خلش جاگ چکی تھی۔ یہ آزادی سادہ لفظوں میں صرف جغرافیائی قید سے آزاد ہونے کی لیے نہیں تھی۔ یہ سماج میں پھیلی ہوئی غربت، جہالت، اونچ نیچ اور بے شمار برائیوں سے چھٹکارا پانے کی جنگ تھی۔ جہاں ایک طرف اپنے ملک کو انگریزی حکومت سے آزاد کرانا مقصود تھا تو وہیں دبے کچلے انسانوں کو جگانے کا کام بھی تھا۔

شمیم کرہانی مشرقی اتر پردیش کے ایک بڑے زمیندار خاندان میں پیدا ہوئے تھے۔ انھوں نے جب آنکھ کھولی تو ابھی زمینداری کی تمام آن بان شان باقی تھی۔ نوکر چاکر اور حاکم اور رعایا کا تصور ابھی باقی تھا۔ حالانکہ ان کا خاندان تہذیب وتمدن اور ادبی ذوق وشوق کا حامل تھا۔ رعایا پر ظلم تو درکنار ان کا خاندان سخاوت کے لیے مشہور تھا۔ لیکن دور ایسا تھا جب عام طور پر رعایا پر حاکم کی غلامی فرض مانی جاتی تھی۔ ظلم اور زیادتی کی کہانیاں بھی عام تھیں۔ اس کے علاوہ سماج میں غیر ضروری رسم ورواج

اور قدامت پسندی نے عوام اور خصوصاً گاؤں اور دیہات میں غربت اور جہالت کا ماحول پیدا کیا ہوا تھا۔ انجمن ترقی پسند مصنفین اسی ظلم و زیادتی کے خلاف مارکسی نظریے کے ساتھ قائم کی گئی تھی تا کہ اہل قلم حضرات اپنی تحریر سے سماج میں خوش آئند انقلاب لا سکیں۔ چنانچہ منشی پریم چند اور علی عباس حسینی جیسے ادیبوں نے اپنی کہانیاں، ناولیں اور افسانے گاؤں کے پس منظر میں لکھنے شروع کیے اور سماجی برائیوں کو اجاگر کیا۔ شاعروں نے بڑے زور و شور سے گیت، نظم وغیرہ لکھنا شروع کیا جو عوام میں مقبول ہونے لگے۔ جہاں جوش ملیح آبادی جیسے شاعر نے اپنے قلم سے الفاظ کے شعلے اگلنے شروع کیے وہیں شمیم جیسے شاعروں نے اپنے گیتوں سے سینوں میں دبی آگ کو بھڑکانا شروع کیا۔

'برق و باراں' شمیم کا ایسا شعری انتخاب ہے جس میں شامل کچھ تو نظمیں اور گیت مزدورں، کاریگروں اور سماج کے پچھڑے ہوئے لوگوں کو موضوع بنا کر کہی گئیں ہیں یا پھر جوانوں اور جیالوں کو للکارا گیا ہے کہ وہ انھیں اور غاصبوں کے چنگل سے اپنے ملک کی مٹی کو آزاد کرائیں۔ اس کتاب کو آٹھ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور ہر ایک حصہ شروع ہونے سے پہلے ایک ورق پر صرف ایک مصرع شاید بطور عنوان لکھا ہے۔ پہلا حصہ جس میں گیارہ نظمیں ہیں اس کی پہلی ہی نظم 'میں آ گیا میدان میں' ملک کے سوئے ہوئے جوانوں کو جگاتے ہوئے ایک عظیم انقلاب کے لیے میدان عمل میں آنے کی دعوت دیتی ہے۔ شاعر خود بے توجہی اور بے خبری کی چادر ہٹاتے ہوئے آگے آتا ہے اور اپنے ہم وطنوں کو ان کے حال سے مطلع کرتے ہوئے مستقبل کی راہ دکھاتا ہے۔ اس نظم میں 9 بند ہیں جس میں تمام عالم میں پھیلے ہوئے انتشار کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ نظم کا خالق شیطان کے بہکاوے میں نہ آتے ہوئے اپنے سماج کی برائیوں کو دور کرنے کے لیے آخر میدانِ عمل میں کود پڑتا ہے۔ اسے بہر حال اپنے وطن میں ایک امید کی کرن نظر آتی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں اس نظم کا پہلا اور آخری بند۔

ماں کی چھاتی کوستا تھا ماتا کا اضطراب
نیند میں تکتے رہے بچوں کے عارض کے گلاب
منتظر تھا سیج پر پھولوں کی، بیوی کا شباب
شوق کا آغوش پھیلائے ہوئے انداز خواب
سب کو ٹھکرا کر مگر میں آ گیا میدان میں

سارا عالم ایک طوفانی نظارے کی طرح
ہر قدم پر مشکلیں پُر زور دھارے کی طرح
ہمسفر مایوس، افسردہ، شرارے کی طرح
اک کرن مشرق میں تنکے کے سہارے کی طرح
اُس کرن کو دیکھ کر میں آ گیا میدان میں

اس کے علاوہ اس حصہ میں دس نظمیں اور ہیں۔ اس میں قومی گیت، جوان جذبے، آغاز بیداری، انقلاب، آماجگاہ بغاوت وغیرہ وہ نظمیں ہیں جو جوان دلوں میں حرارت پیدا کرنے والی ہیں، اکسانے والی ہیں اور سرمایہ داری اور انگریز حکومت کے سامنے سینہ سپر ہو کر کھڑے ہونے کی ترغیب دینے والی ہیں۔ دیکھیے 'جوان جذبے' میں کیسے جوش دلاتے ہیں۔

یہ ظلم شہنشاہی، جس وقت مٹا دیں گے
سوئی ہوئی دنیا کی قسمت کو جگا دیں گے
افلاس کے سینے سے شعلے جو لپکتے ہیں
محلوں میں امیروں کے وہ آگ لگا دیں گے
ہیں آج بغاوت پر تیار جواں جذبے
جلاد حکومت کی بنیاد ہلا دیں گے

ان اشعار میں مجھے وہی تیور نظر آ رہے ہیں جو علامہ اقبال کے مشہور اشعار میں ہیں۔

اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ امرا کے در و دیوار ہلا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی
اس کھیت کے ہر خوشہ گندم کو جلا دو

اسی باب میں ایک نظم ہے 'فرشتے کی سیر'۔ اس کو پڑھیے تو لگتا ہے جیسے یہ ایک منظوم ڈرامہ ہے جس میں 9 سین ہیں۔ نظم شروع ہوتی ہے، گویا پردہ جیسیں اٹھتا ہے۔

رات آدھی آ چکی تھی، کل جہاں خاموش تھا
دیدۂ ہستی وفور خواب سے مدہوش تھا

اس کے بعد

ناگہاں بجلی سی چمکی اور فلک کا در کھلا
اک فرشتہ اس فضائے تنگ میں داخل ہوا

اور پھر وہ فرشتہ 'نور کا پیکر' آدم زاد کو سارے عالم کی سیر کا مژدہ سناتا ہے۔ اس کو اپنے ساتھ ہوا کے پروں پر لے اڑتا ہے۔ پہلے وہ تمام عالم کے دلکش نظارے جنھیں خلاقِ عالم نے خلق کیا ہے اس کا نظارہ کراتا ہے۔ پردۂ غیب کھلتا جاتا ہے۔ وہ خوب صورت زمین جسے آدم و حوا نے جنت سے آ کر سجایا تھا اور

چاند کی زرپاش کرنوں میں وفورِ ناز سے
جگمگاتی تھی یہی دنیا عجب انداز سے

پردہ پھر اٹھتا ہے اور اس بار منظر بدل جاتے ہیں۔ اس کرہ ارض کا دوسرا رُخ نظر آنے لگتا ہے جہاں قیامت کے منظر زمین پر نظر آنے لگتے ہیں۔ انسان میں در آئے ہوئے شیطان نے اس جنت کو جہنم سے بدتر بنا دیا ہے۔ ہر طرف عورتوں، بچوں، مزدوروں اور محنت کشوں کا استحصال ہو رہا ہے۔ ظلم و استبداد کی نئی کہانیاں لکھی جا رہی ہیں۔ لوٹ مار، قتل و غارت اور آگ زنی کا منظر ہے۔

دل میں غیظ آلود لہریں پیچ و خم کھانے لگیں
دفعتاً آنکھیں ملک کی آگ برسانے لگیں
کج ہوئے لب اور یہ نکلی صدائے جاں گزا
ظلم کے پتلے اسی عالم پہ تجھ کو ناز تھا؟

آدم زاد ان نظاروں کو دیکھ کر فرط خوف سے بے ہوش ہو جاتا ہے۔

دوسرے حصے میں چار نظمیں فخر ہندوستان، تحفۂ درویش، شاعر اور 'آزاد مسافر' کے عنوان سے شامل ہیں۔ 'آزاد مسافر' کے صرف دو شعر ملاحظہ فرمایئے جس میں کیا ہمت اور خود اعتمادی کا مظاہرہ ہے۔

وہ موج ہوا ہوں میں جس کا، پایاں ہی نہیں، ساحل ہی نہیں
اے طالب منزل میرے لیے، محدود کوئی منزل ہی نہیں
وہ دل کو یقین جوانی ہے، پتھر بھی نظر میں پانی ہے
ناممکن بھی امکانی ہے، مشکل تو کوئی مشکل ہی نہیں

تیسرے حصے میں تین نظمیں ہیں جنگجو ہندوستانی، جمنا کے تیر اور 'کانی عورت'۔ تیسری نظم کانی عورت مختصر ہے مگر چونکانے والی ہے۔ ایک دلکش اور خوبرو دوشیزہ دریا کے کنارے ٹہلتی ہوئی نظر آتی ہے۔ شاعر اس کے حسن میں کھونے کو تھا کہ وہ قریب آتی ہے اور شاعر حیران رہ جاتا ہے کہ اس کی ایک آنکھ میں بینائی نہیں ہے۔ وہ اپنے اس نقص پر شرماتی ہوئی گزر جاتی ہے اور تب دیکھیے شاعر کا ذہن کہاں پہنچ جاتا ہے۔ یہ نظم کے آخری دو اشعار ہیں۔

دیکھتے ہی ہو گیا دل اس تصور سے دو نیم
مسلم و ہندو بھی ہیں اک ماں کی دو آنکھیں شمیم
پھوٹ جائے ایک پھر کس طرح منھ دکھلائے گی
مادرِ ہندوستاں بھی تو یونہی شرمائے گی

چوتھے حصے میں چار نظمیں ہیں خواب، شہر، جوانی کی نیند، اور 'آزادی کا حق'۔ نظم 'شہر' ایک ایسے شہر کا مرقع ہے جس میں ہر طرف افراتفری کی تصویر ہے، شور ہے، ہنگامہ ہے، امیر اور غریب کی تفریق ہے اور یہ سب تضاد اس قدر بڑھا ہوا ہے کہ یہی انقلاب کا پیش خیمہ بن جاتا ہے۔ یہ ان مصرعوں سے شروع ہوتی ہے: ع۔ شور، ہنگامہ، بغاوت، قتل، غارت، اژدہام/مکر، خود بینی، ستم رانی، خباثت، انتقام: اور ختم ہوتی ہے۔

آفتاب اک اور بعد آفتاب آنے کو ہے
انقلاب آنے کو ہے، اب انقلاب آنے کو ہے

اگلے حصے میں پانچ نظمیں ہیں برسات کی شام، مغنی، معیارِ جمال، دیہاتی عورت اور'اے غزل گو' دیہات میں برسات کی ایک شام گلرنگ منظر بکھیر رہی ہے، گھاس کے قالین بچھے ہیں، دور تک دھان کے لہلہاتے کھیت 'جیسے کوئی سوگیا ہو سبز چادر تان کے' وغیرہ وغیرہ۔ شاعر نے اس نظم میں بہترین منظر کشی کرتے ہوئے دیکھا ہے کہ دہقان کی آنکھیں بارش ہوتے دیکھ چمک جاتی ہیں اور اس کے دل میں ایک نئی امید کی کرن جاگ اٹھتی ہے۔

شام ابرو برق ہے یا صبحِ رنگیں عید کی
روئے دہقاں پر چمکتی ہے کرن امید کی

'مغنی' میں مغنی لحن غم انگیز چھیڑتا ہے، ماحول سوگوار ہو جاتا ہے۔

دل میں اک موج تپاں اٹھتی ہے بل کھائی ہوئی
سانس جو سینے سے آتی ہے وہ گھبرائی ہوئی

شاعر اس فرسودہ طرز فکر سے اکتا جاتا ہے اور کہتا ہے کہ اس لحن غم انگیز کو اب زنگ لگ چکا ہے۔ اب اسے انقلابی آب ورنگ دے۔ آخری شعر ہے۔

ایسے نغمے چھیڑ دے جن سے وطن بیدار ہو
تیرے طوفانی ترانوں میں یہ بیڑا پار ہو

'معیارِ جمال' میں شاعر تخیل کی پری کو جو حسین پاکباز ہے، مہ جبین خوش خصال ہے اسے بوڑھوں کا معیارِ جمال بتاتا ہے۔ عورت کے وجود کو رسم ورواج، جہالت اور محض خاتون خانہ کے حصار سے نکلنے کے لیے آمادہ کرتا ہے۔ مجاز نے آنچل سے پرچم بنا لینے کا مشورہ دیا تھا تو شمیم نے کیا کہا دیکھیے۔

آ مری محفل میں ! جانِ جذبۂ بیدار بن
تھی کھلونا آج تک، اب قوم کی تلوار بن

چھٹے حصے میں چار نظمیں ہیں کسان کا سفر، آگے چل کر، ڈومنی، بھوکا بھکاری۔

کسان کا سفر، گاؤں کے چھوٹے سے اسٹیشن پر کھڑی اک ریل گاڑی پر سوار ایک مزدور کام کے لیے شہر جاتا ہے اور کھڑکی کے باہر ایک غریبی کی ماری لاغری عورت اپنے شوہر کو رخصت کرنے کھڑی ہے۔ سیٹی بجتی ہے، گاڑی کھسکتی ہے اور ادھر گھبرائی ہوئی عورت چکرا کر گر جاتی ہے۔ بہترین منظر کشی کرتے ہوئے نظم یوں ختم ہوتی ہے۔

اُس طرف گاڑی چلی اور اس طرف یہ دل چلی
صید زخمی کی طرح، جھومی، رکی، اور گر پڑی
جن سے جاں مضطر، نگہ بیتاب، دل غمگین ہیں
پردۂ افلاس پر ایسے ہزاروں سین ہیں

'آگے چل کر' بھی ایک ایسی ہی نظم ہے جس میں ایک وسیع کھیت کا منظر ہے جہاں کسان، اس کی شریکِ حیات کھیت جوتنے میں مشغول ہیں اور ان کے ساتھ ان کا ننھا بچہ بھی مٹی میں کھیل رہا ہے اور ماں ایک طرف اپنے شوہر کا ہاتھ بٹا رہی ہے اور دوسری طرف بچے پر بھی برابر نظر رکھے ہے۔ اسے پڑھیے تو ایک خوبصورت منظر نامے کا لطف آتا ہے۔ 'ڈومنی' اور 'بھوکا بھکاری' میں بھی پسماندہ کرداروں کی مجبوری اور سرمایہ دارانہ نظام کی بالا دستی کا ذکر ہے۔

ساتویں حصے میں تین نظمیں ہیں دیسی نمائش، بسکٹ والی اور 'قدامت کا مقبرہ' ان نظموں میں بھی غربت، قدامت پسندی اور سرمایہ داروں کی زیادتیوں کو موضوع بنایا گیا ہے۔ آٹھویں اور آخری حصے میں آٹھ نظمیں ہیں نیا ادب، کنور کی تفریح، یقین صحت، جہالت مردہ باد، پانی کا گھر، لیڈر، 1939 اور 'نوجوانوں سے' ان نظموں میں بھی غریبی اور پسماندگی کو اپنے وطن عزیز سے نکال پھینکنے کا جذبہ حاوی نظر آتا ہے جو پہلی نظم 'نیا ادب' کے اس آخری شعر سے ظاہر ہے۔

مجھ کو باغوں میں نہ اونچے اونچے کاشانوں میں ڈھونڈھ
ڈھونڈنا ہو تو غریبوں کے سیہ خانوں میں ڈھونڈھ

'کنور کی تفریح' یہ نظم بھی اونچ نیچ اور سرمایہ داری کے خلاف ہے مگر اس میں رُخ بدل گیا ہے۔ یہاں کنور یعنی شہزادے صاحب اپنے محل سے کچھ دور چہل قدمی کرتے ہوئے ایک دوشیزہ کو دیکھتے ہیں کہ وہ سر پر اپلوں کا بوجھ لیے ان کے قریب سے گزر جاتی ہے۔ یہ جانتے ہوئے کہ دونوں کے بیچ دولت و ثروت کی کھائی ہے، متعصب سماج ہے، اس کو اپنی رانی بنانے کے لیے بیتاب ہو جاتے ہیں۔ جب سماج بیچ میں آتا ہے تو وہ بغاوت پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ راج اور تاج سے ٹکرا جاتے ہیں اور نظم اس شعر پر تمام ہو جاتی ہے۔

جہاں سے ظلم کا لاشہ اٹھا کے دم لوں گا
یہ فرق شاہ و گدا کا مٹا کے دم لوں گا

'پانی کے گھر' قومی یکجہتی پر مبنی شدید طور پر ایک جذباتی نظم ہے۔ اس کا پہلا اور آخری شعر ملاحظہ فرمائیں۔

ہائیں یہ کیا ایک اسٹیشن پہ دو پانی کے گھر؟
ایک پر لکھا ہوا 'ہندو'، 'مسلماں' ایک پر؟
بھائی بھائی کے لہو کے واسطے بیتاب ہے
اور اس جھگڑے میں خود ہندوستاں بے آب ہے

آخری نظم 'نوجوانوں سے' جوش اور جذبے سے بھرپور ہے۔ وہ نوجوانوں سے للکار کے کہتے ہیں۔

اٹھو نوجوانو! اٹھو نوجوانو!
سنو وہ بگل کی صدا آ رہی ہے
فضاؤں میں موسیقیت چھا رہی ہے
کوئی فوج بڑھتی چلی آ رہی ہے
اٹھو نوجوانو! اٹھو نوجوانو !
اٹھو اور جوش جوانی دکھا دو
بڑھو اور آگے بڑھو بڑھتے جاؤ
اٹھاؤ نشانِ بغاوت اٹھاؤ
اٹھو نوجوانو! اٹھو نوجوانو!

اس کتاب میں جو نظمیں اور گیت شامل ہیں ان کے تیور کا اندازہ شاید ہو گیا ہوگا۔ تمام کلام کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ شمیم کے لہجے میں وہ چنگھاڑتے ہوئے الفاظ نہیں ہیں جو صرف جوش ملیح آبادی کا ہی خاصہ ہے۔ مگر شمیم کی نظموں میں بھی وہی آگ ہے، وہی تڑپ ہے لیکن اکثر نرم اور خوب صورت الفاظ میں سجائے ہوئے اور لطیف پیرائے میں پیش کی گئی ہے۔ یہ کتاب 1939 میں شائع ہوئی ہے یعنی اس میں آزادی حاصل ہونے سے تقریباً 10 سال پہلے کی نظمیں ہیں۔ شمیم آزادی کے بعد بھی قومی یکجہتی اور حب الوطنی پر نظمیں کہتے رہے ہیں۔ مہاتما گاندھی کے انتقال پر ان کی نظم 'جگاؤ نہ باپو کو نیند آ گئی ہے' نے عوام وخواص دونوں کو بے حد متاثر کیا اور وہ بہت مقبول ہوئی۔

■

Azam Abbas Shakeel
Flat No.: 83, AIMS Apartment
Mayur Kunj
Delhi - 110096
Mob.:9717581666

ناشر نقوی

محرکِ تعلیم مصلحِ ملک وملت
نواب مشتاق حسین وقارالملک

ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی 1857 کے دوران ملک کی مسلم آبادی میں تعلیمی شعور بیدار کرنے والی اہم ترین شخصیات میں نواب وقارالملک مشتاق حسین زبیری کا کلیدی رول رہاہے۔ آپ اپنے زمانے کے مشہور سیاست داں، مصلح قوم، ماہر تعلیم، مترجم اور منتظم تھے جن کی غیر معمولی صلاحیتوں کو پرکھ کر تعلیم اور ادب کے سرخیل سرسید احمد خاں نے وقارالملک کو اپنی علی گڑھ تحریک کا علمبردار بنایا تھا۔ یہ وہ تحریک تھی جس کے زیرِ اثر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی قائم ہوئی اور ہندوستانی مسلمانوں میں تعلیم کا شعور عام ہوا۔

نواب وقارالملک کے لقب سے مشہور، مشتاق حسین کے اجداد کا تعلق تو میرٹھ سے تھا لیکن ان کا ننہال امروہہ کا رہا۔ آپ کی ولادت 24/مارچ 1841 کو میرٹھ میں ہوئی، ابھی چھ مہینے ہی کے تھے کہ مشتاق حسین کے والد فضل حسین زبیری کا انتقال ہوگیا جس کے کچھ عرصہ بعد وقارالملک کی والدہ مقبول النساء بیگم بیٹے کو لے کر امروہہ آگئیں اور اس طرح وقارالملک اپنے نانا کے گھر محلّہ شاہی چبوترہ کا حصہ بن گئے اور ان کا اپنا وطن امروہہ بن گیا۔ آپ نے ابتدائی تعلیم بھی امروہہ ہی میں حاصل کی اور ابتدائی عملی زندگی بحیثیت ٹیچر بھی امروہہ سے ہی شروع کی۔

وقارالملک کا امروہہ سے جو عشق رہا اس کے ثبوت ان کے وہ کارنامے ہیں جو امروہہ کی ترقی کی بنیاد کہے جاسکتے ہیں۔ آج امروہہ میں جو سرکاری ہسپتال، سرکاری کالج اور دہلی مرادآباد ریلوے لائن ہے وہ وقارالملک کی ہی محنت کا ثمرہ ہے۔ جب پہلی بار 1902 میں دہلی مرادآباد ریلوے لائن ڈالی جارہی تھی تو اس کی تجویز قصبہ جویا سے قریب موجودہ این ایچ 24 کے ساتھ ساتھ تھی۔ اس پر وقارالملک کو اعتراض ہوا جو انھوں نے مرکزی حکومت تک کیا۔ ان کے احتجاج کو قبول کرتے ہوئے حکومت نے ریلوے کا موجودہ روٹ بنایا اور اس طرح امروہہ کو ریلوے لائن ملی تھی۔

وقارالملک کے شعور نے جب آنکھیں کھولیں تو اس وقت ہندوستان انگریزوں کا غلام تھا اور ملک کی آزادی کے لیے پہلی تحریک 1857 اپنے شباب پر تھی، ادھر انھوں نے محسوس کیا کہ مسلمانوں میں تعلیم کا وہ چلن نہیں ہے جس کی اشد ضرورت ہے۔ چنانچہ انھوں نے پہلے خود اور پھر دوسرے لوگوں کو اردو فارسی کی رسمی تعلیم کے ساتھ انگریزی زبان سے وابستہ کیا۔ 1859 میں وقارالملک 18/برس کی عمر میں امروہہ کے تحصیل اسکول میں ٹیچر بن گئے لیکن یہ ملازمت عارضی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ضلع مرادآباد میں سخت قحط پڑا تھا اور سرسید احمد خاں ایک اعلیٰ افسر کی حیثیت سے مرادآباد آگئے تھے۔ وقارالملک کے پھوپھا منشی امام الدین اس وقت مرادآباد کے تحصیل دار تھے جن کے توسط سے وقارالملک سرسید احمد خاں سے قریب ہوئے اور قحط کو کنٹرول کرنے والے محکمے سے وابستہ ہوگئے۔ وقارالملک نے اس وقت بنائے گئے 'محتاج خانہ' میں جو فلاحی کام کیے انھوں نے سرسید احمد خاں کا دل جیت لیا تھا۔

1865 میں وقارالملک کا تقرر سررشتۂ تعلیم میں ہوگیا اور اب وہ براہِ راست سرسید احمد خاں کے دستِ راست ہوکر علی گڑھ منتقل ہوگئے، جہاں ان کی صلاحیتوں کے جوہر کھلتے چلے گئے۔ سرسید احمد خاں نے مشتاق حسین پر بہت بھروسہ کیا اور ان کی سروس بک میں انھوں نے لکھا:

''منشی مشتاق حسین کی دیانت داری پر مجھے ایسا یقین ہے جیسا اپنی موت پر۔ جس عہدے پر یہ شخص مامور ہے اس سے بہت زیادہ بڑے عہدے کی عمدہ قابلیت اس میں موجود ہے۔'' (سید احمد خاں: صدرالصدور)

منشی مشتاق حسین نے تیرہ برس انگریزی حکومت میں مختلف عہدوں پر رہ کر گزارے۔ ان کے اندر بھی انگریزوں سے نفرت تھی اور عبادات سے محبت، اس لیے ایک انگریز افسر نے جب ان کی نماز پر اعتراض کیا تو حکومت کی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا جس کے چرچے دکن کی حکومت تک پہنچے۔ مشتاق حسین کی جرأت، ہمت اور حمیت سے متاثر ہوکر حیدرآباد کے وزیرِاعظم سرسالار جنگ نے سرسید احمد کی فرمائش پر مشتاق حسین کو حیدرآباد بلاکر سرکاری تنخواہ سے چار گنا زیادہ مشاہرہ دے کر دکن کی حکومت میں شامل کرلیا۔ 1875 میں مشتاق حسین سب سے پہلے ریاست دکن کے ناظم دیوانی مقرر ہوئے ان کی محنت، لگن اور ان کے حسن انتظام سے متاثر ہوکر سالار جنگ نے موصوف کو ایک ہی برس کے اندر گلبرگہ کا 'صدر تعلق دار' مقرر کردیا۔ دس برس اہم عہدوں پر رہ کر مشتاق حسین دکن کے ایک صوبے کے گورنر بن گئے اور اس طرح بعد کو پورے دکن کے ریونیو سکریٹری کے عہدے تک پہنچے۔

دکن میں بہترین انتظامی کارکردگیوں کے لیے مشتاق حسین کو حکومت دکن کی جانب سے متعدد اعزازات اور خطابات سے بھی سرفراز کیا گیا۔ ان خطابات میں 'نواب وقارالدولہ'، 'خاں بہادر'، 'انتصار جنگ' اور 'وقارالملک' اہم ہیں۔ اس آخرالذکر خطاب سے ہی مشتاق حسین کی آخر عمر تک پہچان رہی۔

وقارالملک کی بے پناہ مقبولیت جب دکن میں ہوئی تو علاقائی عہدہ داروں میں حسد اور احساسِ کمتری بھی بڑھنے لگا جس کا شکار وقارالملک بھی ہوئے۔ سالار جنگ کے کان وقارالملک کے خلاف بھرے جانے لگے اور انھیں بتایا گیا کہ یہ موصوف برطانوی سامراجیت کے خلاف ہیں۔ سالار جنگ انگریزوں کے اس لیے حامی تھے کہ انگریزوں نے ان کی محدود دکنی سرکار کو مصلحتاً نہیں چھیڑا تھا۔ انگریزوں کی مخالفت کے جرم میں وقارالملک پہلے 1879 میں برطرف ہوئے اور پھر 1892 میں مستقل طور پر حیدرآباد کو خیرباد کہہ کر اور اپنی پینشن کو برقرار رکھوا کر اپنے وطن امروہہ لوٹ آئے جس وقت امروہہ آئے اس وقت ان کی پینشن سات سو روپے ماہانہ تھی۔

وقارالملک کے حیدرآباد جانے سے پہلے اور حیدرآباد میں قیام کے دوران جو سرسید احمد خاں کی تعمیر اور تعلیمی تحریکات سے رشتہ تھا وہ بدستور برقرار رہا چنانچہ حتمی طور پر جب وقارالملک دکن کی ملازمت سے سبکدوش ہوکر امروہہ

آگئے تو پھر سرسید کی علی گڑھ تحریک سے وابستہ ہوگئے۔ سرسید احمد خاں نے وقارالملک کو امروہہ سے علی گڑھ بلالیا اور اپنے مشہور زمانہ رسالے' تہذیب الاخلاق' کو جاری رکھنے کی ذمے داری سونپ دی۔ اس رسالے کے لیے وقارالملک نے متعدد ومنثور بندی اصلاحی اور ترغیبی مضامین لکھنے شروع کیے جنھیں نہ صرف عوام نے بلکہ خودسرسید احمد خاں نے خصوصی طور پر سراہا۔ یہ مضامین دو چار صفحات کے نہیں ہوتے تھے بلکہ ایک ایک مضمون 70 سے 80 صفحات پر مشتمل ہوتا تھا۔ قابل ذکر ہے کہ 'تہذیب الاخلاق' کے ایسے ہی مضامین کو اردو ادب کی تاریخ میں اردو نثر کے آغاز سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ سرسید احمد خاں کی علی گڑھ تحریک کا ابتدائی اردو نثر نگاری میں کلیدی رول رہا ہے اور اس رول میں سرسید کے ساتھی وقارالملک کی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

وقارالملک کے متذکرہ تحریری کاموں کے علاوہ تدبیری اور تعمیری کارنامے بھی بہت نمایاں رہے ہیں۔ موصوف نے سرسید احمد خاں کے دست راست ہوکر علی گڑھ کی سائنٹفک سوسائٹی کو فروغ دینے میں کلیدی کردار ادا کیا۔ اس سوسائٹی کی نگرانی میں علی گڑھ کالج تھا جو بعد کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے روپ میں ہندوستانی مسلمانوں کے تعلیمی وقار کی علامت بن کر گذشتہ سو برس سے قوم وملت کو عزت دے رہا ہے۔ ابتدا میں اس یونیورسٹی کے لیے دامے، درمے اور قدمے کام ہوئے جو بڑے صبر آزما تھے۔ وقارالملک نے ازخود اس کے لیے بہت بڑی رقم چندے میں دی اور پھر اپنے تعلقات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے دکن سے بڑی رقم جمع کرنے اور یونیورسٹی کی عمارتیں بنوانے میں وقارالملک نے دن ورات ایک کرکے جو کام کیے ہیں انھیں فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب شاطر انگریز نہیں چاہتے تھے کہ مسلمان اعلیٰ تعلیم سے بہرہ مند ہوں۔ اس وقت کے منصبدار اور زمیندار اپنی اگلی نسلوں کے لیے تعلیم کی طرف متوجہ نہیں تھے۔ ایسے حالات میں وقارالملک نے قریہ قریہ شہر شہر جا کر نئی نسلوں کو تعلیم سے وابستہ کیا۔ یونیورسٹی کے لیے طلبا کا جو پہلا ہوسٹل بنا اس کے پہلے وارڈن نگراں وقارالملک ہی بنے۔ ہوسٹل کے بچوں کے لیے ان کی جانفشانی کے چرچے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی تاریخ کا اہم باب ہیں۔ یونیورسٹی کے ابتدائی تعمیری امور میں اکثر ٹرسٹیز کے جذباتی فیصلوں سے وقارالملک الگ ہوجاتے تھے جس کے سبب ان میں اور سرسید احمد خاں میں دوری بھی ہوئی لیکن موصوف ہمیشہ اپنے موقف پر قائم رہتے تھے درحقیقت سرسید احمد خاں اور وقارالملک میں یہ بات قدرے مشترک تھی کہ دونوں ایک سی طبع اقتاد کے مالک تھے دونوں صاف گو اور اپنے موقف میں شدت پسند تھے۔ اچھی بات یہ تھی کہ دونوں اپنی نیک نیتی کے سبب اختلافات جلد ہی دور کرلیتے تھے، 1892 سے 1912 تک وقارالملک نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی تعمیر میں جو خدمات انجام دی ہیں وہ ہندوستان میں تعلیمی بیداری کی تاریخ کا اہم باب ہیں۔

علی گڑھ میں رہ کر سائنٹفک سوسائٹی کے دوسرے اہم کاموں میں فرسودہ رسم ورواج کو ترک کرنے کی بھی تحریک شامل تھی۔ وقارالملک نے اجتماعی اور انفرادی طور پر اس سمت جو پیش رفت کی وہ بھی مسلم تاریخ میں سنہرے الفاظ میں لکھی جاتی رہیں گی۔ شادی بیاہ کے موقع پر فضول خرچی کو روکنے کے لیے وقارالملک نے اہم کام کیے اور بے جا مصارف سے عوام کو بچا کر غریب اور بے سہارا نادار لوگوں کی مدد کرنے کی تحریک دی اپنے ایک مضمون میں وقارالملک نے تہذیب الاخلاق میں لکھا:

''صاحبو! جب ضرورت کی حالت میں تم نفل نماز چھوڑ سکتے ہو تو بے جا رسموں کا ترک کردینا تمھارے لیے کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ اس تجویز کے ذریعے ہم اپنی قوم کو خست کی تعلیم نہیں کرتے بلکہ صرف دولت کے مصرف کو بدل دیتے ہیں اور ایک ضروری اور فضول خانے کی رقم کو اٹھا کر نہایت ضروری خانے میں رکھ دیتے ہیں۔

اگر سماج سے پیاس پیاس کی آواز بلند ہورہی ہو تو نفل نماز کو چھوڑ کر ڈول اسی ہاتھ میں لے لو اور پانی بھر کر پیاسوں کی پیاس بجھاؤ۔

وقارالملک نے اپنے اس تعمیری جذبے کو امروہہ آکر بھی جاری رکھا۔ امروہہ کے غربا اور مسکینوں میں جا جا کر وہ نہایت سلیقے کے ساتھ مدد کرتے تھے اور کہتے تھے۔

بہت لمبی فہرست میرے ایسے متعلقین کی ہے جن کا رزق خدا نے میرے ساتھ اتارا ہے۔ مجھ سے جہاں تک ممکن ہے میں نے اپنے اور ان سب کے قوت لایموت کے واسطے پوری کفالت شعاری سے کوشش کی ہے۔

قابل ذکر ہے کہ وقارالملک نے نئی نسل کو زیورِ تعلیم سے مالا مال کرنے کے لیے امروہہ سے متصل سات گاؤں، (ملک پہاڑ موہ، ڈھاکی، شیخوپورہ، کورال، سلطانپور انتقام علی خاں، پٹی وغیرہ) کی آراضی جو 11 ایکڑ کے قریب تھی، وقف کی تھی۔ جس کا ریکارڈ آج بھی 'نواب مشتاق حسین وقارالملک وقف رجسٹرڈ' کے صدر منصور احمد صدیقی ایڈوکیٹ کے پاس موجود ہے۔ امروہہ سب رجسٹرار کے دفتر میں اس وقف کا اندراج 12 جون سنہ 1915 کو ہوا تھا۔

وقارالملک ایک باعمل مصلح قوم تھے۔ موصوف نے اپنے والدین کی وقتی ناراضگی کو برداشت کی لیکن اپنی شادی بغیر کسی شور شرابے کے ساتھ کرنی پسند کی تھی۔ وقارالملک کی تربیت میں ان کے بیٹے محمد احمد بارایٹ لا، ہوکر انگلستان سے لوٹے جو غالبًا امروہہ کے پہلے 'بارایٹ لا' تھے افسوس کہ جب وہ امروہہ لوٹ کر آئے تو زیادہ عرصے زندہ نہ رہ سکے۔ وقارالملک کی تین بیٹیاں ہوئیں جو اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوئیں۔

مشتاق حسین وقارالملک کا انتقال 28 جنوری 1917 کو امروہہ ہی میں ہوا۔ ان کی موت کا غم پورے ہندوستان نے منایا۔ علی گڑھ کی تعلیمی فضائیں اداس ہوئیں۔ علی گڑھ تحریک کے لوگوں نے چاہا کہ وقارالملک کی قبر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے قبرستان میں بنے لیکن وقارالملک کی خواہش کے مطابق انھیں امروہہ ہی میں دفن کیا گیا۔

وقارالملک کے بارے میں یہ بھی پڑھنے کو ملا کہ انھوں نے تین کتابیں بھی لکھیں لیکن باوجود بسیار تلاش کے ان کے نام مجھے نہیں مل سکے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں وقارالملک سے منسوب ایک ہال آج بھی ان کی عظمت کا پتہ دے رہا ہے۔ امروہہ کی سابق چیئرپرسن بیگم آفتاب سیفی کی خدمات قابل قدر ہیں جنھوں نے اپنی چیئرمین شپ میں امروہہ میونسپل کونسل سے 'وقارالملک' گیٹ تعمیر کرایا۔ میڈم نے ہی پہلی بار وقار الملک کی شخصیت پر ایک کتاب شائع کی تھی جس سے امروہہ کی اس عظیم شخصیت کی عظمتوں کا اندازہ شہر والوں کو ہوا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ امروہہ میں وقارالملک کی قبر کو بھی خوبصورت مقبرے کی شکل دی جائے تاکہ تعلیم سے عشق کرنے والے عقیدت مند اور امروہہ والے اپنے وطن کے اس فرزند کے مزار پر جاکر فاتحہ پڑھتے رہیں اور خود پر فخر کرتے رہیں۔ شاعر مشرق علامہ اقبال نے وقارالملک کی جو تاریخ کہی وہ مندرجہ ذیل ہے۔

نواب وقارالملک وملت　　افشاند سوئے جناں رکابش
برلوح مزار او رشتم　　انجام بخیر، باخطابش
وقار الملک انجام بخیر

1335ھ مطابق 1917

مختصر یہ کہ ہندوستان کی آزادی، اردو ادب کی تاریخ اور ہماری قومی وملی تہذیب نواب وقارالملک کی شخصیت پر ہمیشہ ناز کرتی رہے گی۔ وقت گزرنے کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ ہم اپنی تاریخ ساز ہستیوں کو یاد کرتے رہیں تاکہ اگلی نسلیں گذشتہ شخصیات سے تحریک حیات لیتی رہیں۔

■

Prof. Nashir Naqvi
Mahal: Darbar Kalan
Amroha - 244221 (UP)
Mob.:9814960786

زخ ش

افشاں ملک

بیسویں صدی کی اوائل دہائیوں کی تخلیق کار خواتین میں اردو شاعری کے حوالے سے 'ز۔خ۔ش' اس توانا آواز کا نام ہے جس نے اپنے تخلیقی شعور، منفرد طرز ادا، ترقی پسند خیالات اور حریت پسند مزاج کی بناپر بہت کم عرصے میں اپنے معاصرین فن کاروں کے درمیان ایک امتیازی شناخت قائم کر لی تھی۔ بے حد مختصر زندگی میں اپنی ذہانت، ذکاوت، فہم وفراست اور علمی و ادبی کارناموں سے ادبی دنیا کو چونکانے والی اس کرشمائی فنکارہ کے تخلیقی وجدان اور ادبی شعور کے اعتراف میں خواجہ حسن نظامی نے انھیں 1917 میں 'فضائل بانو' کا لقب عطا کیا اور لکھا کہ:

''مسز سروجنی نائیڈو شاعری میں بہت مشہور ہیں۔ مگر اس مسلمان پردہ نشین سروجنی کے کلام پر تمام مسلمان قوم فخر کر سکتی ہے۔'' (ماخوذ: حیات ز۔خ۔ش، ص 129)

اسی ضمن میں سید ممتاز علی نے اپنے رسالے 'تہذیب نسواں' شمارہ 3 جنوری، 1920 میں لکھا:

''محترمہ اس وقت بلا شبہ مسلمان خواتین ہند میں نہایت اعلیٰ پائے کی انشا پرداز شاعرہ ہیں۔ اور طبقۂ نسواں ان کی ذات پر جتنا بھی ناز کرے کم ہے۔'' (ایضاً ص 125)

ز۔خ۔ش صوبہ اتر پردیش میں ضلع علی گڑھ کے مضافات میں واقع 'بھیکم پور اسٹیٹ' کے والی نواب مزمل اللہ خان کے یہاں 8 دسمبر 1894 کو پیدا ہوئی تھیں۔ نواب مزمل اللہ خان نے بیٹی کا نام زاہدہ بیگم شروانیہ رکھا تھا، شواہد یہ بھی بتاتے ہیں کہ ان کے تایا نے ان کا نام 'نادر خاتون' رکھا تھا لیکن ز۔خ۔ش کو اپنے نام 'زاہدہ' کے ساتھ 'بیگم' کا لاحقہ پسند نہیں تھا سو 'بیگم' ہٹا کر 'خاتون' کر لیا، بعد میں اس اصلی نام کا مخفف 'ز۔خ۔ش' اختیار کر لیا اور اسی نام سے ادبی دنیا میں مشہور ہوئیں۔ نام ہی کی طرح انھوں نے تخلص بھی بدلے، پہلے 'گل' رکھا پھر بدل کر 'نزہت' کر لیا۔ اپنے اشعار میں ز۔خ۔ش نے کہیں 'گل' کہیں 'نزہت' اور کہیں 'زاہدہ' استعمال کیا ہے۔ کمسنی میں ہی والدہ کا سایہ سر سے اٹھ گیا تھا۔ والد نواب مزمل اللہ خان نے اپنے چاروں بچوں کی پرورش اور تعلیم و تربیت میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ جب ز۔خ۔ش چار سال کی ہوئیں تو نواب صاحب نے قرآن پڑھانے کے لیے بوڑھ گاؤں کے رہنے والے حافظ احمد علی اور اردو کی تعلیم کے لیے متھرا کی رہنے والی 'والدہ محمد شفیع' نام کی ایک خاتون کو مقرر کر دیا۔

کچھ عرصے بعد نواب مزمل اللہ خان نے اپنے آبائی اسٹیٹ بھیکم پور سے ایک میل کے فاصلے پر احاطہ قلعہ میں ایک کوٹھی 'ظفر منزل' تعمیر کرائی اور 1901 میں وہ اپنے خاندان کو لے کر اس میں منتقل ہو گئے۔ اسی ظفر منزل میں ان ملانی صاحبہ کے قیام اور بچیوں کے پڑھنے کے لیے ایک کمرہ مختص کر دیا گیا تھا جو آج بھی 'ملانی والے کمرے' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ آگے کی تعلیم کے لیے نواب صاحب کو کسی ایسی قابل استانی کی تلاش تھی جو مختلف علوم پر گہری دسترس رکھتی ہو۔ جلد ہی نواب صاحب اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے اور انہیں ایران سے ترک وطن کر کے آنے والی بھوپال میں قیام پذیر ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون 'فرخندہ خانم طہرانیہ' کی خدمات بطور معلّمہ حاصل ہو گئیں۔ (فرخندہ خانم طہرانیہ کسی وجہ سے حکومت ایران کے زیر عتاب آ گئی تھیں اور ان کو ترک وطن پر مجبور ہونا پڑا تھا) یہ خاتون اردو نہیں جانتی تھیں لہٰذا انہوں نے ز۔خ۔ش اور ان کی بڑی بہن احمدی بیگم کی تعلیم فارسی زبان سے ہی شروع کی۔ فرخندہ خانم خود شاعرہ بھی تھیں اور فارسی میں شعر کہا کرتی تھیں۔ زاہدہ خاتون شروانیہ کی ذہانت سے متاثر ہو کر فرخندہ خانم نے ان کو باقاعدہ شعر گوئی کے رموز سکھائے۔ خود نواب مزمل اللہ خان بھی شعر کہتے تھے نیز گھر میں بھی شعر و شاعری کا ماحول تھا۔ نواب صاحب کے لیے خوش کن بات یہ تھی کہ معلّمہ فرخندہ نے بچیوں میں شعر گوئی اور فارسی زبان کی لیاقت پیدا کر دی تھی۔ اب وہ گاہے بگاہے خود بھی بچیوں میں بیٹھ کر اپنا کلام سناتے اور تشریح بھی کرنے کو کہتے۔ دس سال کی عمر تک ز۔خ۔ش کے اندر کچھ ٹوٹے پھوٹے اور کچھ قدرے بہتر شعر کہنے کی صلاحیت پیدا ہو گئی تھی۔ کمسنی میں کہا گیا ز۔خ۔ش کا یہ شعر ان کی انفرادیت کی ایک عمدہ مثال ہے۔

ایسی بنوں میں شاعرہ جیسی کوئی نہ ہو
سارا جہان نظم میری دیکھتا رہے

ز۔خ۔ش کے تعلیمی سلسلے میں دیگر علوم کی تعلیم کے لیے مقرر کیے گئے اساتذہ میں حضرت مولوی محمد یعقوب اسرائیلی جنہوں نے صرف ونحو، ریاضی اور فقہ کی تعلیم سے ان کو آراستہ کیا، بعد ازاں مولوی سید احمد ولایتی کا نام آتا ہے جن سے ز۔خ۔ش نے عربی کی تعلیم اور علم احادیث حاصل کیا۔ بھائی احمد اللہ سے واجبی سی انگریزی بھی شروانیہ نے پڑھ لی تھی۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ز۔خ۔ش کی تعلیم و تربیت اعلیٰ پائے کے ان اساتذہ کی نگرانی میں ہوئی تھی جو عربی فارسی اور دیگر علوم پر دسترس رکھتے تھے۔ معلّمہ فرخندہ خانم کے ساتھ گزارے شب و روز نے فارسی زبان پر پہلے ہی شروانیہ کی گرفت مضبوط کر دی تھی۔ حالانکہ عبور تو شروانیہ کو عربی زبان پر بھی تھا لیکن ان کا دل اردو اور فارسی کی طرف ہی زیادہ مائل تھا۔ ان کا تخلیقی سرمایہ بھی انہی دو زبانوں میں موجود ہے۔

مشرقی ماحول میں پرورش پانے کے باوجود ز۔خ۔ش ایک روشن خیال ادیبہ تھیں۔ علوم جدید میں بالخصوص انگریزی زبان کی اہمیت سے بھی واقف تھیں اور جانتی تھیں کہ انگریزی سے اجتناب ملک و قوم کی ترقی میں آڑے آئے گا۔ حیرانی ہوتی ہے کہ ایک حصار کے اندر پلی بڑھی ناپختہ عمر کی لڑکی اتنی مصلحت اندیش کیونکر تھی؟ اس سلسلے میں ایک واقعے کی مثال پیش کرتی ہوں جس کا پس منظر یہ ہے کہ ز۔خ۔ش اور ان کے کزنز نے ایک انجمن بنائی تھی جس کا نام 'ینگ شروانیز' تجویز کیا گیا تھا، مگر اس نام پر ان کے بھائیوں کو کچھ اختلاف تھا۔ صدر انجمن کا خیال تھا کہ نام عربی میں ہو یا اردو میں، انگریزی غیر زبان ہے اس میں نہیں ہونا چاہیے۔ اس حوالے سے ز۔خ۔ش کا نظریہ ملاحظہ فرمائیں:

''...اب میں آپ لوگوں سے ایک استفسار کرتی ہوں، خاص کر برادر مکرّم مولوی محمد انس خاں صاحب سے۔ آپ لوگوں کی رائے ہے کہ اردو نام کو انگریزی پر ترجیح ہے۔ بلکہ برادر ممدوح الصدر نے تو فارسی کو بھی انگریزی سے بہتر گردانا ہے۔ خوب! آپ معاف کریں، مجھے آپ کی اس رہبانیت و ربانیت (شاید تعصب کہنا سوء

ادب میں داخل ہو) سے اختلاف عظیم ہے۔ بلا سبب، بلا وجہ انگریزی زبان سے نفرت کٹھ ملائیت ہے... میں سمجھ نہیں سکتی کہ اپنی سرکاری اور فی زمانا نہایت ضروری زبان پر فارسی کو جو ایک غیر زبان ہے کیوں ترجیح دی جائے؟ رہا اردو نام اس پر ہم البتہ سنجیدگی سے بحث کر سکتے ہیں...''[1]

طالب علمی کے زمانے میں بطور مشغلہ اختیار کی گئی شعر گوئی اور مضمون نویسی کو تعلیم کے اختتامی دور کے بعد ز۔خ۔ش نے سنجیدگی سے لیا اور اس پر توجہ دینا شروع کی۔ شروانیہ کو شاعری سے عشق تھا اور وہ اسے خدمت انسانی کا ذریعہ سمجھتی تھیں۔ دوسروں کو بھی شعر کہنے کی ترغیب دیتی تھیں۔ مورخہ 5 جون 1911 کو اپنے کسی عم زاد کو لکھے گئے ایک بے تکلفانہ خط کی تحریر میں لکھتی ہیں:

''...ایک بات کی پھر یاد دہانی کراتی ہوں جس کی بابت ہمیشہ تحریراً و تقریراً تم کو سمجھاتی رہی ہوں۔''شاعری قومی خدمت کا اعلیٰ ذریعہ ہے۔شاعری سے زیادہ موثر و کارگر کوئی چیز نہیں ہے۔''شاعری سے حیات جاوید حاصل ہو سکتی ہے۔معلوم نہیں تم کو کیوں شعر کہنے سے عار ہے؟ خبردار! اس تحریر کے جواب میں منظوم خط آئے۔''[2]

ز۔خ۔ش نے خود بھی شاعری کو قومی خدمت کا ذریعہ بنایا اور غزل کی جگہ نظم کو اپنایا کیونکہ نظم اپنے فارم کی وجہ سے ہر طرح کے موضوعات کا احاطہ کر لینے کی وسعت رکھتی ہے۔'فردوس تخیل' اور 'آئینہ حرم' شروانیہ کی نظموں کے ہی مجموعے ہیں۔'فردوس تخیل' انھوں نے اپنی زندگی میں ہی مرتب کر دیا تھا لیکن صد افسوس کہ یہ مجموعہ ان کے انتقال کے بھی انیس برس کے بعد دار الاشاعت لاہور سے شائع ہوا۔ اس مجموعے کی تاخیر سے اشاعت پر اردو ادب کے معتبر ناقد اور محقق شان الحق حقی نے اپنے مضمون 'ز۔خ۔ش' میں ان الفاظ میں افسوس ظاہر کیا ہے:

''فردوس تخیل، اس وقت شائع ہوا جب دنیائے ادب میں ایک نیا انقلاب برپا ہو چکا تھا۔قرائن بتاتے ہیں کہ یہ شاعرہ اگر زندہ ہوتی تو اس انقلاب کا پورا اثر قبول کرتی۔وہ پہلے ہی صداقت کیشی اور حقیقت بینی کا دم بھرتی تھی۔ بڑی حسرت کی بات ہے کہ اس کے ناقدر شناس عزیزوں نے اس کے 'فردوس تخیل' کو سچ مچ گلدستۂ طاق نسیاں بنا کر رکھ دیا اور دنیا اس کی عالم بہار نہ دیکھ سکی۔ یہ برآمد ہوا تو اس وقت جب زمانہ ایک لمبا ڈگ بھر کر آگے بڑھ چکا تھا۔''[3]

شان الحق حقی نے 1954 میں 'ز۔خ۔ش' عنوان سے ایک سیر حاصل مضمون تحریر کیا اور کراچی کے حلقۂ ارباب ذوق کے جلسے میں پڑھا۔ یہ مضمون ماہنامہ 'نور' میں بھی شائع ہوا تھا۔ بعد ازاں شان الحق حقی نے اپنے مضامین کے مجموعے 'نکتہ راز' میں اسے شامل کیا۔ 11 نومبر 2003 کو مدیحہ خاتون شروانی (ز۔خ۔ش کی پھوپی زاد بہن) کو لکھے ایک خط میں شان الحق حقی نے ز۔خ۔ش پر لکھے گئے اپنے اس مضمون کے ذکر کے ساتھ ہی ان کی تخلیقات کو منظر عام پر لانے کے سلسلے میں برتی گئی خاندان کی عدم توجہی اور ادبی مورخین کی بے رخی دونوں کو موردِ الزام ٹھہراتے ہوئے لکھا تھا:

''اس (مضمون) نے اس وقت لوگوں کو خاصا چونکا دیا کیونکہ لوگ اس نام اور اس کے مسمّٰی سے واقف نہ تھے اور نہیں جانتے تھے کہ وہ دراصل مسماۃ ہیں۔اس کے بعد غالباً آپ کے علاوہ کسی نے کچھ نہیں لکھا۔تاریخ ادب میں کوئی ذکر نہیں آیا۔ بڑی زیادتی ہے''[4]

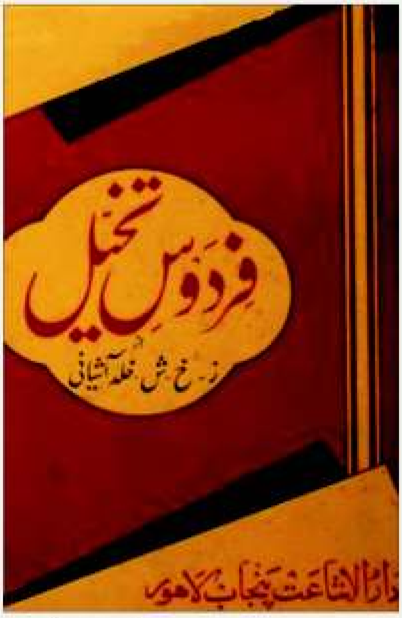

ز۔خ۔ش کے ساتھ ادبی دنیا کی 'یہ زیادتی' ہنوز جاری ہے۔ایک صدی ختم ہونے کو آئی لیکن ہندوستان میں اس قادر الکلام شاعرہ پر معتبر ناقدین کی نظر نہیں گئی نہ ہی زبان و ادب کے کسی تحقیقی ادارے کی طرف سے شروانیہ پر کوئی تحقیقی یا تنقیدی کام منظر عام پر آیا ہے۔

پاکستان کی معتبر شاعرہ و ادیبہ ڈاکٹر شاہدہ حسن کا تحقیقی مقالہ بعنوان 'ز۔خ۔ش: حیات و شاعری کا تنقیدی جائزہ' (شاید پہلا) تحقیقی کام ہے۔شاہدہ حسن کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری بھی اسی تحقیقی مقالے پر تفویض کی گئی ہے۔ ہندوستان میں ز۔خ۔ش پر لکھے گئے بس دو چار مضامین ہی میری نظروں سے گزرے ہیں۔ظاہر ہے ان مختصر مضامین سے کسی فنکار کے ادبی مقام و مرتبے کا تعین تو نہیں کیا جا سکتا۔ میرا معروضہ صرف اتنا ہے کہ ادب کے ایوانوں میں ز۔خ۔ش کے کلام کو تحلیل و تجزیے سے گزار کر تعین قدر کا معاملہ بھی طے کیا جانا چاہیے۔ تنقیدی مضامین میں (شاعرات کی) فہرست سازی کرتے وقت صرف نام بھر کا حوالہ اس معتبر اور منفرد شاعرہ کے حق میں سراسر ناانصافی ہے...!!!

کسی فنکار کی شخصیت کا اندازہ اس کے تخلیق کردہ کلام اور اس کی تحریروں سے با آسانی لگایا جا سکتا ہے۔ شروانیہ کے کلام کا مطالعہ کرنے پر اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا سماجی اور فکری شعور بہت بالیدہ تھا۔ دس برس کی عمر سے شعر کہنے کا جو سلسلہ شروع ہوا وہ بیس بائیس برس کی عمر کو پہنچتے پہنچتے ایک پختہ انداز فکر میں ڈھل گیا۔ وہ علامہ اقبال کے فکری شعور اور پیغام عمل سے بہت متاثر تھیں۔ فکر و عمل کا یہی پیغام ان کی نظموں میں بھی واضح طور پر نظر آتا ہے۔ 1915 میں 'آئینہ حرم' عنوان سے تخلیق کی گئی مسدس ز۔خ۔ش کے فکری تدبر اور سیاسی و سماجی شعور کا عمدہ نمونہ ہے۔ ذیل میں بطور نمونہ مختلف مواقع پر کہی گئی ان کی نظموں سے چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں: ذیل میں 'بہنوں سے دو دو باتیں' نظم کے دو اشعار پیش ہیں۔

لیا تم نے بہت شیریں کلامی کا مزا بہنوں
بس اب ہو تلخ کامی کی بھی لذت آشنا بہنوں
اگر چہ ذمہ داری جہل نسواں کی ہے مردوں پر
خطا بخشو مری۔ تم بھی نہیں ہو بے خطا بہنوں

خواتین کے حوالے سے مذکورہ نظم کے علاوہ مہذب بہنوں سے خطاب، عالم نسواں کا انقلاب، تصادم رواج و شرع اور مسدس 'آئینہ حرم' ان کی اہم نظمیں ہیں۔ مسدس 'آئینہ حرم' عورتوں کی زبوں حالی پر کہی گئی ایک ایسی نظم ہے جس میں علامہ اقبال کے شکوے کی سی کیفیت در آئی ہے، اس نظم کے کچھ بند ملاحظہ فرمائیں۔

آتش ظلم سے ہوئی دنیا دوزخ ہم پر
پھونک ڈالا تپ دق بن کر غموں نے اکثر
بے اجل مرتے ہیں تہ خانہ کے اندر گھٹ کر
ہیں جو تنگی میں، منافق کی لحد سے بدتر
ڈاکٹر کہتے ہیں در کھولو ہوا آنے دو
سنگ دل کہتے ہیں 'ہرگز نہیں! مر جانے دو'

'سپاس نامہ اردو' ز۔خ۔ش کی تاریخی حیثیت کی بہت مشہور نظم ہے۔ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد کے یوم تاسیس پر یہ نظم پڑھی گئی تھی۔ شان الحق حقی نے اپنے مضمون 'ز۔خ۔ش' مشمولہ 'نکتہ راز' میں اس نظم کے حوالے سے لکھا ہے:

''یہ نظم 'سپاس نامہ اردو' کے نام سے موسوم ہے۔ ز۔خ۔ش کی ساری کائنات سخن میں سے اس ایک نظم نے ان کے بعد بھی خاصی شہرت پائی، یہ اُس دور میں اپنی قسم کی بڑی اچھوتی، بڑی دلکش اور اثر انگیز آواز تھی... اس

نظم کے پڑھنے والے عموماً واقف نہ تھے کہ اس کا لکھنے والا کون ہے، عنوان پر اردو کا لیبل لگا ہوا تھا، یعنی یہ اردو کی زبان سے ایک فریاد تھی۔ لہٰذا اس نظم نے جو توجہ پائی وہ اوپری تھی۔ اردو کا دکھڑا دل کو لگتا ہوا سا مضمون تھا لیکن نظم کے مطالب میں اثر آفرینی کے کچھ اور بھی سامان تھے بشرطیکہ ذہن ان کی طرف رجوع ہو سکتا۔ اس کے مطالب تہ در تہ ہیں جو اردو کے اس ادب پارے کی وقعت اور بھی بڑھا دیتے ہیں۔ یہ اردو کی فریاد بھی ہے، عورت کی فریاد بھی اور خود زاہدہ خاتون شروانیہ کے دل کی فریاد بھی۔''[5]

اس نظم کے چند اشعار پیش ہیں۔

ہر چند کہ صورت میں ہوں نور کی مورت میں
ناظر نہ ہو جب کوئی کس کام کی رعنائی
زنداں میں ہے کیوں یوسف پنجرے میں ہے کیوں بلبل
یہ کون سی حکمت ہے یہ کون سی دانائی
کیا منظرِ عبرت ہے۔ حیرت کو بھی حیرت ہے
تصویرِ فلاکت ہے ایک پیکرِ زیبائی

بظاہر ز۔خ۔ش کی شاعری رومان سے یکسر خالی ہے، جس کی ایک وجہ تو یہ رہی کہ ان کا غزلیہ کلام منظر عام پر نہیں آسکا۔ مرحومہ نے 'نزہت الخیال' عنوان سے ایک شعری مجموعہ مرتب کیا تھا جس میں 'الف' سے لے کر 'ی' تک ردیف وار تمام مطبوعہ اور غیر مطبوعہ غزلیں شامل تھیں مگر وہ شائع نہ ہو سکا۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے والد کو ان کا غزلیں کہنا پسند نہیں تھا اس لیے ان کا بہت سارا غزلیہ کلام والد کے حکم پر ضائع کر دیا گیا لیکن ان کی بہت سی نظمیں غزلیہ آہنگ لیے ہوئے ہیں۔ ان میں غزل جیسی تمثیلیں اور استعارے موجود ہیں جس کی وجہ سے قاری بسرعت معنی اور مفہوم اخذ کر کے فن کار کے اصل مدعا تک پہنچ ہی جاتا ہے۔ اس حوالے سے شان الحق حقی اپنے مضمون 'ز۔خ۔ش' میں لکھتے ہیں:

''ان کا کلام جو رومانیت سے مبرا نظر آتا ہے، اس کا خاص سبب یہی معلوم ہوتا ہے کہ رومان کا نام بھی لینا مستقل زباں بندی کو دعوت دیتا تھا۔ انہوں نے قومی و سیاسی موضوعات کی آڑ لے کر اپنے آپ کو کامل ادبی موت سے بچا لیا۔ جو کچھ لکھا طبیعت کو روک روک کر لکھا۔ یہ اس ناتمامی کا ایک اور پہلو ہے جو ان کی ذات سے مختص ہے۔ عین عنفوان شباب میں ان کا کلام خاصا سنجیدہ زدہ نظر آتا ہے۔ طرزِ ادا کچھ تو ان کی علمیت کے باعث اور کچھ اس بندش کی وجہ سے جو ان کے سانسوں پر لگی ہوئی تھی، مغلق اور مولویانہ ہے، لیکن درد آشنا نگاہیں اب بھی اس کی برودت کی تہہ میں دل کے گداز اور روح کی تشنگی کو تاڑ سکتی ہیں اور جودت و ذکاوت کے ساتھ غمگینی

> شروانیہ مشرقی اقدار و روایات کی پاسدار تعلیم یافتہ اور بیدار ذہن خاتون تھیں۔ عورت کی جہالت سے نالاں شروانیہ آئندہ نسلوں کی تربیت اور پرورش کی ذمے داری تعلیم یافتہ عورت کو سونپنے کی خواہاں تھیں۔ اپنی نظموں اور مضامین کے ذریعے وہ مسلم قوم بالخصوص مسلم خواتین کو مسلسل آگاہ کرتی رہیں۔ وہ ایک ایسے معاشرے کی تعمیر چاہتی تھیں جس میں عورت نہ صرف تعلیم یافتہ ہو بلکہ اس کا سیاسی اور سماجی شعور بھی بیدار ہو لیکن اس کی ذمے داری وہ مردوں کو سونپتی تھیں۔

اور برہمی تو سطح پر بھی نظر آتی ہے۔''[6]

ذیل میں ز۔خ۔شروانیہ کی نظموں کے چند ایسے اشعار بطور مثال پیش ہیں جو تغزل کے رنگ سے مزین ہیں اور غزل کا لطف دیتے ہیں۔ ان اشعار میں ان کے دل کا درد بھی ہے، آہ و کراہ بھی ہے، صبر بھی ہے، شکایت بھی ہے اور برہمی بھی۔ اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

شکوے گلے کیے نہ فغاں کی نہ آہ کی
کیوں کر اڑی خبر مرے حالِ تباہ کی
میں احتیاط سوز ہوں وہ آتشیں مزاج
اہلِ حرم سے شکل نہیں کچھ نباہ کی
حالِ دل کیوں نہ کہیں منہ میں زباں رکھتے ہیں
ہم بھی پہلو میں دل اور جسم میں جاں رکھتے ہیں
ملا ہے نطق مجھ کو، ہمنشیں کو گوش نا شنوا
کبھی محو تفکر ہوں کبھی وقفِ شکایت ہوں

شروانیہ مشرقی اقدار و روایات کی پاسدار تعلیم یافتہ اور بیدار ذہن خاتون تھیں۔ عورت کی جہالت سے نالاں شروانیہ آئندہ نسلوں کی تربیت اور پرورش کی ذمے داری تعلیم یافتہ عورت کو سونپنے کی خواہاں تھیں۔ اپنی نظموں اور مضامین کے ذریعے وہ مسلم قوم بالخصوص مسلم خواتین کو مسلسل آگاہ کرتی رہیں۔ وہ ایک ایسے معاشرے کی تعمیر چاہتی تھیں جس میں عورت نہ صرف تعلیم یافتہ ہو بلکہ اس کا سیاسی اور سماجی شعور بھی بیدار ہو لیکن اس کی ذمے داری وہ مردوں کو سونپتی تھیں۔ اپنے مضمون 'سیاسی استانی' میں لکھتی ہیں:

''... تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ تمام بڑے آدمیوں کی مائیں خاص قسم کے دل و دماغ والی خواتین تھیں۔ فاتح کی ماں بہادر، مصلح کی جدت طراز، اور ولی کی فنا فی اللہ... جس طرح انفرادی طور پر ایک مرد کا اخلاق عورت ہی کا بنایا بگاڑا ہوتا ہے ٹھیک اسی طرح اجتماعی حیثیت سے ایک قوم کی اخلاقی و مادی ترقی قومی ماؤں کی دماغی حالت سے وابستہ ہوتی ہے۔ اگر آپ سیاسی عظمت کی ٹھیکے دار قوموں پر نظر ڈالیں گے تو ملاحظہ کریں گے کہ ان کی عورتیں سیاست کا کیسا صحیح مذاق رکھتی ہیں۔ اور حب وطن کے پاک جذبے سے کس قدر سرشار ہیں۔ ان کا وجود ماں کی حیثیت سے نہیں بلکہ فلاح عامہ کے ہر ایک شعبے میں کارکن کی حیثیت سے ملک و قوم کے لیے رحمت الٰہی ثابت ہو رہا ہے... ہمارا مجموعہ سیاست کیا ہے؟ ایک طومار، خرافات۔ ہمارا میدان عمل کیا ہے؟ ایک بازیچہ، اطفال۔ ہماری متفقہ آواز کیا ہے؟ ایک قہقہہ انگیز تمسخر۔ ہمارے رہنما سیاست کو تسخیر، عوام کا چلتا ہوا جادو، عزت حاصل کرنے کا تمغہ سونے چاندی کا مینھ برسانے والا پیشہ سمجھ کر اختیار کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارا رعب اور اثر اقوام عالم کے دلوں سے بالکل اٹھ گیا ہے۔''[7]

ز۔خ۔ش نے اپنی تخلیقات میں طبقاتی عدم مساوات کے شکار مظلوم انسانوں، مزدوروں، کسانوں، عورتوں اور بچوں کے مسائل کو بھی فنکارانہ مہارت سے پیش کیا ہے۔ شروانیہ کی نثری و شعری تخلیقات کا جائزہ لینے پر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ ترقی پسند رجحانات سے متاثر ہو کر لکھ رہی تھیں لیکن حیران کن بات یہ ہے کہ ترقی پسند تحریک کے وجود میں آنے سے تیرہ برس قبل شروانیہ اس جہان فانی کو الوداع کہہ چکی تھیں۔ یعنی شروانیہ ترقی پسندی کا اصل مفہوم سمجھتی تھیں ورنہ کیسے ممکن تھا کہ جس وقت ادب میں ترقی پسندی کے انکر بھی نہیں پھوٹے تھے وہ اسی انداز کا ادب تخلیق کر رہی تھیں جیسا ترقی پسند تحریک کے وجود میں آنے کے بعد ترقی پسند شعرا اور ادبا نے تخلیق کیا۔ ان کے شعری مجموعے ''فردوس تخیل'' میں ''مزدور'' ردیف میں ایک نظم شامل ہے، لیکن انہوں نے اسے غزل کا عنوان دیا ہے۔ مزدور کے حالِ زار کو اپنے اشعار میں یوں بیان کرتی ہیں۔

شاہدِ ارض کیوں نہ کرے دعائے مزدور
بہرِ زینت ہے وہ محتاج بقائے مزدور
کلۂ برف دسمبر میں ہے سر کے اوپر
فرشِ آتش ہے مئی میں تہِ پائے مزدور
کل جہاں اس کے لیے جیل ہے پھانسی گھر ہے
خاص کر ہند تو دوزخ ہے برائے مزدور

ز۔خ۔ش مدت الحیات گھر کی چہار دیواری کے اندر ہی رہیں، باہر کی دنیا سے بالواسطہ ان کا کوئی رابطہ نہ تھا علاوہ رسائل، جرائد اور اخبارات کے۔ تعجب ہوتا ہے کہ ایک حصار کے اندر رہتے ہوئے بھی شروانیہ کی سیاسی اور سماجی بصیرت اس کمال کی تھی کہ برصغیر ہی میں نہیں بین الاقوامی سطح پر رونما ہونے والے واقعات، سیاسی الٹ پھیر اور

حکمرانوں کی ریشہ دوانیوں سے بھی آگاہی رکھتی تھیں۔

ایک فنکار کے لیے یہ صورت حال بے حد تکلیف دہ ہوتی ہے کہ تخلیقی وجدان راہ بھائے اور فرسودہ خاندانی روایتیں اور سماجی بندشیں اس کی راہ روک کر کھڑی ہو جائیں۔ سچ تو یہ ہے کہ تخلیقی اظہار پر لگی قدغن ملک و معاشرے کی ہو یا خاندان کی فنکار نہ صرف یاسیت کا شکار ہو جاتا ہے، اس کا فن بھی مجروح ہوتا ہے! ز۔خ۔ش کی حزنیہ نظمیں، روزنامچے، دوستوں کو لکھے خطوط اور مضامین اس کا ثبوت ہیں۔

کتاب زیست میں کاتب تقدیر نے ز۔خ۔ش کی عمر کم اور غم زیادہ لکھے تھے۔ حقیقی چھوٹا بھائی اور منگیتر ابد خان (جو پھوپی زاد بھی تھے) دونوں عین جوانی میں آگے پیچھے چل بسے۔ منگیتر کے گزر جانے کے بعد ان کے والد نے ان کو کسی اور کے ساتھ رشتہ ازدواج میں منسلک نہیں کیا۔ جواز یہ تھا کہ خاندان میں ان کے جوڑ کا کوئی دوسرا لڑکا نہیں تھا اور خاندان سے باہر رشتہ کرنے میں ان کو تامل تھا۔

شروانیہ ایک حساس اور نوجوان لڑکی تھیں، ازدواجی زندگی کے حوالے سے یقیناً ان کے دل میں بھی ست رنگے خوابوں کی ایک دنیا آباد رہی ہوگی۔ لیکن خاندانی روایتوں سے ٹکرانا ان کے لیے آسان نہ تھا۔ ایسی فرسودہ روایات سے ایک لڑکی کے جذبات اور احساسات کا خون تو ہوتا ہی ہے، معاشرے اس نسل سے محروم ہو جاتے جو ایسی غیر معمولی ذہین و فطین ماؤں کے بطن سے پیدا ہو کر ملک و ملت کی فلاح میں اپنا کردار ادا کرتی۔

شروانیہ اس صدمے سے شاید کبھی نہ نکل سکی تھیں، اس کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ انہوں نے ایک بار خواجہ حسن نظامی کے مضمون میں کسی ایسی لڑکی کا ذکر پڑھا جس کا منگیتر مر گیا تھا اور اس کی خاندانی روایتوں کے مطابق اب اس کی شادی کبھی نہیں ہو سکتی تھی۔ مضمون پڑھ کر وہ بے چین ہو گئیں اور انہوں نے لیلیٰ خواجہ بانو کو ایک خط لکھا۔ اس خط کی چند سطور ملاحظہ فرمائیں:

''مہربانی کر کے بہت جلد مطلع کرو، بدنصیب لڑکی کون ہے... ؟ تمھیں چاہیے اگر ممکن ہو تو شکستہ دل لڑکی سے ملو، اسے تسکین دو...''

30 جون 1919 کو ایک اور خط میں لکھتی ہیں:

''حیرت ہے کہ لڑکی کے خاندان میں منگنی کی بیوہ نکاح نہیں کر سکتی۔ یہ تو بڑے اندھیر کی بات ہے۔ ہر لڑکی کے خیالات یکساں نہیں ہوتے، یہ نامراد رواج بہت سی نوجوان عورتوں کا قاتل بن سکتا ہے۔''

یوں تو یہ خط کافی طویل ہے لیکن یہاں چند سطور ہی قلم بند کی گئی ہیں۔ خط کا مضمون ایک درد مشترک ہے جو شروانیہ کے نوک قلم پر آ گیا ہے۔ 'منگیتر کی بیوہ' کی مسماری کو وہی لڑکی بخوبی سمجھ سکتی ہے جو خود اس کرب سے گزری ہو۔ سماج میں رائج قبیح روایات سے شروانیہ ہمیشہ نالاں رہیں اور قلم سے مسلسل احتجاج کرتی رہیں۔

خطوط نویسی شروانیہ کی تخلیقی شخصیت کا ایک اور توانا پہلو ہے۔ یوں تو ان کا حلقۂ احباب وسیع نہ تھا مگر ان کی تخلیقی شخصیت سے متاثر ہو کر دور دراز کی خواتین ان سے خط و کتابت اور روابط کی متمنی رہتی تھیں لیکن شروانیہ کا رویہ اس سلسلے میں بہت محتاط تھا۔ وہ انجان لوگوں سے روابط نہیں بڑھانا چاہتی تھیں۔ انہوں نے اپنی زندگی میں جن دو خواتین کو خطوط لکھے ان میں سب سے پہلا اور اہم نام رابعہ سلطانہ بیگم' اہلیہ میر طاہر علی، دکن حیدرآباد کا آتا ہے، ز۔خ۔ش ان کو پابندی سے خط لکھا کرتی تھیں۔ خط و کتابت اور تعلقات کا یہ سلسلہ رابعہ سلطانہ بیگم کی وفات تک قائم رہا۔ ان کی دوسری مخلص دوست محمودہ بیگم عرف لیلیٰ خواجہ بانو صاحبہ (اہلیہ حضرت خواجہ حسن نظامی) تھیں۔ یہ دوبار برائے ملاقات'' قلعہ ظفر منزل'' بھی تشریف لائی تھیں۔ رابعہ سلطانہ بیگم کے گزر جانے کے بعد لیلیٰ خواجہ بانو سے ہی شروانیہ کی خط و کتابت رہتی تھی۔ لیلیٰ خواجہ بانو نے ز۔خ۔ش کی وفات کے بعد اپنے ایک مضمون میں لکھا تھا:

''انھوں نے مجھے خطوط کے ذریعہ سیاسی عقائد کے بہت سے سبق پڑھائے۔''

ز۔خ۔ش کے وہ سارے خطوط جو انہوں نے اپنی ان خاص دوستوں کو لکھے ہیں ان کی ذات و شخصیت کا آئینہ ہیں۔ دراصل ذاتی نوعیت کے خطوط میں انسان اپنی داخلی کیفیات، جذبات اور احساسات اس کو سونپ رہا ہوتا ہے جس پر اسے یہ یقین اور اعتماد ہو کہ راز منتقل ہونے کے بعد افشا نہیں ہوگا۔ لیلیٰ خواجہ بانو کو لکھے گئے شروانیہ کے خطوط کے بارے میں ڈاکٹر فاطمہ حسن اپنی تحقیقی کتاب 'زخ ش: حیات وشاعری کا تنقیدی جائزہ' کے دیباچے میں لکھتی ہیں:

''دوران تحقیق ز۔خ۔ش کے دو سو سے زائد ایسے خطوط مجھے دستیاب ہوئے، جو 1916 سے اپنی وفات تک لیلیٰ خواجہ بانو زوجہ خواجہ حسن نظامی کو انھوں نے لکھے تھے۔ لیلیٰ خواجہ بانو ان کی ہم عمر تھیں اور ان سے خاندانی مراسم کی وجہ سے خط و کتابت میں بے تکلفی تھی۔ چنانچہ ان کو لکھے جانے والے خطوط میں وہ ز۔خ۔ش پوری سامنے آتی ہیں جو علم و آگہی رکھتی تھیں، سوچتی اور محسوس کرتی تھیں اور ادراک و شعور کی اعلیٰ منزلوں کی طرف گامزن تھیں۔ انھوں نے ان خطوط میں اپنے عہد کے ہر مسئلے، قوم کے ہر عمل پر اپنے خیالات کا نہ صرف اظہار کیا ہے بلکہ ان مسائل کی طرف رہنمائی بھی کی ہے۔ ان خطوط سے ان کی شاعری کے سیاق و سباق اور فکری گہرائی کو سمجھنے

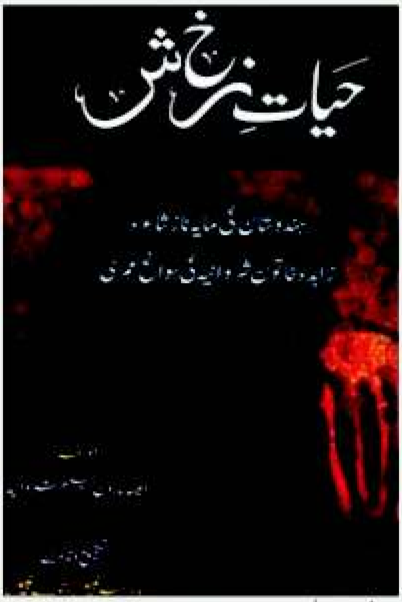

میں بھی مدد ملتی ہے اور اس دور کے سیاسی اور سماجی حالات کی مکمل تصویر سامنے آتی ہے۔''[8]

شروانیہ کے مضامین بھی بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ ہندوستان سے شائع ہونے والے اس وقت کے معیاری اردو رسائل اور اخبارات مثلاً تہذیب نسواں (لاہور) زمیندار (لاہور) شریف بی بیاں (لاہور) خاتون (علی گڑھ) نظام المشائخ (دہلی)، عصمت (دہلی) میں ان کی تحریریں شائع ہو کر ملک کے عوام تک پہنچتی تھیں۔ شروانیہ صرف ایک تخلیق کار ہی نہیں مصلح قوم بھی تھیں سو معاشرے کی فلاح کے لیے انھوں نے اپنے مضامین اور نظموں کا سہارا لیا اور اپنی آواز اپنی قومی بہنوں تک پہنچائی، انھیں تعلیم کے تئیں بیدار کیا، ان کی اصلاح کی اور خانگی ذمے داریوں کا بھی احساس دلایا۔ کیا ہی اچھا ہو کہ ان مضامین پر بھی تحقیقی کام ہو جائے یا کم از کم کوئی ادبی تحقیقی ادارہ کتب خانوں سے اردو رسالوں کی پرانی فائلوں سے ان مضامین کو نکال کر یکجا کر دے۔

جب کہ ز۔خ۔ش کا ادبی قد اتنا بلند اور معتبر ہے کہ اردو زبان و ادب کی تاریخ ان کو کبھی فراموش نہیں کر سکے گی۔ بالخصوص شاعری میں ان کا مقام اپنے معاصرین میں امتیازی حیثیت کا حامل ہے۔ فطرت، جمالیات اور تصوف نیز شاعری اور نثری مضامین میں آیات قرآنی اور احادیث کے حوالے ان کے کلام کے وہ اوصاف ہیں جو بڑے بڑوں کو ایک عمر کی ریاضت کے بعد نصیب ہوئے ہیں، اتنی کم عمر میں اس کمال کو پہنچنا واقعی ایک معجزہ ہے۔

■

Dr. Afshan Malik
Azeem State 2
New Sir Sayyed Nagar
Aligarh - 202002 (UP)

لعل و گہر

غضنفر اقبال

مہرِ دکن جے پی سعید

دکن کے نغز گو شعرا میں جے پی سعید مہرِ سخن تھے۔ انھوں نے یکم مارچ 1932 کو اورنگ آباد دکن میں مولوی قاضی محمد وزیرالدین اور جمیل النساء بیگم کے گھر آنکھیں کھولیں۔ والدین نے قاضی غوث محی الدین احمد صدیقی نام رکھا۔ گھر کے دیگر افراد خاندان نے محبت سے جیلانی پاشاہ عرفیت رکھی۔ اور وہ موقر سخنور حمایت علی شاعر کے تجویز کردہ اسمِ گرامی جے پی سعید سے تعلیمی و ادبی دنیا میں شہرت رکھتے ہیں۔ ان کے والدِ بزرگوار وزیرالدین اورنگ آباد دکن کے ممتاز قانون داں تھے۔ وہ ادب و شعر کا ستھرا ذوق رکھتے تھے۔ انھوں نے اپنے لائق و فائق فرزند جے پی سعید کو کم عمری میں ہی پند نامہ سعدی، گلستان، بوستان اور پند نامہ عطار سے سبق آموز اشعار اور حمد، نعت اور چھوٹی چھوٹی نظمیں ازبر کروائی تھی۔ ان سے احباب کے سامنے سنانے کا التزام وزیرالدین کیا کرتے۔ والد کے اس عمل کا یہ نتیجہ نکلا کہ جے پی سعید شعر کہنے کی طرف مائل ہو گئے۔

جے پی سعید کی لیاقتِ تعلیمی ایم اے (اردو) ایم اے (فارسی) اور بی ایڈ تھی۔ انھوں نے جس زمانے میں ڈاکٹر امبیڈکر کے قائم کردہ ادارے ملند ڈگری کالج اورنگ آباد سے بی اے کیا تھا۔ جے پی سعید کی گذارش پر بابائے دستور ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر نے دستورِ ہند کے زیرِ عنوان چار توسیعی خطبات دیے تھے، جو تاریخ ملند کالج میں بابا صاحب کے خطبے سنہری حروف سے لکھے گئے ہیں۔ عصری تعلیم کو مکمل کرنے کے بعد جے پی سعید کا تقرر اورنگ آباد دکن کے باوقار ادارے مولانا آزاد ہائی اسکول میں 1956 میں بہ حیثیت مدرس ہوا۔ وہ 1974 سے 1990 میں سبکدوش ہونے تک میرِ معلم رہے۔ ان کے اساتذہ میں حضرت یعقوب عثمانی اور پروفیسر سید مبارزالدین رفعت سرِفہرست ہیں۔ جے پی سعید ایک مثالی مدرس گذرے ہیں۔ ان کو علاقہ اورنگ آباد میں شمس الاساتذہ سے جانا اور مانا گیا۔ ان کی تدریس کی ایک خوبی یہ تھی کہ وہ جماعت میں بغیر کتاب دیکھے نظم سناتے اور اشعار کی تشریح کرتے۔ وسعتِ مطالعہ نے ان میں ایسی نظر پیدا کر دی تھی کہ نصاب کی کتابوں میں در آنے والی اغلاط کی نشاندہی بھی کرتے جاتے جس پر طلبہ حیران رہ جاتے۔ ان کے تلامذہ نے بھی علم و ادب میں نام کمایا۔ جے پی سعید کے لیے سخنوری ایک مشغلہ تھی۔ وہ بے مقصد شعر نہیں کہتے تھے۔ ان کا ایقان تھا۔

ہو نظر میں شاعر کی مقصدِ سخن گوئی
صرف قافیوں پر ہی شاعری نہیں ہوتی

بابائے اُردو مولوی عبدالحق کی اورنگ آباد سے مراجعت کے بعد اورنگ آباد میں ادبی فضا پر ایک جمود سا طاری ہوا تھا۔ اس جمود کو توڑنے کے لیے چند انجمنیں بزم رنداں، اور انجمن نوجوانانِ اورنگ آباد معرضِ وجود میں آئیں۔ اس وقت جے پی سعید نے 20 فروری 1955 کو شعر و نغمہ کی مشعل کو روشن رکھنے کے لیے 'مطلع ادب' قائم کی تھی۔ مطلع ادب کے زیرِ اہتمام منعقدہ محافل میں اورنگ آباد کے فن کار شریک ہوتے اور اپنے مشوروں سے تخلیق کاروں کو مستفید کرتے رہتے تھے۔ انھوں نے مطلع ادب کے اجلاس میں اپنی اولین غزل پڑھی تھی جس کی ان کے اتالیق محترم یعقوب عثمانی نے حوصلہ افزائی کی۔ مطلع ادب کے میرِ کارواں کے مطلع کو بار بار پڑھوایا گیا تھا۔ مطلع یہ تھا۔

شکست و فتح مقابل سے بے نیاز تو ہے
یہ فیضِ دار و رسن عشق سرفراز تو ہے

ان کی اولین غزل روز نامہ سیاست حیدر آباد دکن میں اُستاد شاعر حضرت نذیر علی عدیل کے نوٹ کے ساتھ شائع ہوئی تھی۔ نوٹ میں شاعر کو مشقِ سخن جاری رکھنے کی ترغیب دی گئی تھی۔ جے پی سعید نے 'مطلع ادب' کے اجلاس میں پڑھے گئے پانچ افسانہ نگاروں، الیاس فرحت، رفعت نواز، رشید انور، غوث ساجد اور محمود شکیل کے افسانوں کا انتخاب 'جستجو' کے عنوان سے اپنے عزیز دوست اور ہم زلف قاضی متین الدین سے مرتب کروایا تھا۔ کتاب 'جستجو' مئی 1967 میں انطباع پذیر ہوئی تھی۔ جے پی سعید نے کتاب 'جستجو' پر روشنی ان لفظوں میں ڈالی تھی:

''زیرِ نظر (جستجو) افسانے مطلع ادب کے فن کاروں کی کاوشوں کا نتیجہ ہیں۔ ان کے معیاری ہونے کی تصدیق تو قارئین کرام خود ہی کریں گے۔ لیکن یہاں یہ تذکرہ بے محل نہ ہوگا کہ ادب صرف توصیف و تنقیص کا خواہاں نہیں ہے۔ بلکہ عملی حوصلہ افزائی کا بھی مستحق ہے۔''

جے پی سعید کے دو شعری مجموعے 'گل گشت' (1986) اور 'شاخِ گل' (2007) نے اشاعت کے مراحل طے کیے ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے زبان فارسی کی دو مشہور کتابوں مجالس کلیمی و احسن الشمائل (2003) اور مکتوبات کلیمی (2008) کو بامحاورہ سلیس زبان اُردو میں منتقل کیا تھا۔ وہ ماہرِ عروض، منفرد قطعۂ تاریخ اور معتبر خطاط تھے۔

77 برس 8 ماہ 23 دن عالمِ فانی میں بسر کرنے کے بعد ان کی روح 24 نومبر 2009 کو قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ وہ بیرون پٹن دروازہ قبرستان اورنگ آباد میں آسودۂ خواب ہیں۔ ان کے سانحہ انتقال کے بعد میونسپل کارپوریشن اورنگ آباد نے مولانا آزاد ہائی اسکول کی روڈ کو جے پی سعید روڈ کے نام سے موسوم کیا۔ بقول جے پی سعید

میں نہ تھا تو تنہا تھا، میں نہیں تو تنہا ہے
کل بھی وہ اکیلا تھا، آج بھی اکیلا ہے

جے پی سعید نے اصنافِ شعر میں غزل کے علاوہ حمد، نعت، قطعات، رباعی، مرثیہ اور نظم میں طبع آزمائی کی جس

پر ان کے اپنے دستخط موجود ہیں۔ان کی غزل میں شاعرانہ لطافت تازگی اور رعنائی پائی جاتی ہے۔انھوں نے غزل میں روایت اور درایت کا حسین امتزاج پیش کیا تھا جے پی سعید نے کہیں لکھا ہے:

''میں غزل میں روایت کو اہمیت دیتا ہوں۔حال ماضی کے بطن سے پیدا ہوا ہے اور مستقبل حال کے بطن سے جنم لے گا۔ماضی سے بغاوت تو اپنے ورثہ سے بغاوت ہوگی جس پر ہمیں فخر ہے۔''

جے پی سعید نے غزل میں چند تجربے کیے تھے۔غزل میں مرحوم نے قوافی کی تلاش کو اہم جانا تھا۔مثال کے طور پر انھوں نے ایک غزل کہی تھی جس کے قافیے کافر، تاجر، مظاہر، شاعر، ایک اور غزل کے قافیے سخاوت، کہاوت، ذکاوت، مہارت۔اسی طرح ایک اور غزل میں امارت، تجارت، جسارت اور حرارت وغیرہ۔ان کے بعض اشعار میں تشبیہ، استعارہ، تضاد، مراعات النظیر کا استعمال ملتا ہے۔جے پی سعید کے کلام میں بھرپور تخلیقی بہاؤ تھا۔انھوں نے آداب فن کی پاس داری کرتے ہوئے غزل کو فکر وخیال کی پاکیزگی عطا کی تھی۔

گھر میں روشنی کر لو تم چراغ دولت سے
اس چراغ سے دل میں روشنی نہیں ہوتی
جہاں چھوڑا تھا تو نے وقتِ رخصت
وہیں پر زندگی ٹھہری ہوئی ہے

سب سے چھپ کر ترا غم دل سے لگایا اے دوست
کام اچھے بھی کیے ہم نے گناہوں کی طرح

ہزاروں میں کوئی ہوتا ہے بختاور زمانے میں
بنے مٹی سے سونا سب کی یہ قسمت نہیں ہوتی

تری صورت ہے ہر صورت سے بہتر
بڑی پُرکار تیری سادگی ہے

جے پی سعید شعری ادب، روایت، صورت کاری اور اسلوب سے واقف تھے۔اسی لیے ان کی غزلوں میں کلاسیکی رنگ نمایاں ہے۔پروفیسر حمید سہروردی لکھتے ہیں:

''جے پی سعید غزل کی روایت سے واقف ہیں۔اپنی شعری روایت کے تلازموں کا وہ نئے عہد پر انطباق کرتے ہیں۔''

جے پی سعید کو شعری روایات عزیز تھیں۔وہ اپنے احساسات و واردات کا اظہار رموز و علائم کے پردے میں کرتے تھے۔ان کے بہت سے اشعار روانی و برجستگی اور سادگی و پرکاری کے سبب متوجہ کرتے ہیں۔ان کلام میں تاثیر کی چاشنی اور درد کی خفیف سی چبھن ہے۔انھوں نے اپنے کلامِ شوق میں پرانی بات کو نیا انداز دیا ہے۔جے پی سعید لکھتے ہیں:

''یہ صحیح ہے کہ نئی بات کہنا مشکل ہے لیکن پرانی بات کو نئے انداز سے پیش کرنا بھی جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔روایت سے ایک احترام آمیز انحراف شاید شاعری میں نئی راہیں کھولنے کا ذریعہ بن سکتا ہے۔''

جے پی سعید کی شاعری میں دل آویزی اور دلکشی کا احساس ہوتا ہے۔کیوں کہ ان کے ہاں فکر کے ساتھ ساتھ فن کا بھی بہت نکھرا ہوا شعور ملتا ہے۔انھوں نے پرانی شاعرانہ روایات کو صحت مند اقدار کی روح میں جذب کر لیا تھا۔خوش آہنگ لفظوں سے طرز بیان کو حسن و تاثر کی وسعت عطا کی۔

دل کے غم کدے میں کیوں ہو گذر اندھیرے کا
ایک شمع بجھتی ہے ایک شمع جلتی ہے
سب اُداسی کا میری تو سب نے پوچھا ہے
مگر نگاہِ دل درد آشنا ہے الگ
اور بڑھ جاتی ہے کچھ دامن دل کی وقعت
جب ترے اشکوں سے دامن مرا نم ہوتا ہے

جے پی سعید کو زبان پر دستگاہ اور طبیعت میں روانی تھی جس کی وجہ سے زندگی کی حقیقت کو خارجی دباؤ قبول کیے بغیر شعر میں سمو دیتے تھے۔وہ اپنی تخلیقی صلاحیت اور جمالیاتی شعور کو قادرالکلامی کے ذریعے برجستگی اور بے ساختگی سے کلام میں پیش کر دیتے تھے۔

اک ہمیں تھے کہ رہے پوچھتے سب کے احوال
خیریت اپنی کوئی پوچھنے والا کب تھا
آج کا روز بھی الجھن میں گذرا، کل بھی
وہی ہم ہوں گے، وہی اپنے مسائل ہوں گے

جے پی سعید نے کیفی اعظمی، سکندر علی وجد، قاضی سلیم، ڈاکٹر عصمت جاوید، اختر الزماں ناصر کی قطعاتِ تاریخ وفات لکھی۔قطعۂ تاریخ وفات میں ان کا طرز سخن اچھا اور سچا تھا:

رفت راہِ جاوداں قاضی سلیم
ہیں مکیں لامکاں قاضی سلیم
سالِ رحلت ہے یہ ہجری میں سعید
کہیے عمر جاوداں قاضی سلیم

کون ہے دنیا میں لافانی یہاں
نام ہے کسی کا جاوداں
سالِ ہجری میں ہے یہ تاریخ وجد
شاعرِ خوش فکر مقبولِ جہاں

تھے وہ اپنی ذات میں بحر العلوم فکر و فن
نعمت علم و عمل بھی ان کو خالق سے ملی
جستجو تھی سالِ رحلت کی جو ہجری میں سعید
عصمت جاوید محبوب خلائق سے ملی

جے پی سعید کا کلام ان کے شعری ذہن کی پیداوار ہے، جس میں پند اور نصیحت کا اظہار بیان منازل اعلیٰ کا آئینہ دار ہے۔ان کی شاعری میں تازہ گوئی اورنگ آباد کے ادبی ماحول کی دین ہے۔اسی ماحول نے شاعر کو فنی و شعری مزاج کی شناخت بخشی ہے۔

میدان نثر میں جے پی سعید کا مضمون اپنے دیرینہ کرم فرما ڈاکٹر عصمت جاوید مرحوم پر خاکہ یادگار ہے۔'میں اور میرا فن' میں جے پی سعید نے جامع انداز میں اپنی باتیں لکھ دی ہیں۔معروف خاکہ نگار احمد اقبال کی کتاب 'میرا شہر میرے لوگ' پر تاثرات کے علاوہ ان کی ایک اور تحریر' سال نو' پر ہے جو آکاشوانی اورنگ آباد پر بھی سے نشر ہوئی تھی۔بعد میں آکاش وانی کے ترجمان 'آواز نئی دہلی' میں یکم جنوری 1981 کو شائع ہوئی تھی۔مذکورہ تحریر میں نثر نگار خیال انگیز بات لکھتے ہیں:

''یہ بات بھی فطرتِ انسانی میں شامل ہے کہ جب وہ اپنے ماضی کا موازنہ حال سے کرتا ہے تو اُسے اپنا ماضی ہی بہتر نظر آتا ہے۔''

جے پی سعید، ملک عنبر اورنگ زیب عالم گیر کے شہر اورنگ آباد دکن کی آبرو تھے۔ان کے شاعرانہ مزاج، تخلیقی اُپج اور فکری کاوش اُردو قلم کاروں کے ذہن و قلب میں ہمیشہ تازہ رہے گی۔بقول جے پی سعید

مری نوا سے ہم آہنگ ہوں گے کیوں کر ساز
سماع خانے میں ہے منفرد مری آواز

■

Dr. Ghazanfar Iqbal
"SAIBAN" Zubair Colony,
Hagarga Cross, Ring Road , GULBARGA-585104
(Karnataka), INDIA
Cell:09945015964Email:ghazanfaronnet@gmail.com

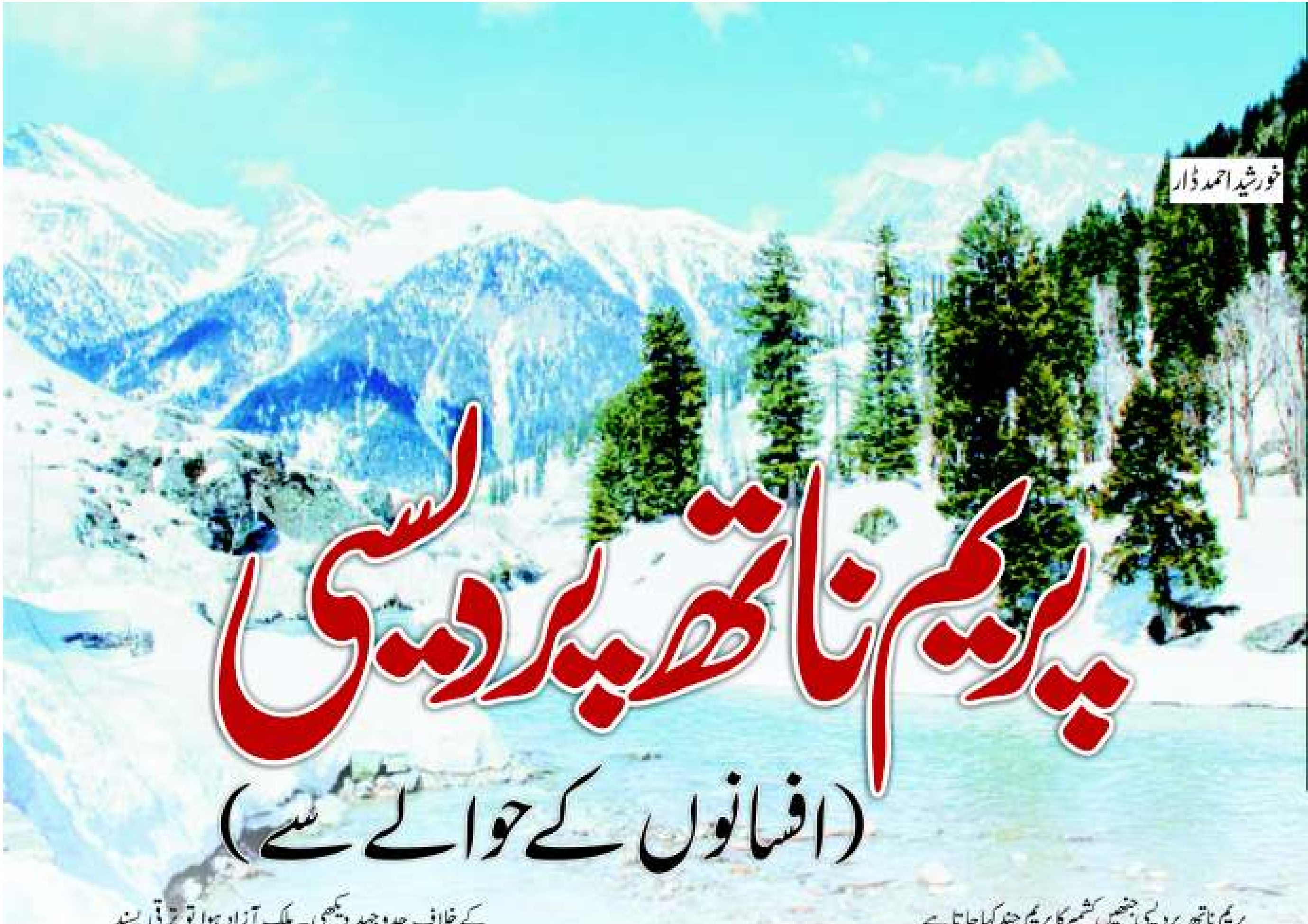

خورشید احمد ڈار

پریم ناتھ پردیسی

(افسانوں کے حوالے سے)

پریم ناتھ پردیسی جنھیں کشمیر کا پریم چند کہا جاتا ہے سرینگر کے علاقے فتح کدل میں 1909 میں کشمیری پنڈتوں کے ایک متوسط خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کا اصل نام مدھوسودن تھا اور والد کا نام پنڈت مہادیو کول سادھو تھا جو ایک سرکاری ملازم تھے۔ باغ دلاور خان سے 1925 میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ تعلیم حاصل کرنے کا بے حد شوق تھا لیکن بچپن میں ہی والد کا سایہ سر سے اٹھنے کے سبب تعلیم کو ترک کرنا پڑا۔ جس کا ان کو عمر بھر افسوس رہا اور کم عمری میں شادی بھی ہوگئی۔ 32-1931 میں وہ محکمہ چنگی میں اسسٹنٹ انسپکٹر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ پریم ناتھ پردیسی کی پیدائش ایک ادب نواز گھرانے میں ہوئی تھی۔ دادا پنڈت مکندل کول صاحب ایک عالم تھے۔ اردو اور فارسی ادبیات سے دلچسپی رکھنے کی وجہ سے ان کے یہاں علم و ادب کی محفلوں کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ دادا جان کی ان ادبی محفلوں میں پردیسی بھی حصہ لیا کرتے تھے اور بزرگوں کی باتیں اور مباحث غور سے سنا کرتے تھے اپنے سوانحی مضمون میں یوں لکھتے ہیں:

''میں ان دنوں چھوٹا تھا اور دادا جان کی چلم پر آگ رکھنے کی ڈیوٹی میرے ذمہ رکھی گئی تھی۔ میں ایک کمرے میں بیٹھا ان بزرگوں کی بحثیں توجہ اور دلچسپی سے سنا کرتا تھا اور متاثر ہوتا تھا۔ کبھی کبھی میں سوچتا تھا کہ کہانی لکھنا کیا مشکل کام ہے۔ میں ضرور کہانیاں لکھوں گا۔

> پریم ناتھ پردیسی انسانی فطرت کے نبض شناس ہیں۔ انہوں نے خاص طور پر انسان کے جبلی وجود کو مرکز نگاہ بنایا ہے۔ اردو افسانہ نگاروں میں پردیسی جس گہرائی اور ژرف بینی سے بعض مخصوص حالات میں انسانی جبلتوں کی کارکردگی کو اپنے افسانوں کا موضوع بناتے ہیں اس کی مثال کم ملتی ہے۔

لیکن دوسری مجلس میں جب شاعری پر بحث ہوتی تھی اور تڑپانے والے شعر سنائے جاتے تھے تو میرا ارادہ بدل جاتا اور میں شاعر بننے کی خواہش کرتا۔ مجھے آج تک یاد ہے کہ جب ایک صاحب نے منشی پریم چند کی کہانی 'بوڑھی کاکی' سنائی تو میں ساری رات اس کی بے بسی پر روتا رہا۔''

(ماہنامہ افسانہ الہ آباد، شمارہ نمبر 81، ص 6)

سن شعور تک پہنچنے کے بعد پردیسی نے ڈوگرہ شاہی کے خلاف جدوجہد دیکھی۔ ملک آزاد ہوا تو ترقی پسند قائدین نے کلچرل فرنٹ کی بنیاد رکھی۔ پردیسی بھی اس کے اہم اراکین میں شامل تھے۔ اس تحریک سے وابستہ ہونے کے بعد ان کی ادبی زندگی میں ایک نیا موڑ آیا۔ شروع میں شاعری کرتے تھے۔ لالہ ملک راج کی ادارت میں ریاست جموں و کشمیر کا پہلا اخبار 'رنبیر' 1924 میں شائع ہوا تو اس اخبار کے لکھنے والوں میں پریم ناتھ پردیسی بھی شامل تھے۔ رونق کے تخلص سے وہ لکھتے رہے لیکن بعد میں انھیں شاعری کا میدان راس نہ آیا اور انھوں نے 1924 سے 1932 تک جو شاعری کی اس کو ترک کر کے نثر کی طرف متوجہ ہوئے۔

دراصل شاعری کا فن، نظم وضبط، تکنیک کی پابندیاں پردیسی کی بے چین اور آزاد طبیعت کے مطابق نہ تھیں، اس لیے شاعری کو انھوں نے خیر باد کہا۔ پریم ناتھ پردیسی اب رونق کا تخلص ترک کر کے پردیسی کے قلمی نام سے لکھنے لگے۔ انھوں نے حب الوطنی پر مبنی کئی ترانے لکھے۔ شروع شروع میں وہ 'ادب برائے ادب' کے قائل تھے۔ شاعری کی طرح ان کی ابتدائی کہانیوں میں حقیقت نگاری سے دور رومان اور جذبات کے مناظر نظر آتے ہیں۔ مشہور خاتون افسانہ نگار صدیقہ بیگم سیوہاروی کے نام اپنے ایک خط میں پریم ناتھ پردیسی نے لکھا ہے:

''1933 سے 1938 تک جو کچھ میں نے لکھا اس

پر فخر نہیں کرسکتا۔ اس وقت تک مجھے احساس نہیں تھا کہ ایک افسانہ نگار ہونے کی حیثیت سے مجھ پر وطنِ عزیز کے کیا فرائض ہیں۔ اس وطن کے جس کے چالیس لاکھ باشندے پونے سو سال سے غلام در غلام چلے آرہے ہیں۔ جس کی جڑیں افلاس اور لوٹ کھسوٹ سے کھوکھلی ہو چکی ہیں۔''

(بحوالہ شیرازہ، جموں وکشمیر میں اردو افسانہ نمبر، جلد 52، شمارہ 11-12، ص 102)

پریم چند کا افسانہ 'کفن' اور اسی دور میں 'انگارے' جس میں کئی افسانہ نگاروں کے افسانے شائع ہوئے۔ ان افسانوں کا مطالعہ کرکے پردیسی کے رجحان میں ایک بہت بڑی تبدیلی رونما ہوئی۔ کیونکہ اس دور میں پریم چند مثالیت پسندی کو چھوڑ کر حقیقت نگاری کی طرف مائل ہوئے تھے اور نئے فنی تصورات اور امکانات کے ساتھ معاشرتی اور سیاسی زندگی کو اپنے افسانوں میں پیش کرنے کا سلسلہ شروع کرچکے تھے۔ دوسری جانب یلدرم، سلطان حیدر جوش اور مجنوں تخلیقی اور جذباتی افسانے لکھ رہے تھے جس کا اثر اکثر ابھرتے نوجوان افسانہ نگاروں میں نظر آرہا تھا کیونکہ رومان ان کی زندگی کا تقاضا تھا۔ پردیسی بھی نئے شعور کے طلوع ہونے کے ساتھ رومانی انداز سے ہٹ کر کشمیر اور کشمیر کے محنت کش عوام اور خاص طور پر نچلے طبقے کے لوگوں کی ترجمانی کرنے لگے۔

انھوں نے کشمیر کے حسین مناظر، یہاں کے انسانوں کی ذہانت، ان کی زندگی کے نشیب و فراز اور انسانی نفسیات کی تہوں کو کھولنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

بقول پروفیسر حامدی کاشمیری:

''پردیسی کی نظر اردو افسانوی ادب اور اس کے اسالیب و موضوعات پر تھی۔ انھوں نے اپنے ذہنی رویے میں تبدیلی پیدا کی اور اہلِ کشمیر کے گھریلو، سیاسی، سماجی اور نفسیاتی مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔''

(ریاست جموں وکشمیر میں اردو ادب: حامدی کاشمیری، ص 81)

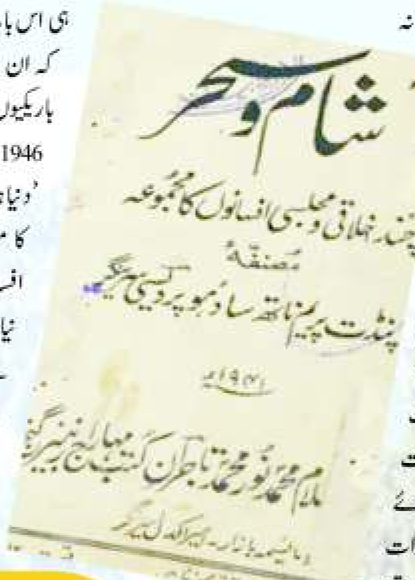

پردیسی کے تین افسانوی مجموعے 'شام وسحر'، 'دنیا ہماری' اور 'بجھتے چراغ' چھپ چکے ہیں۔ تیرہ افسانوں پر مشتمل پہلا افسانوی مجموعہ 'شام وسحر' 1941 میں شائع ہوا۔ جس میں 'پارسل'، 'ماں کا پیار'، 'راجو کی ڈولی'، 'سنتوش'، 'بے کارا' جیسے افسانے شامل ہیں جو اس وقت کے مقامی اخبار 'مارتنڈ' میں شائع ہوتے رہے۔ جیسا کہ ذکر ہوا کہ ان افسانوں میں حقیقت نگاری سے دور رومان اور جذبات کے مناظر نظر آتے ہیں لیکن ساتھ ہی اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ ان افسانوں میں انسانی نفسیات کی باریکیوں کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

1946 میں آپ کی کہانیوں کا دوسرا مجموعہ 'دنیا ہماری' منظر عام پر آیا۔ ان افسانوں کا موضوع اور اسلوب پہلے دور کے افسانوں سے مختلف ہے۔ ان میں نہ نیاز کی رومانیت کا عکس دیکھنے کو ملتا ہے اور نہ ہی ٹیگور کا رنگ جھلکتا ہے۔ اس مجموعے کے پیش لفظ میں اردو کے مشہور و معروف افسانہ نگار راجندر سنگھ بیدی رقمطراز ہیں:

''یہ کہانیاں 'شام و سحر' کی کہانیوں سے بہتر ہیں۔ یہ کہانیاں پردیسی کے بدلتے ہوئے شعور کی نشاندہی کرتی ہیں۔ یہاں نہ کوئی غصہ، نہ کوئی جوش اور نہ ہی کوئی تلملاہٹ نظر آتی ہے۔ ان کہانیوں کی بنیادی خصوصیت انسانی نفسیات کا ادراک، انسانی دکھ کا احساس اور مصنف کا ہمدردانہ رویہ ہے۔ زبان و بیان انتہائی سادہ ہے۔ نہ وہ شاعرانہ اسلوب ہے جو اس سے قبل کے ان کے افسانوں کا امتیاز تھا۔ یہ افسانے اپنی معصومیت اور سادگی کی بناء پر ٹالسٹائی کی یاد دلاتے ہیں۔ ان کہانیوں میں ہمیں کسی گہرے فلسفے دوراز کار تخیل ان دونوں چیزوں سے وابستہ نکات کو دیکھنے کی دعوت نہیں دی گئی ہے۔ جو کچھ کہا گیا ہے محسوس کرکے کہا گیا ہے اور برملا کہا گیا ہے۔ نہ ہی ان میں کوشش کی گئی ہے کہ مقام اوج کو کھینچ کر آخری سطر میں لایا جائے تاکہ مصنف کسی دوسرے ٹکرے پر بیٹھ کر پڑھنے والے پر مسکرا سکے۔ (دنیا ہماری: پریم ناتھ پردیسی، ص 6)

پردیسی کے اس مجموعے کی بیشتر کہانیاں ہیئت اور موضوع کے اعتبار سے اپنی الگ اور منفرد شناخت رکھتی ہیں۔ یہ کہانیاں انھوں نے نہایت غور و خوض کے بعد قلمبند کی ہیں۔ ان کے مطالعے اور مشاہدے کا خلوص ان میں ملتا ہے۔ یہ پردیسی کے سکون، متانت اور شرافت نفس کی آئینہ دار ہیں۔ لیکن ان کی تہہ میں ایک زوردار طوفان کے آثار واضح طور پر نظر آتے ہیں۔

1947 کے آس پاس پریم ناتھ پردیسی کی افسانہ نگاری کا آخری دور شروع ہوتا ہے۔ سرکاری ملازمت سے وابستہ ہونے کے سبب وہ کھلے عام سیاسی سرگرمیوں میں عمل دخل نہیں کرسکتے تھے اور نہ ہی ایسے افسانے تخلیق کرسکتے تھے کہ جن میں براہ راست سرکار کو نشانۂ ملامت بنایا جاسکتا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے انھوں نے فرضی نام اختیار کیے پردے کی آڑ میں عوام کو اپنی کہانیوں کے ذریعے غلامی، افلاس اور استحصال کا احساس دلاتے رہے اور سماج کے برے عناصر کے خلاف اپنی آواز بلند کرنے کا جذبہ پیدا کرتے رہے۔ اس دور میں انھوں نے علائی، بابو، بالک رام باری وغیرہ فرضی نام استعمال کیے۔

پردیسی کے تین افسانوی مجموعے 'شام وسحر'، 'دنیا ہماری' اور 'بجھتے چراغ' چھپ چکے ہیں۔ تیرہ افسانوں پر مشتمل پہلا افسانوی مجموعہ 'شام و سحر' 1941 میں شائع ہوا۔ جس میں 'پارسل'، 'ماں کا پیار'، 'راجو کی ڈولی'، 'سنتوش'، 'بے کارا' جیسے افسانے شامل ہیں جو اس وقت کے مقامی اخبار 'مارتنڈ' میں شائع ہوتے رہے۔ جیسا کہ ذکر ہوا کہ ان افسانوں میں حقیقت نگاری سے دور رومان اور جذبات کے مناظر نظر آتے ہیں لیکن ساتھ ہی اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ ان افسانوں میں انسانی نفسیات کی باریکیوں کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

پردیسی کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ 1955 میں 'بہتے چراغ' کے نام سے شائع ہوا۔ اس آخری افسانوی مجموعہ کے منظرِ عام پر آنے کے وقت وہ اس سرائے فانی کو خیر باد کہہ چکے تھے۔ اس میں بیس افسانے شامل ہیں۔ اور یہ ایک حساس، بے دار دماغ اور منجھے ہوئے تخلیق کار کا احساس دلاتے ہیں۔ ہندوستان کے کسان کو جس طرح پریم چند نے اپنے آخری دور کی تحریروں سے زبان عطا کی۔ پردیسی نے بھی ٹھیک اسی طرح ان افسانوں میں کشمیری عوام کی بدنصیبی، غلامی، افلاس اور ان کے اصل مزاج اور تیور، ان کی سادگی اور شرافت، ان کے عادات اور خصائل، ان کی مظلومیت اور احساسِ بغاوت کی عکاسی پورے خلوص اور دیانت داری کے ساتھ کی ہے۔ اس بارے میں خود پردیسی صاحب لکھتے ہیں:

''کشمیر کا بدنصیب باشندہ خود ایک افسانہ ہے جس کی طرف کسی نے توجہ نہ دی۔ باہر کے چند نامور افسانہ نگاروں نے کچھ کہانیاں ضرور لکھیں مگر وہ بھی غلط انداز میں.......... یہاں پر سب سے بڑا مسئلہ غلامی ہے، افلاس ہے۔''

(رسالہ، بازیافت، جشن زرین نمبر، کشمیر یونیورسٹی، شمارہ نمبر دسمبر 2007، ص 144)

پریم ناتھ پردیسی کشمیری عوام کی دلی تمناؤں اور خواہشات کو محسوس کرتے اور روانی کے ساتھ پیش کرکے قاری کا تجسس برقرار رکھتے ہیں۔ ان کو اس بات کا شدت سے احساس تھا کہ ریاست کے باہر سیاح اور ادیب کشمیر کے صرف ایک ہی پہلو 'حسین منظر' کو دیکھتے ہیں۔ اس بات کی طرف کوئی دھیان نہیں دے رہا ہے کہ یہاں کے عوام کئی مشکلات و مصائب سے دوچار ہیں۔ اس نقطے کو اجاگر کرنے کے لیے انھوں نے اپنے فن کو آگے بڑھایا۔ کشمیر میں پھیلے خوف و ہراس اور اجڑے ہوئے منظر کو کیسے لطیف پیرائے میں انھوں نے اپنے ایک افسانے 'نئی سڑک' میں اجاگر کیا ہے۔ اس کا اندازہ افسانے کے مندرجہ ذیل اقتباس سے کیا جا سکتا ہے:

''موسم کے چہرے پر وقت سے پہلے ہی جھریاں پڑ چکی تھیں، صبح کی دھوپ بے جان اور میلی تھی اور لیٹے ہوئے ننگے کھیتوں میں ایسی نظر آ رہی تھی جیسے کسی ویران میں غلیظ بتی کی مدھم سی روشنی ٹمٹما رہی ہو۔ توت، چنار، اخروٹ اور بید کے درختوں پر نامحسوس قسم کا خوف لرز رہا تھا۔ گاؤں کی کچی سڑکیں سنسان اور عریاں تھیں جیسے کسی بوڑھے کا گریباں افلاس کی شدت سے ناف تک چاک ہو گیا ہو۔'' (بہتے چراغ، پریم ناتھ پردیسی، ص 16)

ایک اور افسانہ 'بہتے چراغ' کی چند سطور ملاحظہ کیجیے کہ کشمیر کی جھیلوں اور وادیوں کا حسین منظر کس طرح پردیسی نے پیش کیا ہے:

''جہلم کے دونوں کنارے بے حد حسین نظر آ رہے ہیں۔ سیاحوں کی غیر معمولی آمد نے اس سال انھیں وقت سے پہلے ہی شباب اور حسن بخشا ہے۔ ہر ہاؤس بوٹ میں قہقہے ہیں روشنیاں ہیں.......... خوشبوئیں ہیں اور نغمے ہیں اور ان کے ساتھ لگے ہوئے کچن بوٹوں سے سیاہ دھواں بے ترتیبی سے یوں اٹھ رہا ہے جیسے کسی رنگین وادی میں عیش پرتوں کے ساتھ ساتھ کوئلہ نکالنے والے مزدور آوارہ پھر رہے ہوں۔'' (بہتے چراغ، پریم ناتھ پردیسی، ص 16)

کشمیر کو پردیسی نے ہر پہلو سے دیکھا اور اس کو اپنی کہانیوں میں ظاہر کیا۔ جہاں ایک جانب انھوں نے کشمیری رہن سہن، رسومات، غربت، خوف و ہراس وغیرہ کو پیش کیا، وہیں کشمیر کے دلفریب مناظر بھی ان کی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہوئے ہیں جن کو دیکھنے بیرون ریاست سے سیاح آتے ہیں۔ موسم سرما میں شدت بھری سردی میں برف سے ڈھکی وادی ہو یا موسم بہار کے حسین نظارے جو بے حد خوبصورت نظر آتے ہیں۔ اس کی منظر کشی پردیسی نے افسانہ 'پھسلن' میں اس طرح کی ہے کہ برف پوش وادی پیکر بن کر آنکھوں کے سامنے نظر آتی ہے:

''جونز اور بالغور بھی دروازے سے نکل کر برآمدے پر آ گئے جس کے جنگلے کے کنارے کنارے برف کی سفید لکیر چمک رہی تھی نیچے میدان میں برف ہی برف تھی مکان اور مکانوں کی جھکی جھکی چھتیں، درخت اور ان کی چوٹیاں، میدان اور ان کے نشیب و فراز، پہاڑ اور ان کی گھنی چھائیاں سب برف میں لپٹی ہوئی تھیں۔ آسمان پر سیاہ بادل منڈلا رہے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے گلمرگ خاموش موت کی سفید وادی ہے۔ مکان، پہاڑ، درخت اسی وادی کی منجمد لاشیں ہیں...''

(بہتے چراغ: افسانہ پھسلن، پریم ناتھ پردیسی، ص 181)

پریم ناتھ پردیسی کے افسانوں میں کشمیری تہذیب و ثقافت کے مختلف پہلو بھی نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ کشمیر میں آج سے پچیس سال پہلے سفر کرنے کا بہترین وسیلہ تانگہ تھا۔ جس کی جگہ اب گاڑیوں نے لے لی ہے۔ تاہم آج بھی بعض مقامات پر اس کا رواج قائم ہے۔ پردیسی نے اسی طرح کے کئی سارے کشمیری تہذیب و ثقافت کے مٹتے نقوش کو اپنے افسانوں میں قلمبند کیا ہے۔ لوگ سردیوں میں حمام کا استعمال کرتے ہیں جس کا زیادہ اہتمام مساجد میں کیا جاتا ہے۔ تقریباً کشمیر کی ہر مسجد میں یہ پایا جاتا ہے۔ سماوار کی چائے کو لوگ کافی دیر تک پیتے رہتے ہیں اور ساتھ ساتھ گفتگو بھی جاری رکھتے ہیں۔ کشمیر کے اس ماحول کو پردیسی نے ایک افسانے 'جھنجھنا' میں ابھارا ہے:

''لال پور کے اڈے پر صرف ایک تانگہ کھڑا تھا۔ کوچوان اور گھوڑا دونوں فروری کی سردی سے اکڑ گئے تھے۔ سڑک کے کنارے پر جمی ہوئی برف کی کئی تہیں تھیں جن پر طرح طرح کے نقوش ابھر آئے تھے۔ پاس کی مسجد میں درود خوانی ہو رہی تھی اور حمام کے بدرو سے بھاپ اٹھتا ہوا پانی منجمد نالیوں میں بہہ رہا تھا.......... تھوڑی دیر بعد سماوار اُبلنے لگا اور باتیں ہونے لگیں۔ شہر کی، لوگوں کی، حکومت کی، قیمتوں کی برف اور سرد ہواؤں کی، غرض کوئی مسئلہ موضوعِ گفتگو بننے سے نہ رہا۔''

(بہتے چراغ: پریم ناتھ پردیسی، افسانہ جھنجھنا، ص 63)

پریم ناتھ پردیسی کو کشمیری عوام سے بہت محبت اور ہمدردی تھی، ان کے دکھ درد کو وہ اپنا دکھ درد سمجھتے تھے۔ جہاں تک ان سے ہو سکتا تھا ان کو رفو کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ جس کی تصدیق ان کی کہانیوں سے ہوتی ہے۔ ان کہانیوں میں محبت، انسان دوستی، آپسی بھائی چارے اور امن پسندی کی تلقین کی گئی ہے۔ ان کے کردار امن پسندی کے مجسمے نظر آتے ہیں۔ جس کی اعلیٰ مثال کہانی 'بہتے چراغ' کا کردار 'ملا قادر' ہے جو سیاحوں کو کشمیر کی امن اور محبت بھری کہانیاں گوش گذار کرتا ہے۔ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''اس دوران میں ملا قادر پر پھول اور اس کی بیوی کی زندگی کا ایک اہم جزو بن گیا۔ وہ انھیں ہر شام کشمیر کے ماضی کی کہانیاں سناتا۔ بڈشاہ اور ملتا دتیہ کی کہانیاں، للہ عارفہ اور شیخ العالمؒ کی کہانیاں حبہ خاتون اور ارنی مال کی کہانیاں۔ وہ کہانیاں جن میں محبت ہی محبت اور امن ہی امن ہے۔ چنانچہ ساٹھ سالہ بوڑھا بانجی بھی انھیں اوپر سے نیچے تک امن اور محبت کا مجسمہ دکھائی دے رہا ہے۔''

(بہتے چراغ: پریم ناتھ پردیسی، ص 29)

پریم ناتھ پردیسی نے کشمیریت کو داخلی سطح پر محسوس کر کے اس کی مصوری کی ہے۔ ان کے افسانوں کے کرداروں کے رویے، محسوسات اور عقائد پردیسی کی شخصیت کے مختلف ابعاد کو روشن کرتے ہیں۔ ٹیک بٹنی، رحم علی، ابراہیم، دیدار سنگھ، امام صاحب، گنگادھر، پر پھول، عبدل، امام دین، جاوید اور وشومبر وغیرہ جیسے کرداروں کی نفسیاتی الجھنیں درد و کرب اور اضطراب، خواب اور آرزوئیں پردیسی کی شخصیت کا آئینہ ہیں۔ تاہم جو چیز پردیسی کو بلند مقام عطا کرتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ وہ ان تمام کرداروں کی

نمائندگی کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی بنتی بگڑتی تقدیروں کا مشاہدہ بھی کرتے ہیں۔ اس عمل میں وہ دردمندی کے رویے کو فضیلت دیتے ہیں۔ ان کی دردمندی، وطنیت اور انسان دوستی سے سیراب ہوتی ہے۔ انسانی درد کو اتنی سچائی اور گہرائی سے محسوس کرنے کی اردو فکشن میں کم ہی مثالیں ملیں گی۔ پردیسی نے اپنی شخصیت میں جذبات کے مدو جزر سے گذرتے ہوئے بھی جس تحمل اور خود ضبطی سے اپنے جذبات کا سامنا کیا ہے۔ وہ اپنی مثال آپ ہے وہ اس دردمندی کی بدولت اہل کشمیر کی حالتِ زار کو صرف محسوس ہی نہیں کرتے بلکہ دانشورانہ سطح پر اس کا ادراک بھی کرتے ہیں اور اس کے اسباب وعلل کا تجزیہ بھی کرتے ہیں۔ اپنے افسانوں کے کرداروں کے ظاہر و باطن کے تناقض پر وہ غوروفکر بھی کرتے ہیں اور مجبور ومقہور زندگی گزارتے ہوئے ان کے اندرون میں پلنے والے صدیوں کے احتجاج اور غم وغصہ کے ردعمل کو بھانپ بھی لیتے ہیں۔ اس طرح وہ مظلوم انسانیت کی شکست خوردہ آرزوؤں اور خوابوں کا ماتم ہی نہیں کرتے بلکہ ناقدانہ بصیرت سے کام لے کر انسانوں کی مخفی اور خوابیدہ قوتوں کا ادراک بھی کرتے ہیں۔ وہ ان کے نفسیاتی وجود کے اسرار پر نظر رکھتے ہیں اور پھر حالت کی تبدیلی کے زیر اثر ان کی ذہنی کروٹوں کا علم بھی رکھتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ پردیسی کے لیے کشمیریت علاقائیت کے ہم معنی ہو کر نہیں رہ گئی ہے بلکہ ان کے یہاں تو علاقائیت ابھرتی ہے وہ آفاقیت کے مترادف ہے۔

پروفیسر حامدی کاشمیری پریم ناتھ پردیسی کے تخلیقی شعور کے بارے میں لکھتے ہیں:

''چنانچہ پردیسی کے تخلیقی شعور کی تفہیم کے ضمن میں دوسری کلیدی بات ہے کہ انھوں نے انسانوں کے مسائل پر لکھتے ہوئے انسانی سرشت کو بھی نظر انداز نہیں کیا ہے۔ وہ انسانی فطرت کے نبض شناس ہیں۔ انھوں نے خاص طور پر انسان کے جبلی وجود کو مرکز نگاہ بنایا ہے۔ اردو افسانہ نگاروں میں پردیسی جس گہرائی اور ژرف بینی سے بعض مخصوص حالات میں انسانی جبلتوں کی کارکردگی کو اپنے افسانوں کا موضوع بناتے ہیں اس کی مثال کم ملتی ہے۔ پریم چند کے سینکڑوں افسانوں میں ''کفن'' ہی ایک ایسی مثال ہے جو انسان کی بھوک کی جبلت کے تحت اس کی بہمیت کو ظاہر کرتی ہے۔ پردیسی کی انفرادیت اس بات میں پوشیدہ ہے کہ ان کے اکثر وبیشتر افسانے کا محور انسان کے جبلی خصائص و اعمال ہی ہیں جو تہذیبی اور اخلاقی تہذیب واقتدار اور سماجی اور سیاسی دباؤ کے باوجود اپنی اصلیت کا احساس دلاتے ہیں۔ پردیسی کو کشمیر میں رہ کر اپنے ہم جنسوں کے نقاب پوش جبلی خصائص کو پہچاننے میں شاید دشواری اس لیے نہیں ہوتی کیونکہ کشمیر دنیا کا ایک دور افتادہ اور الگ تھلگ خطہ ہے۔''

(ریاست جموں وکشمیر میں اردو ادب: حامدی کاشمیری ص 149)

پریم ناتھ پردیسی نے 'بجھتے چراغ' کے تمام افسانوں میں انسان کے جبلی وجود کے مظاہر وآثار پر نظر رکھی ہے اور خارجی حالات کی جبریت کے تحت جبلتوں کی پیدا کردہ

زندگی کے آخری برسوں میں پردیسی ریڈیو کشمیر سے وابستہ رہے۔ اس دوران انہوں نے کہانیاں کم اور ریڈیائی ڈرامے اور فیچر پروگرام زیادہ تحریر کیے۔ اس کے علاوہ ایک رپورتاژ (پانچ دن) بچوں کے لیے ایک ناول' کئی مضامین اور اسی زمانے میں ایک نامکمل ناول 'پوتی' کے عنوان سے تخلیق کی۔ محض 46 سال کی عمر میں انہوں نے 1955 میں اس جہان فانی کو خیر باد کہا۔

نوع بہ نوع نفسیاتی الجھنوں کی پیکر تراشی کی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ کشمیریوں کی محکوم و مجبور زندگی پر نظر رکھتے ہیں اور ان کا سب سے بڑا مسئلہ اپنے ہم وطنوں کی اقتصادی اور ذہنی کشمکش ہے۔ وہ پوری دردمندی سے اسے محسوس کرتے ہیں لیکن وہ کشمیریوں کی محکومیت اور افلاس افسانے پر لادتے نہیں بلکہ مناسب اور فطری انداز میں اس کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ زندہ انسانوں کی گوناگوں جذباتی اور ذہنی کیفیات کا احاطہ کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کا ہر افسانہ متنوع اور متضاد کیفیات کا نگارخانہ نظر آتا ہے۔

پردیسی منجھے ہوئے فنکار ہیں۔ وہ اردو کے اکثر افسانہ نگاروں کی طرح لفظوں کا ضیاع نہیں کرتے وہ زبان کی سادگی، روانی، استدلالیت اور توازن کو قائم رکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں برج پریمی رقمطراز ہیں:

''پردیسی کفایت لفظی کے اعتبار سے منٹو کی یاد دلاتے ہیں'' (پریم ناتھ پردیسی۔ عہد شخص فن: برج پریمی ص 129)

جہاں کسی نازک ذہنی یا جذباتی حالت کا اظہار یا تخیلی فضا آفرینی مقصود ہو وہاں وہ تشبیہ واستعارہ سے بھی کام لیتے ہیں۔ اقتباسات ملاحظہ کیجیے:

''پری محل کی مہیب صورت پہاڑیوں کے پیچھے سے صبح کا مسکراتا سورج دو نیزے اوپر آ چکا تھا۔ اور ابھی تک اسے اپنے ہونٹوں میں آنسوؤں کی نمی کا احساس ہو رہا تھا۔'' (دھول)

''سڑک کے نیچے کشن گنگا کا پانی جیل سے بھاگتے ہوئے قیدی کی طرح بھاگ رہا تھا۔'' (خون اور سکے)

''صبح کی دھوپ بے جان اور میلی تھی اور لیٹے ہوئے ننگے کھیتوں میں ایسی نظر آ رہی تھی جیسے کسی ویران مکان میں غلیظ بتی کی مدھم سی روشنی ٹمٹمارہی تھی۔'' (نئی سڑک)

(ریاست جموں وکشمیر میں اردو ادب: حامدی کاشمیری، ص 76-175)

ریاست جموں وکشمیر کے افسانہ نگاروں میں پریم ناتھ پردیسی کو بلند مقام حاصل ہے۔ انھوں نے اپنے وقت کے تقاضوں کو بھرپور طریقے سے اپنے افسانوں میں پورا کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے اس سرزمین کی مٹی کی بو سونگھ لی اور اس کا حق ادا کرنے کی عمدہ کوشش کی۔ وہ ماحول جس میں انھوں نے ہوش سنبھالا اور وہ حالات جن سے کشمیر اور کشمیری عوام گزر رہے تھے۔ ایک باشعور حساس اور ذہین فنکار کی طرح انھوں نے اس بُو کو اپنی کہانیوں میں بڑے خلوص کے ساتھ قلمبند کیا۔ پردیسی کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے حامدی کشمیری رقمطراز ہیں:

''اس میں کوئی شک نہیں کہ پردیسی اردو کے ایک مقتدر اور اہم افسانہ نگار ہیں۔ انھوں نے کشمیر کے حوالے سے بالخصوص انسان کے جبلی وجود کی مرقع کاری کر کے اردو افسانے کو مربوط طریقے سے ایک نئی جہت سے آشنا کیا ہے۔''

(ریاست جموں وکشمیر میں اردو ادب: حامدی کاشمیری ص 176)

زندگی کے آخری برسوں میں پردیسی ریڈیو کشمیر سے وابستہ رہے۔ اس دوران انھوں نے کہانیاں کم اور ریڈیائی ڈرامے اور فیچر پروگرام زیادہ تحریر کیے۔ اس کے علاوہ ایک رپورتاژ (پانچ دن) بچوں کے لیے ایک ناول، کئی مضامین اور اسی زمانے میں ایک نامکمل ناول 'پوتی' کے عنوان سے تخلیق کی۔ محض 46 سال کی عمر میں انھوں نے 1955 میں اس جہانِ فانی کو خیر باد کہا۔

■

Dr.Khursheed Ahmad Dar
Sopore Baramulla 193301 (J&K)
Mob.: 7006959764
darkhursheed18@gmail.com

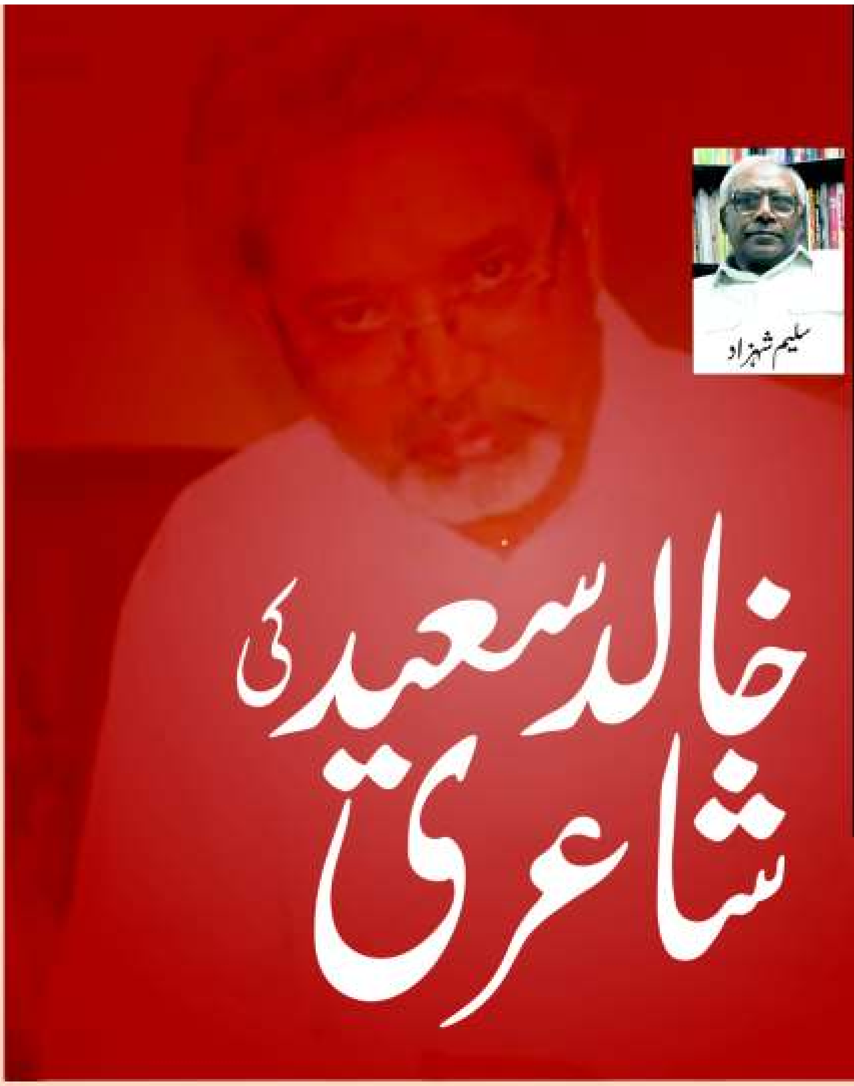

سلیم شہزاد

خالد سعید کی شاعری

عصری اردو مابعد جدید تنقید کی اپنی ترجیحات ہیں کہ وہ یوروپی امریکی اصطلاحات کے بغیر بلکہ یوں کہیے کہ اردو اس مظہر کو متعارف کرانے والوں کے رائج کردہ تنقیدی لسانی تعملات کے بغیر اپنے اظہار میں نکھرا نہیں توڑتی۔ اس کی زبان ترجمہ شدہ خیالات کی باز تحریر کے سوا کچھ نہیں۔ یہ تنقید اپنے مغربی مفتیوں کے فتوے، عصری اردو ادبی تخلیقات پر چسپاں کرتی رہتی اور ثابت کرنا چاہتی ہے کہ غیر ملکی نظریات و افکار یا نئی ادبی تھیوری کو اختیار کرنے ہی میں اردو زبان و ادب کا بھلا ہوسکتا ہے۔ وہ فرانس سے معنیاتی نظریات، امریکہ سے ثقافت پسندی، روس سے ہیئت و ساخت کے تصورات اور جرمنی اور انگلینڈ سے نو تاریخیت، تانیثیت، نو اشتراکیت وغیرہ کے فلسفے در آمد کرتی اور ہندوستان کی اردو اکادمیوں اور یونیورسٹیوں کے سیمناروں میں ان تمام لسانی، فنی اور نفسی مسائل پر بحث و تمحیص کے دروازے وکرتی ہے۔

اپنے ادبی لسانی ورثے سے لاتعلقی اور اس کی اہمیت سے صرف نظر کو عصری اردو تنقید نے اپنا خاص مزاج بنالیا ہے۔ ولی، آرزو، میر، سودا، انشا، نظیر، غالب کے کلام میں اور آزاد، حالی، شبلی، امام اثر وغیرہ کی نثر میں انہیں اب تک لسانیاتی شعریاتی نظریات کی موجودگی کا علم نہیں کہ ہمارے بزرگوں نے مابعد جدید مغربی نظریات سے کہیں آگے مباحث آج سے دو سو برس اُدھر ہی دنیا کے سامنے پیش کر دیے تھے۔ نئی ادبی تھیوری اور مابعد جدید یہ تنقیدی فلسفے کے حوالوں کا موقع یہ ہے کہ خالد سعید کے شعری اظہار کو ناقدین نے اسّی کے عشرے میں پہچانا اور نہ اکیسویں صدی کے حالیہ برسوں میں ان کے کلام میں مابعد جدید شعریات کی طرف انہوں نے توجہ دی۔

خالد سعید (10 ستمبر 1950 - 26 مئی 2021) کی حالیہ کتاب جس میں ان کے پہلے شعری مجموعے 'شب: رنگ نمو' کا سارا کلام بھی شامل ہے، اپنے نام 'چاند سے باتیں' کی حد تک مجھے پسند نہیں۔ مجھے ان کی پہلی کتاب کا نام زیادہ متوجہ کن لگتا ہے جبکہ دوسری کتاب کے نام میں سطحیت پائی جاتی ہے البتہ خالد کا شعری اظہار اس دوسرے مجموعے میں فنی سطح پر خاصا بلند نظر آتا ہے۔ پہلے عنوان کے لسانی ساختیے میں لفظ 'شب' کے بعد رابطے کا نشان (کولن) لگایا گیا ہے جس کے بعد اضافی ترکیب 'رنگ نمو' آتی ہے۔ شاعر کا عندیہ (جسے آج کل منشائے مصنف کہنے لگے ہیں) معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے شعری اظہار کی نمو کو جس رنگ سے واضح کرنا چاہتا ہے وہ رنگ 'شب' ہے۔ دیکھیے، خالد نے اس لفظ کے معنوی تصور کو یہاں بدل دیا ہے۔ لفظ 'شب' ہمارے لیے جو معنی رکھتا ہو، شاعر کے لیے اس کے معنی کچھ اور ہیں۔ اب یاد کیجیے التوائے معنی کے مابعد ساختیاتی تصور کو جس کے مطابق لسانی تعملات کے معنی قائم بالذات نہیں ہوتے، ہر لسانی ساختیہ یا ہر لفظ کثیر معنویت کا حامل ہے۔ سنیے ولی دکنی کیا کہتے ہیں۔

جو سنیا تیرے دہن سوں یک سخن — بھید پایا نسخۂ اسرار کا

یعنی لفظ یا سخن صرف لفظ یا سخن نہیں 'نسخۂ اسرار' ہے خالد سعید نے اس نسخے کو پالیا تھا ایک مختصر نظم میں کہتے ہیں۔

اک کبوتر / پاؤں میں چاندی کا گھنگرو باندھ کر
سوئی منڈیروں پر / رقص کرتا رہا، گھنگرو بجتا رہا / اور سحر ہوگئی

کبوتر کے پاؤں میں بندھے گھنگرو کے بجتے رہنے اور سحر ہوجانے کا معنوی ربط اس نظم کا نسخۂ اسرار ہے۔ گھنگرو کا بجنا 'ایک سخن' ہے جس سے 'سحر' کے راز کی نمود ہوئی ہے۔ ظاہر ہے کہ گھنگرو کے بجنے (سبب) سے سحر کی نمود (واقعہ) کا وقوع پذیر ہونا واقعی ایک راز ہے کہ ایسا کیوں کر واقع ہوا یا ہوسکتا ہے؟ ہمارے مابعد جدیدیت کے ماہرین اب اس نسخے کو پیرس سے در آمد کرکے اس کے اسرار کی کھوج میں مصروف ہیں۔

خالد کا ایک شعر ملاحظہ کیجیے۔

میں نے چاہا تھا نئے خواب بُنوں
خواب آئے تو پرانے آئے

نئے خواب بُننا نئے متن کی تخلیق کا استعارہ ہے۔ شاعر جب کوشش کرتا ہے کہ نئے شعروں کی تخلیق کروں تو اسے محسوس ہوتا ہے کہ نئے شعروں میں نئی باتیں، نئی زبان نہیں ہے یہ تو میں دیکھے ہوئے خواب دوبارہ دیکھ رہا ہوں۔ مابعد جدید بیانیات نے اس صورت کو بین المتونیت کے تصور میں پیش کیا ہے کہ زبان کا کوئی تعمل نیا نہیں ہوتا۔ ہم بار بار کے برتے ہوئے لفظوں، محاوروں، استعاروں وغیرہ کو بار بار استعمال کرتے رہتے ہیں۔ اسّی کے عشرے میں ایک رائج متن کو نئے سرے سے ترتیب دینا تجربہ پسندی کے ذیل میں آتا تھا۔ (یورپ اور امریکہ میں تو اسے بین المتونیت کا نام مل چکا تھا مگر یہاں ہم اس لسانی وقوعے سے واقف نہیں تھے) خالد سعید کی ایک نظم ہے بہ عنوان 'علی گڑھ 78ء' عیسوی جس کے اختتام پر انھوں نے اطلاع دی ہے کہ

اس نظم میں ایک لفظ بھی میرا نہیں ہے سارے مصرعے میں نے انیس ناگی کی نظموں سے لیے ہیں البتہ ان کی نئی ترتیب و تنظیم سے میں نے یہ نظم بُنی ہے۔

یہاں 'خواب بُننا' اور 'نظم بُننا' کی معنوی مشابہت سے قطع نظر خالد سعید نے بین المتونیت کے تحت جو تخلیقی کام (وہ جس معیار کا بھی ہو) کیا ہے، اس کی داد نہ دینا بے انصافی ہوگی۔

اب 'چاند سے باتیں' کرنے والے شاعر کی نظموں کی ہیت پر چند باتیں پیش ہیں اور وہ یہ کہ خالد کی ایک نظم ''چاندی کا گھنگرو'' جو ایک مختصر آزاد نظم ہے۔ خالد نے اور بھی مختصر نظمیں کہیں ہیں۔ مثلاً

لمحے مہکتے رہے، مہکاتے رہے
اور پھر اڑ گئے

ان کی مختصر ترین نظم ہے۔ ان کے کلام میں طویل نظمیں بھی ملتی ہیں پہلے 'شب: رنگ نمو' کی نظموں کو لیتے ہیں۔ علی گڑھ 78 عیسوی کا ذکر آچکا ہے۔ اسی ذیل میں خالد کی نظموں 'ہم کو اکھڑے ہوئے پیڑ سمجھے گئے' اور بہ عنوان 'ایک' اور 'دو' کی ہیئتوں پر چند معروضات 'اکھڑے ہوئے پیڑ' میں کہتے ہیں۔

سنو بدگمانی کے گنجاں گھرے اندھیرے میں بیٹھے کیا پڑھ رہے ہو یوں کرو، اس دھرتی کی کہیں سے بھی تھوڑی مٹی اٹھالو، اپنے ٹیبل پہ رکھ لو۔ مٹی میں تحلیل اجداد کی ہڈیوں کی فاسفوری روشنی میں پڑھو تو نظر آئے گا۔

انگریزی شاعر ہاپکنز کے ایک مقالے کا عنوان ہے۔ 'نظم کیسی نظر آتی ہے؟' اس بات کے جواب میں وہ چھپی یا لکھی ہوئی نظم کی ظاہری ہیئت سے بحث کرتے ہوئے نظم کے مواد کی معنویت تک جاتا ہے۔ یہاں خالد سعید کی نظم بھی ہاپکنز کے اس سوال سے جڑی ہوئی ہے کہ وہ کیسی نظر آتی ہے؟ دکھائی دینے کی حد تک یہ نظم معلوم ہوتا ہے کہ نثر کی ہیئت میں لکھی گئی ہے۔ نثر کی ہیت اور نظم کے مواد کا یہ رشتہ واضح ہے کہ اس کی سوانحی کیفیت بحر اور قافیوں کے ساتھ نظم کیے جانے پر وہ تاثر نہیں پیدا کرتی جو نثر کی عام ہیت میں لکھے جانے پر کر رہی ہے۔ اگرچہ اس کا آہنگ بحر متقارب کے آہنگ سے ملتا جلتا ہے۔

نظموں، بہ عنوان 'ایک اردو' کے لیے بھی خالد نے اس ہیئت کو برقرار رکھا ہے لیکن 'ایک' اور 'دو' کا عنوانی ابہام بہر حال نظم کے مواد کی معنویت یا بے معنویت کو مزید گہرا کرنے والا ہے۔

'چاند سے باتیں' کی پہلی نظم 'چراغ نامہ' اپنی ہیئت اور ترسیل مواد کے لحاظ سے ایک روایتی مثنوی ہے اگرچہ یہ مثنوی کے روایتی وزن و بحر کی حامل نہیں۔

ہو یہاں کیسے سفر مرا   کسی خواب سے تھا گزر مرا
کوئی خواب دیکھا تھا خواب میں   کہ میں گم ہوں گنج سراب میں

چوالیس اشعار پر مشتمل یہ مثنوی نور و ظلمت کے متضاد پیکراں کی مدد سے شاعر کے فکری ابہام کو نمایاں کرتی ہے۔ اس کا خاتمہ ایک قول محال پر یوں ہوتا ہے۔

کہیں روشنی کی ہے تیرگی   کہیں تیرگی کی ہے روشنی
میں شہید الفت روشنی   میں قتیل لذت، تیرگی

'چیر ہرن' ایک تلمیحی نظم ہے جس میں کورو پانڈو بھائیوں کے حوالے سے ملک کی موجودہ صورت حال کو نظم کیا گیا ہے کہ یہی اپنے ملک کو برباد کرنے پر تلے ہوئے ہیں اور توقع رکھتے ہیں کہ درو پدی کی عزت کو بچانے کے لیے آسمان سے مدد آئے گی۔ نظم کی آخری سطر کہتی ہے کہ آسمان سے اب ستر پوشی نہیں ہوگی۔

'لہو زمین کا سہاگ' زمین اور فلک دو کرداروں کے درمیان شاعرانہ منظوم مکالمہ ہے۔

فلک: زمیں، اے زمیں! تو کیوں لٹی لٹی سی ہے؟
زمین: ابھی دکھی ہوں میں، ابھی مرے خالی ہاتھ گرم ہیں۔

دونوں کرداروں کی اگلی مکالمت سے واضح ہے کہ زمین پر ہر طرف لہو بہہ رہا ہے یا بہایا جا رہا ہے۔ زمین چاہتی ہے کہ یہ لہو آزادی کی جنگ کے لیے ہے تو بہتر ہو۔ وہ فلک سے ایک قرار لینا چاہتی ہے کہ ہمارے

جدا جدا یہ رنگ اگر ملیں   تو پھر دھنک بنیں
تو رنگ یہ دھنک بنیں   خدا کے دستخط بنیں

دھنک کو توریت میں خدا کے عہد کی علامت قرار دیا گیا ہے اسے اس نظم کا ایک اہم تلمیحی حوالہ کہا جا سکتا ہے۔ خالد سعید کی اور نظموں میں بھی ان کا تند و تلخ لہجہ سنائی دیتا ہے جسے سننے کے لیے ان کی کتاب کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

خالد سعید جدیدیت کے زمانے سے شعر کہہ رہے ہیں۔ ان کی غزل میں جدید شاعری کی مخصوص لفظیات کا باسانی پتا لگایا جا سکتا ہے جیسے

نفس نفس میں ہر اک پل انتشار / ہم نے لگائے جسم میں راڈار
امکاں کے دھوکے / وہ بادبان کیا ہوئے / آخر شب در ہمارا کھٹکھٹاتا کون ہے /
شور سڑکوں پر شب: رنگ نمو / ایک خلائے بسیط / نیند آدھی 'خواب آدھے /
طائر آرزو کے پر باندھو / ٹوٹا ہوا بادباں / صد رنگ کھڑکیاں / پچھلے موسم کے پرندے

وغیرہ وغیرہ شعری لسانی سانچے اور ترکیبیں ان کی غزل کو جدیدیت کے رنگ میں رنگ دیتی ہیں۔ ان ترکیبوں کو پورے شعروں میں پڑھیں تو شاعر یعنی فرد کی فکر کا انتشار، اس کی امکانی چاہتیں۔ شور سے پر ماحول، خالی پن، آدھے ادھورے خواب، پروں کے بندھے ہونے کا احساس وغیرہ استعارتی، علامتی تاثرات مجسم ہوتے ہیں۔ خالد کی ایک غزل غالب کی غزل کی طرح تجاہل عارفانہ کی عمدہ مثال ہے۔

اسے سن کر غالب کی غزل کو یاد کیجیے۔

ہواؤں کو اذن سفر کس لیے
دیے ہیں پرندوں کو پر کس لیے
رکھا کس لیے سر پہ اوندھا فلک
بچھائے ہیں یہ بحر و بر کس لیے
میں خود اک تلاطم، میں خود اک فشار
یہ صرصر ہے کیا، یہ بھنور کس لیے
ابھی تک سمجھنے سے قاصر ہے دل
ادا چیز ہے کیا، نظر کس لیے

غالب نے سوال کیا ہے عشوہ و غمزہ و ادا کیا ہے؟

ناصر کاظمی کی غزل۔

میں نے جب لکھنا سیکھا تھا
پہلے تیرا نام لکھا تھا

کی اتباع میں خالد سعید نے بھی غزل کہی۔

میں نے اک سپنا دیکھا تھا / سپنے میں ایک اور سپنا تھا (خالد نے اپنی مثنوی میں بھی کہا ہے۔ کوئی خواب دیکھا تھا خواب میں)

کمرے میں خاموشی سی تھی   ایک دیا تنہا جلتا تھا
کھڑکی میں اک چاند سا چہرہ   کس کا رستہ دیکھ رہا تھا
آج ہے دریا میں صحرا سا   کل تک یہ صحرا دریا تھا
میرا ہی دیوانہ پن ہے   کب اس نے مجھ کو چاہا تھا

اور اس شعر کو غزل میں دوسرے مطلع کی جگہ دینی چاہیے تھی۔

جتنا وہ سادہ لگتا تھا   اتنا ہی وہ پیچیدہ تھا

خواب اور سپنے کے تعلق سے غالب، ناصر اور خالد کے اشعار متن اساس متن کے تخلیق کا ثبوت ہیں۔ خالد کے ہاں اس کی دوسری اہم مثال ان کی نظم 'شاخ نہاں غم' کو قرار دیا جا سکتا ہے جو صفا و مروہ کے مابین حضرت ہاجرہ کی سعی کا تلمیحی بیانیہ ہے۔ نظم کے آخری مصرعے اور اس کا عنوان سراج اورنگ آبادی کی مشہور غزل

خبر تحیر عشق سن، نہ جنوں رہا، نہ پری رہی

کے متن سے ماخوذ ہیں۔ البتہ اس کے پہلے مصرع کا تخاطب 'ان تحرہ' (الف خالی نون پر زبر) راقم کی قوت فہم سے رابطے میں نہیں آتا۔

خالد سعید مستحق ہیں کہ اس تحریر سے زیادہ سنجیدہ اور ان ہی موضوعات پر گہرائی اور گیرائی سے ان کی شاعری پر ارباب خیال، اپنی آرا ظاہر کریں۔ خالد کی نثری تحریریں بھی متقضی ہیں کہ لسانی اور لسانیاتی، موضوعی اور موضوعاتی، بیان اور بیانیاتی وغیرہ زاویوں سے ان کے مطالعہ سے نثری اسلوب کی شناخت متعین کی جائے۔

■

Saleem Shahzad
323, Mangalwar Ward
Malegaon - 423203 (Maharashtra)
Mob.:9890331137

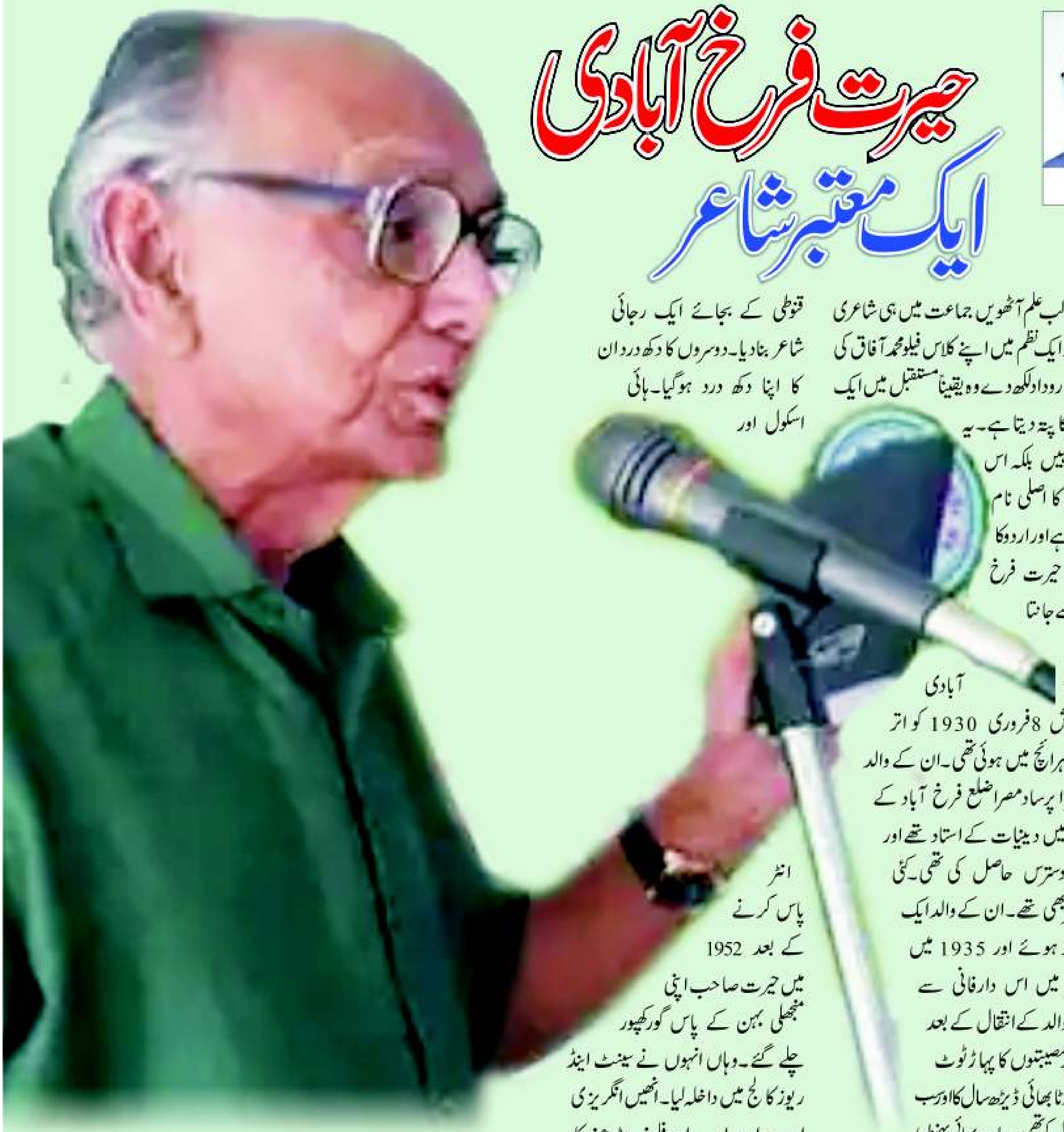

حیرت فرخ آبادی
ایک معتبر شاعر

نصیر افسر

جو ہونہار طالب علم آٹھویں جماعت میں ہی شاعری کا آغاز کرے اور ایک نظم میں اپنے کلاس فیلو محمد آفاق کی دکھ بھری زندگی کی روداد لکھ دے وہ یقیناً مستقبل میں ایک اچھا شاعر ہونے کا پتہ دیتا ہے۔ یہ معاملہ کسی اور کا نہیں بلکہ اس شاعر کا ہے جس کا اصلی نام جیوتی پرساد مصرا ہے اور اردو کا ادبی حلقہ اسے حیرت فرخ آبادی کے نام سے جانتا اور پہنچانتا ہے۔

حیرت فرخ آبادی صاحب کی پیدائش 8 فروری 1930 کو اتر پردیش کے ضلع بہرائچ میں ہوئی تھی۔ ان کے والد محترم جناب متھرا پرساد مصرا ضلع فرخ آباد کے مشن ہائی اسکول میں دینیات کے استاد تھے اور نوزبانوں میں دسترس حاصل کی تھی۔ کئی چرچوں کے پاسٹر بھی تھے۔ ان کے والد ایک حادثے کے شکار ہوئے اور 1935 میں 41 سال کی عمر میں اس دارفانی سے رخصت ہوئے۔ والد کے انتقال کے بعد ان کے خاندان پر مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ سب سے چھوٹا بھائی ڈیڑھ سال کا اور سب سے بڑی بہن 14 سال کی تھی۔ سات بھائی بہنوں کی ذمے داری ان کی والدہ پر آپڑی۔ جو خود بھی پلوری کی بیماری سے ٹھیک ہوئی تھیں۔ چھوٹے بیٹے کو اسپتال کے Baby fold میں رکھوایا۔ تین بیٹوں اور تین بیٹیوں کو الگ الگ ہاسٹل میں ڈالا اور خود ہردوئی میں لڑکیوں کے ہاسٹل میں میٹرن Metron کی نوکری کی۔ چھٹیوں میں جب سارے بچے گھر پر ہوتے تو دو وقت کا کھانا بھی مشکل سے ہو پاتا تھا۔ اس انتہائی غریبی کی زندگی گزارنے میں حیرت صاحب کو ایک دردمند دل کی آشنائی عطا ہوئی جو ان کے پورے کلام میں جھلکتی ہے۔ حساس اور دردمند دل نے حیرت صاحب کو ایک بہت ہی نیک اور اچھا انسان بنایا اور اس غریبی نے ان کو قنوطی کے بجائے ایک رجائی شاعر بنادیا۔ دوسروں کا دکھ درد ان کا اپنا دکھ درد ہوگیا۔ ہائی اسکول اور انٹر پاس کرنے کے بعد 1952 میں حیرت صاحب اپنی منجھلی بہن کے پاس گورکھپور چلے گئے۔ وہاں انہوں نے سینٹ اینڈ ریوز کالج میں داخلہ لیا۔ انھیں انگریزی ادب، اردو ادب اور فلسفہ پڑھنے کا موقع مجنوں گورکھپوری صاحب سے ملا۔ تھوڑے ہی عرصے میں حیرت صاحب نے اپنے آپ کو مجنوں صاحب کی نظروں میں ایک محنتی طالب علم ثابت کرلیا تو مجنوں صاحب نے بھی پڑھائی کے سلسلے میں ان کی مدد کرنا شروع کردی۔ ایک دن حیرت صاحب نی اپنی نظم 'ایک غریب طالب علم' کی اصلاح کرنے کی درخواست مجنوں صاحب سے کی تو انھوں نے کہا کہ بیٹا اصلاح سے شعر دوغلا ہوجاتا ہے۔ میری اصلاح کے بعد اس نظم میں 75 فیصد الفاظ اور خیالات میرے ہوجائیں گے اور تم 25 فیصد رہ جاؤ گے تو حیرت صاحب نے اُن سے کہا کہ ہم نئے لکھنے والے کیا کریں۔ انھوں نے کہا بیٹا اساتذہ کے کلام سے لائبریری بھری پڑی ہے وہاں روز جاؤ اور ڈھائی تین گھنٹے ان کا کلام پڑھو۔ دو تین ہزار شعر یاد ہو جائیں گے اور تم خود اپنی غلطیاں سدھار لوگے۔ جب فراق گورکھپوری صاحب چھٹیوں میں گورکھپور تشریف لاتے تو مجنوں گورکھپوری صاحب کی رہائش گاہ پہ گھنٹوں ادبی گفتگو ہوتی اور حیرت صاحب ان دونوں اساتذہ حضرات کی کارآمد گفتگو سے استفادہ کرتے اور درمیان میں ان کی خدمت بھی کرتے جاتے۔ اساتذہ کرام کی بے حد حوصلہ افزائی اور قارئین کی پذیرائی کے علاوہ خود کے ذوق وشوق نے حیرت صاحب کو اچھے نوجوان شعرا کی صف میں لا کھڑا کیا جس سے آپ کے

ذوق کی تسکین بھی ہوتی رہی اور شعر کہنے کے شوق کی مسلسل آبیاری بھی ہوتی رہی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اتر پردیش کے مشاعروں کے علاوہ اطراف کی ریاستوں کے مشاعروں میں بھی مدعو کیے جانے لگے۔ آپ کی شاعری حقیقت پر مبنی اور عام فہم ہونے کی وجہ سے مقبولیت کو دعوت دینے لگی اور لوگوں کے دلوں میں اترتی چلی گئی۔

تلاش رزق آپ کو جھارکھنڈ کی راجدھانی رانچی لے آئی جہاں آپ نے 1960 میں شہر سے 15 کیلومیٹر دور واقع نیوری کے رہائشی اسکول وکاس ودیالیہ کے شعبۂ انگریزی کے ہیڈ کی حیثیت سے ملازمت شروع کی۔ آکاشوانی رانچی سے نشریات بھی شروع ہوگئیں اور بعد ازاں دوردرشن ودیگر چینلس سے بھی نشریات ہونے سے نئے شہر کے اردو حلقہ میں مقبولیت بڑھتی گئی۔ ان جگہوں پر آنے جانے سے ریاست کے نامور شعرائے کرام جیسے پرکاش فکری، وہاب دانش، صدیق مجیبی، پرویز رحمانی، اسلم بدر، نظر رانچوی، اثر رانچوی، توحید رانچوی، شان بھارتی، رونق شہری، غیاث انجم، علی منیر، نصیر افسر، نہال حسین وغیرہ سے ملاقاتیں ہونے لگیں۔

معروف ادبا و یونیورسٹی کے اساتذہ کرام میں پروفیسر وہاب اشرفی، پروفیسر انوار احمد خان، پروفیسر سمیع الحق، پروفیسر احمد سجاد، پروفیسر ابوذر عثمانی، پروفیسر سید شمیم الدین، پروفیسر منظر حسین، پروفیسر حسن مثنیٰ، پروفیسر عبدالقیوم ابدالی، پروفیسر کہکشاں پروین، پروفیسر ہمایوں اشرف کے علاوہ بے شمار ادب نواز حضرات سے رابطہ قائم ہوتا گیا جس سے احباب کا دائرہ بڑھتا ہی چلا گیا۔ انھیں اس بات پر فخر ہے کہ پورے ملک میں ان کے احباب پھیلے ہوئے ہیں ادبا، شعرا کے علاوہ قارئین کی ایک بڑی تعداد ہے۔

جہاں تک ان کی شاعری کا تعلق ہے تو آپ کا یہ ماننا ہے کہ آپ نے شاعری کے چار ادوار دیکھے ہیں یعنی روایت، ترقی پسندی، جدیدیت و مابعد جدیدیت۔ چونکہ ان کی شاعری روایتی دور میں شروع ہوئی ہے اس لیے ان کی شاعری میں روایت کا پاس ولحاظ خصوصی طور پر نمایاں ہے۔ جیسے جیسے ادوار بدلتے گئے قدریں بھی بدلتی گئیں۔ یہ بات یقینی طور سے کہی جاسکتی ہے کہ کوئی بھی شاعر ادوار کی تبدیلی اور زمانے کے بدلاؤ سے اچھوتا نہیں رہ سکتا ہے۔ وہ اپنے دور کی تلخیوں اور کرب ودرد سے ناآشنا نہیں رہ سکتا ہے۔ وقت کی تبدیلی ہمیشہ حیرت صاحب کی شاعری پر اثر انداز رہی ہے۔ اس لیے وہ کہتے ہیں کہ ؎

وقت کے ساتھ بدل جاتا ہے اندازِ سخن
شاعر آزاد ہے لہجے کئی اظہار کے ہیں

آپ کی کئی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں جن میں بطور خاص 'نوائے ساز دل'، 'حسن التماس' اور اس کا دوسرا ایڈیشن شائع ہو کر مقبول عام ہوا۔ ہندی میں آپ کی کتاب 'جو کریدے گھاؤ من کے' نے کافی مقبولیت حاصل کی۔ ڈاکٹر ہمایوں اشرف نے 'حیرت فرخ آبادی، فن اور فنکار' مرتب کی جس میں پوری اردو دنیا کے نامور ناقدوں کے قریباً 45 مضامین اور 20 خطوط اور ان کا منتخب کلام شائع کیا ہے جو حیرت صاحب کے کلام کی مقبولیت ثابت کرتا ہے۔ حیرت صاحب کئی سالوں سے انجمن بقائے ادب، رانچی (رجسٹرڈ) میں صدر کی حیثیت سے اردو ادب کی خدمت میں لگے رہے۔ تادم حیات یعنی اکیانوے سال کی عمر تک تمام مقامی مشاعروں، کوی سمیلنوں میں شرکت کرتے رہے۔ اور کورونا وبا کے وقفے کو چھوڑ کر اب بھی روزانہ تین گھنٹے صبح اور تین گھنٹے شام کو متفرق کمپٹیشن میں بیٹھنے والوں کو اسکول کے لڑکے لڑکیوں کو انگریزی پڑھاتے رہے۔ میرا ان کا ساتھ 1973 سے ہے عمر میں وہ مجھ سے کئی سال بڑے ہیں لیکن ہمیشہ مجھے اپنے چھوٹے بھائی کی طرح پیار کرتے ہیں۔ میں ناقد تو ہوں نہیں لیکن ہندوستان کے کئی مشہور ناقدین کے مضامین میں سے ایک ایک دو دو جملے نقل کرنا چاہتا ہوں تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ یہ مشاہیر ادب حیرت صاحب کی شاعری کے بارے کیا کہتے ہیں۔

ڈاکٹر فضل امام: ''حیرت کی شاعری میں دھرتی کی سوندھی سوندھی خوشبو قلب ونظر کو سرور بخشتی ہے اور دل ودماغ کو فرحت عطا کرتی ہے۔ دراصل حیرت کی شاعری ایک ایسا آئینہ خانہ ہے جس میں فسانۂ ہستی کے مختلف عناوین اپنے سیاق وسباق کے ساتھ مل جاتے ہیں۔''

شمس الرحمن فاروقی: ''آپ کا کلام بہت خوب ہے۔ یقیناً آپ نے اردو غزل کی روایت اور اس کے اصولوں کو پوری طرح حاصل کیا اور برتا ہے۔ چونکہ آپ انگریزی زبان کے استاد رہے ہیں اور اس پر طرہ یہ کہ مجنوں گورکھپوری کے شاگرد بھی رہے ہیں، لہٰذا آپ کی شاعری میں روایتی مضامین سے پرہیز نظر آتا ہے۔''

وہاب اشرفی: ''حیرت زندگی کے جس موڑ پر ہیں تجربے اور مشاہدے کا ایک وسیع خزانہ فطری طور پر انہیں حاصل ہو چکا ہے چنانچہ انھیں نئے مضمرات کو بس میں کرنے کی جہت غیر فطری نہیں بنتی اور وہ نئے امکانات سے باخبر ہو کر غزل کو تازہ بکارنا نے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ ان کا ایک رخ انگریزی شعر وادب کا گہرا مطالعہ جس کے وہ ایک عرصے تک استاد رہے ہیں۔ ایسے میں انہیں معلوم ہے کہ نئے ٹرینڈز (Trends) اور اس کے کیا مطالبات ہوتے ہیں۔ لہٰذا ان کے کلام میں وہ عنصر سرے سے نہیں جسے ہم غیر متوازن کہہ سکیں۔''

عبدالقیوم ابدالی: ''یہ درد وغم یہ شاعری حیرت اسی کی دین ہے ممنون ہوں مشکور ہوں کیا کیا دیا 'دیوانگی'

حیرت بھائی جس دیوانگی کی بات کر رہے ہیں وہ بلاتفریق مذہب وملت انسان کا انسان سے حد درجہ پیار ہے جسے انھوں نے دیوانگی کا نام دیا ہے۔ دیوانگی وہ بلا ہے جو دیواروں میں قید نہیں رہ سکتی۔ فطرت نے ان کے خمیر میں نہ جانے کہاں کی مٹی ملا کر گوندھی ہے کہ کبھی صندل کی خوشبو آتی ہے، کبھی گلاب کی اور کبھی عود کی۔ پھر بھی ان کی شاعری میں حزن ویاس کی ایک عجیب سی فضا کا احساس سا ہوتا ہے۔ لگتا ہے جیسے شام کا ایک ملگجا اندھیرا ہر سو چھایا ہوا ہے۔ حیرت صاحب کی یہ دیوانگی انھیں اور ان کی شاعری کو ایک الگ پہچان عطا کرتی ہے۔''

8 فروری 2020 کو ہماری انجمن بقائے ادب اور حیرت صاحب کے خاندان نے مل کر ان کی 90 ویں سالگرہ کا جشن منایا۔ اس تقریب میں جھارکھنڈ ہائی کورٹ کے جسٹس وکرم آدتیہ پرساد، رانچی یونیورسٹی کے سبکدوش وائس چانسلر پروفیسر ڈاکٹر انوار احمد خان، جھارکھنڈ کے ڈائریکٹر جنرل آف پولس جناب کمل نین چوبے گورکھپور کے پروفیسر عبیداللہ چودھری اور راقم الحروف نے حیرت کی زندگی اور ان کی شاعری پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

لیکن صد افسوس کہ برصغیر کا ایک مشہور ور معروف شاعر جناب جیوتی پرساد مصر، عرف حیرت فرخ آبادی کا 11 جولائی کی رات پونے بارہ بجے اپنے رہائشی مکان واقع کھوسلہ ہاؤس، نارتھ آفس پاڑہ، ڈورنڈہ، رانچی میں انتقال ہوگیا۔ وہ دوران گفتگو اکثر مجھے کہتے تھے کہ میں تو اس دنیا سے جانے کے لیے تیار بیٹھا ہوں۔ انھوں نے اپنے دونوں بیٹیوں کو تاکید کر رکھی تھی کہ جب ان کا آخری وقت آئے، طبیعت بگڑ جائے تو کسی بھی ہسپتال میں داخل نہ کرایا جائے اور گھر پر ہی رہنے دیا جائے۔ ایسا انھوں نے اس لیے کہا تھا کہ 51 دنوں قبل ان کی شریک حیات کا لمبی بیماری کے بعد انتقال ہوگیا تھا اور لاکھوں روپے خرچ کرنے کے بعد بھی صحت یاب نہ ہوسکی تھیں۔

اب حیرت صاحب کا اس طرح دار فانی سے کوچ کر جانا اردو ادب کا بڑا خسارہ ہے۔

■

Naseer Afsar
D-1, Friends Compound
Rahmat Colony, P.O: Doranda
Ranchi - 834002 (Jharkhand)

ہندوستانی تہذیب و تمدن کا ستون

دلیپ کمار

منظر قاسمی

شاید ہی کوئی ایسا شخص ہو جو ذرہ برابر بھی ہندوستانی سنیما یا ادب سے دلچسپی رکھتا ہو اور یوسف سرور خان المعروف بہ دلیپ کمار کے نام نامی سے ناواقف ہو۔ ہر چند کہ وہ ہمارے عہد کے فلمی ہیرو قطعاً نہیں ہیں لیکن آزاد ہندوستان کے ہیرو ضرور تھے کیونکہ جس وقت ایک نیا ہندوستان تعمیر ہو رہا تھا تو جہاں اور بہت سی چیزیں طے ہو رہی تھیں وہیں یہ بھی طے ہو رہا تھا کہ آزاد ہندوستان کا نائک یا ہیرو کیسا ہونا چاہیے تو وہ دلیپ کمار کی شکل میں ہمارے سامنے پیش کیا گیا۔ دلیپ کمار آج کے موجودہ دور کے کسی بھی ہندوستانی فلمی ہیرو یا کسی اور شعبے کی نمایاں ترین شخصیت سے کم معتبر، مستند اور مقبول نہیں ہیں۔ آج کے دور میں کسی بھی فلمی شہنشاہ اور بادشاہ کے حصے میں جب تک دو تین سو فلمیں نہیں آجاتیں اس وقت تک وہ عظیم یا اہم فن کار نہیں مانا جاتا۔ مرزا اسد اللہ خان غالب محض نوے غزلوں کے دیوان کے بل بوتے پر آج تک پوری مملکتِ اردو غزل پر حکومت کر رہے ہیں اسی طرح یوسف خان (دلیپ کمار) بھی اپنی پوری زندگی میں محض ترسٹھ فلموں کی بدولت مملکتِ سنیما پر راج کر رہے ہیں۔ ایسی شخصیتوں کا شمار ان عہد ساز لوگوں میں ہوتا ہے جو زمین و زمان کی قید سے آزاد ہوتے ہیں اور جن کی مقبولیت کا دائرہ وقت گزرنے کے ساتھ بڑھتا چلا جاتا ہے۔ 'سوداگر' (1991) کے بعد 'قلعہ' (1998) دلیپ کمار کے کیریئر کی آخری فلم تھی اور اس کے بعد سے کبھی وہ پردۂ سیمیں پر بطور ہیرو یا اداکار نہیں نظر آئے حالانکہ ان کی زندگی کی پہلی فلم بطور اداکار 'جوار بھاٹا' (1944) تھی۔[1]

یہ عجیب بات ہے کہ دنیا میں زیادہ تر فن اور فنکاری میں کارہائے نمایاں انجام دینے والی شخصیات کسی اسکول، مکتب، درسگاہ یا دانش گاہ کی پروردہ نہیں تھیں بلکہ ان لوگوں نے اپنی ذاتی صلاحیت اور لیاقتِ فن و کمال کے بل بوتے پر اپنا نام روشن کیا۔ مقبول فدا حسین فلموں کے پوسٹر اور بینر بناتے بناتے ہندوستانی آرٹ کے مایہ ناز انٹرنیشنل آرٹسٹ کہلائے۔ 'مغل اعظم' کے ہدایت کار کمال الدین آصف ہندوستان کے صنعتی شہر ممبئی (بمبئی) میں ایک معمولی درزی تھے جو ایک ایسی فلم کا خواب سجائے بیٹھے تھے جو ہر عہد کا شاہکار ہو اور وہ اس خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے لیے ایسی جستجو، جتن، لگن اور جد و جہد کرتے رہے جو ناممکنات سے کم نہیں ہے۔ اسی طرح دلیپ کمار بھی کسی ایکٹنگ اسکول یا کسی درونا چاریہ کے پروردہ نہیں تھے بلکہ اداکاری سے والہانہ لگاؤ اور اپنی ذاتی صلاحیت اور دلچسپی کے سبب ایکٹنگ کا ایک ایسا ادارہ بن گئے جس سے ہر ایک بڑے فن کار نے کچھ نہ کچھ ضرور سیکھا۔ نہ صرف یہ کہ ان سے سیکھا بلکہ زیادہ تر صف اول کے فلمی اداکاروں کی ایکٹنگ پر ان کا عکس صاف دکھائی دیتا ہے۔

یوسف خان فقط اداکاری کا ایک ادارہ ہی نہیں تھے بلکہ وہ تہذیب و ادب کا بھی ایک اسکول یا دبستان تھے۔ وہ اردو زبان و ادب اور شعر و شاعری کا ایک رچا بسا اور نکھرا ہوا ذوق رکھتے تھے۔ وہ جب بھی بات کرتے تھے تو ایسا لگتا تھا کہ تہذیب بول رہی ہے اردو کے الفاظ اور جملے ان کی زبان سے ایسے نکھر کر اور سج سنور کر ہمارے گوش تک پہنچتے تھے جیسے کوئی کانوں میں شہد گھول رہا ہے جس کی شیرینی میں ایک قسم کی وارفتگی اور مدہوشی کا عنصر تھا۔ ان کا لہجہ بہت ہی نرم، نازک، شائستہ اور شگفتہ تھا جس میں کہیں بھی غرور، تکبر اور خود پرستی کی جھلک تک نہیں تھی۔ طبیعت اور مزاج میں خاکساری، انکساری اور قلندری کی لہریں موجزن تھیں اور یہ لگتا ہی نہیں تھا کہ کروڑوں دلوں پر حکومت کرنے والا شخص اس قدر مہذب، شائستہ اور منکسر المزاج بھی ہو سکتا ہے۔ 'مغل اعظم' (1960) کا شہزادہ سلیم جب فلم میں مکالمے ادا کرتا ہے تو زبان و بیان، جاہ و حشم، جاہ و جلال، تمکنت، نرمی، شگفتگی، عاشقانہ انانیت اور شان و شوکت کا عالم یہ ہوتا ہے کہ فلم کے ایک ایک جملے زبان زدِ خاص و عام بن جاتے ہیں۔ ان کے تمام انٹرویو، گفتگو اور بات چیت کو سنیے تو سب میں اردو زبان و ادب کا ایک رچا بسا شعور دیکھنے اور سننے کو ملتا ہے۔ وہ اردو اور فارسی ادب کے دلدادہ تھے اور اس زبان کے تمام بڑے شاعروں اور ادیبوں کے بیشتر اشعار ان کو یاد تھے۔ میر و غالب، فیض، فراق، جوش اور حافظ و خیام کے دیوان سے ان کی باقاعدہ واقفیت تھی۔ وہ جس وقت کسی موضوع پر اظہارِ خیال کرتے ایسا لگتا تھا کہ کوئی دانشور اور صاحبِ علم و فن بول رہا ہے۔ ان کی ذاتی لائبریری کے متعلق مشہور ہے کہ وہ ممبئی کی بڑی لائبریریوں میں سے ایک ہے۔ اکثر و بیشتر موقع و مقام پر وہ اردو فارسی کے استاد شعرا کے اشعار سنایا کرتے تھے۔ ہندی اور انگریزی بھی وہ ایسی بولتے تھے کہ لوگ حیران و ششدر رہ جاتے تھے۔ پشتو اور پنجابی ان کی مادری

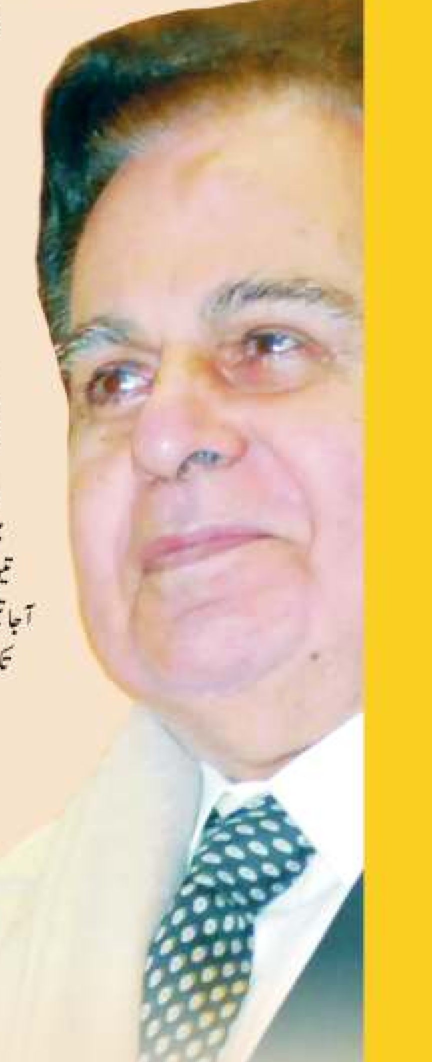

زبان تھی۔ زبان و بیان کی ندرت ونزاکت، لطافت و خوش ادائیگی اوراس کے زیر و بم سے خاطر خواہ واقفیت رکھتے تھے۔ ان کا شین قاف یعنی تلفظ اور مخرج بھی بہت نکھرا ہوا تھا ایسا محسوس ہوتا تھا کہ انھوں نے اپنی زبان سے الفاظ اور جملوں کی ادائیگی میں لطافت اور شیرینی گھول کر کانوں میں ڈال دی ہے۔ جدید غزل کے معتبر شاعر ڈاکٹر بشیر بدر کا یہ شعر ان کی شخصیت اور ذات پر بہت صادق ہے کہ

وہ عطردان سا لہجہ میرے بزرگوں کا
رچی بسی ہوئی اردو زبان کی خوشبو

یوسف خان اپنے نام کی معنویت کے اعتبار سے نہایت ہی خوبصورت اور دلکش تھے۔ وہ ایک خوش لباس اور وضع دار انسان تھے زیادہ تر محفلوں اور تقاریب میں وہ کوٹ پینٹ اور ٹائی جیسے مغربی طرز کے لباس میں نظر آتے تھے۔ ان کے لباس کا رنگ کافی نفیس، شائستہ اور مہذب ہوتا تھا سفید رنگ کے وہ دلدادہ تھے ان کا کہنا تھا کہ 'White is white and off white is off white' اس کے علاوہ پٹھانی سوٹ ان پر بہت دیدہ زیب لگتا تھا خلوت میں وہ کریم کلر یا ہلکے بادامی یا سفید رنگ کا ہی لباس زیب تن کیے رہتے تھے۔ پاکستان کے ایک بہت بڑے فنکار سہیل احمد عزیزی ایک دفعہ ان سے ملنے ممبئی تشریف لائے تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ دلیپ کمار دھوتی کرتا پہنے ہوئے پنجابی بول رہے ہیں'۔[2]

دلیپ کمار نے جس دور میں فلموں میں قدم رکھا اس زمانے میں اچھے خاندان والے لوگوں کا فلموں میں کام کرنا معیوب سمجھا جاتا تھا اور فلموں میں اداکاری کو لوگ بہت اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ بی بی سی کو دیے ایک انٹرویو میں دلیپ کمار نے بتایا کہ 'یوسف خان کو بھی ایک حد تک فلموں میں کام کرنے کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔'[3] یہی وجہ تھی کہ ان کے والد کو اس بات کا پتہ نہ لگ جائے کہ صاحبزادے فلموں میں اداکاری کر رہے ہیں اس لیے انھوں نے اپنا نام یوسف خان سے دلیپ کمار رکھ لیا۔ اس وقت تک پرتھوی راج کپور، دیویکا رانی، وی ایم سرکار، نتن بروا اور وی شانتا رام جیسے لوگ تھے جو فلموں میں کام کر رہے تھے اور لوگ ان کا احترام کرتے تھے۔ فلمی اداکاری نے دلیپ کمار کو اس مقام پر پہنچا دیا جہاں وہ 'شہنشاہ جذبات' کے خطاب سے یاد کیے جاتے ہیں۔ انھوں نے بیشتر فلموں میں اک عاشق نامراد اور ناکام عاشق کے بطور کردار نبھایا اسی لیے وہ 'ٹریجڈی کنگ' کے لقب سے یاد کیے جاتے ہیں۔ اس معاملے میں ان کا کہنا بھی تھا کہ فلم اگر طربیہ ہے تو لوگ اس کی کہانی اور کردار کو بہت جلدی بھلا دیتے ہیں مگر فلم اگر المیہ ہے تو اس کی کہانی اور کردار ناظرین کے دلوں میں بڑی گہرائی تک نقش ہو جاتے ہیں۔ مگر ٹریجڈی سین کی اداکاری کرتے کرتے اکثر اداکار بھی اس کا حصہ ہو جاتا ہے۔ اس دائرے سے نکلنے کے لیے انھوں نے درمیان میں کچھ کامیڈی اور ہلکی پھلکی کامیڈی والے ہیرو کا رول ادا کیا جیسے 'شبنم'، 'آزاد'، 'کوہ نور' اور 'رام اور شیام' جیسی طربیہ فلمیں کیا جو شائقین اور ناظرین کو بہت پسند آئیں۔ اس قسم کے رول کے متعلق ان کا کہنا ہے کہ ایک ایکٹر کو ہمیشہ چیلنجنگ رول کرنا چاہیے کیونکہ اس سے اس کی اداکاری کی مشق اور ریاضت ہوتی ہے ورنہ آپ کو ایک خاص فریم میں اداکاری کرنے والا اداکار سمجھا جانے لگتا ہے۔[4]

دلیپ کمار نے پوری عمر اپنی شخصیت اور فن کو سجانے سنوارنے میں بڑی محنت کی کیونکہ ان کا ماننا تھا کہ پردے کے ہیرو سے الگ ہٹ کر آپ کو اپنی امیج بنانا چاہیے کیونکہ زیادہ تر ناظرین یا پرستاروں کے دل و دماغ میں آپ کی فلمی امیج ہی رچی بسی رہتی ہے جس پر وہ فریفتہ رہتا ہے لیکن اس سے قطع نظر ایک اداکار کو سماج میں سادگی اور شرافت سے مزین امیج کا نمونہ پیش کرنا چاہیے۔ جہاں تک فلموں میں موضوعات اور مسائل کو برتنے کا سوال ہے اس مسئلے پر ان کی رائے بالکل ادب کی طرح ہے کہ بقول ٹی ایس ایلیٹ 'ادب میں سب سے پہلے ادبیت ہونا چاہیے اس کے بعد کچھ اور'۔

'فلم کو ایک بہتر کہانی پیش کرنی چاہیے جس میں کردار عمدہ اور جامع ہوں اور اس میں صحت مند تفریح کا خیال رکھا جائے اور فلم کو کوئی پروپیگنڈہ قطعی نہیں ہونا چاہیے اور نہ ہی اسے وعظ و نصیحت کا انبار ہونا چاہیے کہ ناظرین کے دل و دماغ پر گراں گزرے۔ اچھی فلم، اچھے خیالات اور اچھے کانفلکٹ (Confilict) کا بذات خود سماج یا معاشرے پر مثبت اثر پڑے گا۔ فلم کو میڈیم آف پروپیگنڈہ ہونے سے احتراظ کرنا چاہیے۔'[5]

فلم سازی کی صنعت میں ہندوستان دنیا میں دوسرے نمبر پر آتا ہے لیکن جہاں تک معیار اور تکنیک کا تعلق ہے تو ہندوستان کی فلمی صنعت دنیا کے ترقی یافتہ ممالک کی صنعتوں سے کافی پیچھے ہے لیکن ہندوستانی سنیما باقی دنیا سے اس لیے مختلف اور منفرد ہے کیونکہ یہاں فلمی نغموں کے بغیر کسی فلم کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ ایران ایک مذہبی ملک ہونے کے سبب بچوں سے متعلق فلموں پر اپنی تمام تر توانائی صرف کرتا ہے کیونکہ ہندوستان یا دیگر ممالک کی طرح عشق و محبت اور رومانس کے جذبات و احساسات کو جس قدر فنی آزادی سے یہاں پیش کیا جا سکتا ہے ایران میں ممکن نہیں ہے۔ لیکن ہندوستانی، ایرانی، مصری اور پاکستانی سنیما یعنی مشرقی سنیما بقول دلیپ کمار کئی لحاظ سے اور کئی رخ سے پسماندہ ہیں اور ہمیں مزید ترقی کرنا ہے۔

1989 میں کنور مہیندر سنگھ بیدی سحر کے نام سے معنون ایک شام میں بطور مہمان خصوصی شرکت فرماتے ہوئے انھوں نے اردو زبان و ادب سے متعلق جذباتی لگاؤ اور دیرینہ رشتوں پر روشنی ڈالتے ہوئے تقریر میں فرمایا کہ:

''ہندوستان کے معاشرے کو اردو زبان نے بڑی زینت بخشی ہے بڑا حسن بخشا ہے۔ جو کیفیت اہل ایمان کی ہے وہی کیفیت زبان کی ہے۔ چہ جائے کہ ہندوستان اور لکھنؤ، الہ آباد اور دلی کی وہ کرخنداری زبان اب آپ کو ٹورنٹو میں سنائی دے گی اور وینکوور میں بھی مشاعرے ہوتے ہیں۔ لندن میں تو خیر سحر صاحب کی زیر سرپرستی کئی مشاعرے ہوئے۔ مجھے بھی اس تقریب میں شامل ہونے کا فیض میسر ہوا۔ جو لوگ اس زبان سے ناواقف ہیں یا جو لوگ اس زبان کو نہیں سمجھتے لیکن اس کی لوچ اور اس کی کھنک کو بہت پسند کرتے ہیں۔''[6]

دلیپ کمار زبان اور ادب کے بہت بڑے عاشق اور پرستار تھے یہی وجہ تھی کہ اس وقت کے بڑے بڑے مشاعروں میں شرکت کرتے تھے۔ اردو ادب سے ان کے والہانہ عشق کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ غالب انسٹی ٹیوٹ جب غالب صدی منعقد کر رہی تھی اس وقت وہ کمیٹی کے رکن بھی رہے۔ ایک دفعہ کی بات ہے کہ فیض احمد فیض جب پہلی مرتبہ بمبئی (ممبئی) تشریف لائے تو دلیپ کمار نے منتظمین سے خصوصی طور سے کہا تھا کہ فیض صاحب کا ان کی شایان شان استقبال کیا جائے۔ اس بات کا فیض احمد فیض نے اپنے کسی یادناچے میں ذکر کیا ہے کہ جب میں نے اپنی بیٹیوں سلیمہ اور منیزہ سے پوچھا کہ میں ہندوستان جا رہا ہوں تو وہاں سے کیا لاؤں تمھارے لیے تو انھوں نے کہا کہ آپ بمبئی جا رہے ہیں تو ہمارے لیے وہاں سے یوسف خان یعنی دلیپ کمار صاحب کا آٹوگراف لے کر آئیے گا۔ جس وقت دلیپ کمار ان سے ملنے آئے تو وہ خود ہی اپنی کوٹ میں ایک ڈائری لے کر آئے تھے کہ وہ فیض صاحب کا آٹوگراف لیں گے۔ جب فیض پاکستان واپس پہنچے تو انھوں نے اپنی بیٹیوں سے کہا کہ وہ تو آٹوگراف کی ڈائری ہندوستان میں ہی بھول گئے کیونکہ دلیپ کمار خود ہی مجھ سے آٹوگراف لینے کے لیے آئے تھے۔[7]

زبان و ادب کی متقاضی طبیعت اور ساحری نیز شعر و شاعری میں الفاظ کی سحر انگیزی پر گفتگو کرتے ہوئے شہنشاہ

جذبات دلیپ کمار اور ملکۂ ترنم نور جہاں نے 1983 میں دوردرشن کے ایک پروگرام میں دوران گفتگو جو نکات بیان کیے ہیں وہ الفاظ اور معانی کے علاوہ لفظوں کی کھنک اور چمک دمک اور ان کا زیر و بم ہم پر بڑی حد تک واضح کرتے ہیں۔ جہاں تک فلموں میں کرداروں کے مکالمات کو ادا کرنے کی بات ہے اس کو دلیپ صاحب سے بہتر کون بتا سکتا ہے لیکن اس سے خاطر خواہ واقفیت رکھنے کے باوجود جب وہ نور جہاں سے یہ سوال پوچھتے ہیں کہ جہاں تک گانے کا تعلق ہے اس میں لفظ کہاں تک اہم ہیں تو اس کا جواب نور جہاں کچھ اس انداز سے دیتی ہیں کہ الفاظ کا بہت بڑا ہاتھ ہوتا ہے اچھے الفاظ ہوں تو گانے والا انسپائر ہوتا ہے اچھے الفاظ جذبات کو اکساتے ہیں۔ گانے کے اپنے بھی آداب ہیں۔ اگر شاعری اچھی نہ ہو تو گانے والا ادھورا محسوس کرتا ہے۔ دلیپ کمار نے نور جہاں کے متعلق بتایا کہ جب وہ غزل سرائی کرتی ہیں تو گائیکی کے جو آداب ہوتے ہیں ان کو نور جہاں ملحوظ خاطر رکھتی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ گائیکی الفاظ کو نکھارتی ہے اور گائیکی کو الفاظ پر حاوی نہیں ہونا چاہیے کہ بالکل وہ بکھر جائیں۔ اکثر یہی ہوتا ہے کہ گانے والے آئے، شعر تو بہت عمدہ ہے کہ

جب بہ تقریب سفر یار نے محمل باندھا
تپشِ شوق نے ہر ذرے میں اک دل باندھا
غالب

یہاں پر اکثر گانے والے بہ تقریب سفر کو متعدد سروں کے ذریعے ادا کرنے میں اپنا تمام تر زور صرف کر دیتے ہیں اور نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ مصرعے اور شعر کا مطلب فوت ہو جاتا ہے اور بس سُر اور تان ہی سامعین تک پہنچ پاتی ہے۔'[8]

موسیقی اور گائیکی کے رموز و اسرار پر مبنی یہ مباحثہ سامعین کو فن موسیقی اور غزل گائیکی کے بعض ایسے گوشوں کو منور کرتا ہے جس سے عام سامع یا قاری نا آشنا ہوتا ہے۔ ویسے دلیپ کمار خود بھی بلا کے غزل گو تھے۔ بی بی سی ہندی سروس سے وابستہ مہیندر کول کے ساتھ دوران گفتگو اُن کے اصرار پر غزل کے دو تین شعر اپنی آواز اور اپنے منفرد انداز میں دلیپ کمار نے گا کر ایسا سماں باندھا جس کو سن کر ایسا لگا کہ وہ فن غزل گوئی اور فن موسیقی کی باریکیوں اور نزاکتوں سے خاطر خواہ واقفیت رکھتے تھے۔

دلیپ کمار کو جب فلم 'کوہ نور' کے ایک گیت میں ستار بجانا تھا تو انھوں نے استاد عبدالحلیم جعفر خان صاحب سے باقاعدہ ستار بجانے کی تربیت حاصل کی اور ریاضت اس قدر کی کہ وہ ستار بجاتے بجاتے اپنی انگلی تک زخمی کر بیٹھے۔ اس کے علاوہ فلم 'نیا دور' میں ان کو ایک کوچ وان کا کردار ادا کرنا تھا تو دلیپ کمار نے باقاعدہ تانگہ چلانے کی تربیت حاصل کی۔ 'گنگا جمنا' کے حوالے سے بالی ووڈ کے مقبول فن کار امیتابھ بچن نے اپنی نوجوانی کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ میں نے اس فلم کو متعدد مرتبہ فقط اس لیے بھی دیکھا کہ کیسے ایک پیشاوری پٹھان گنگا نام کے ایک دیہاتی کردار میں اودھی زبان کو اس قدر مہارت اور کمال کے ساتھ بولتا ہے کہ دیکھنے والا حیرت میں پڑ جائے۔ حالانکہ پشاوری پٹھان کا اتر پردیش سے دور دور تک کوئی واسطہ نہیں۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ دلیپ کمار نے جس بھی کردار کو اٹھایا تو اس میں ڈوب گئے اور اتنا ڈوب گئے کہ جب کسی سین میں اس کو ادا کیا تو دیکھنے والے بڑے سے بڑے آرٹسٹ نے یہ کہا کہ جس کردار کو دلیپ کمار نے نبھا دیا اس کا متبادل اور اس سے بہتر کوئی دوسرا نہیں کر سکا ہے۔

دلیپ کمار کی اداکاری کے نقوش اس عہد کے ہر ایک بڑے اسٹار کے یہاں ملتے ہیں۔ پوری فلم انڈسٹری انھیں کی اداکاری کی کاپی یا نقل کرتی ہے۔ اداکاری کے باب میں وہ ایک پیر و مرشد کا درجہ رکھتے ہیں باقی تمام اداکاران کے مرید اور شیدا نظر آتے ہیں۔ بین الاقوامی شہرت یافتہ ہدایت کار اور آسکر اعزاز یافتہ ستیہ جیت رے نے ان کو میتھڈ ایکٹر تسلیم کیا ہے۔ دلیپ کمار نے اپنے طرز کی ایک نئی ایکٹنگ کی قواعد لکھی اس کا گرامر از خود بنایا زبان اور طرز ادا کے وہ موجد تھے۔ یہ کوئی رائے نہیں ہے بلکہ یہ ایک تاریخ ہے۔ مقبول مکالمہ نگار اور نغمہ نگار جاوید اختر نے نومبر 2016 میں دلیپ کمار کی کتاب 'دی سبس ٹینس اینڈ دی شیڈو' (Dilip Kumar: The Substance and The Shadow, an Autobiography) کی رسم اجرا کی تقریب میں بولتے ہوئے یہ بتایا کہ:

''پوری دنیا میں پہلا میتھڈ ایکٹر کوئی اور نہیں بلکہ دلیپ کمار ہی ہے۔ سنیما کی دنیا جو کہ چکا چوندھ اور اسٹار ڈم کی کائنات ہے اس میں ساٹھ ستر برس تک اپنا دبدبہ قائم رکھنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ لوگ بدل جاتے ہیں، جمالیاتی قدریں بدل جاتی ہیں، اخلاقی قدریں بدل جاتی ہیں اور خواہشات بدل جاتی ہیں لیکن ہم نے دیکھا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کے پرستار اور شائقین کا حلقہ بڑھتا ہی رہا۔[10]

دنیا میں بہت ہی کم لوگ ایسے ہیں جو پورے عالم میں مشہور اور مقبول ہونے کے باوجود کسی بھی قسم کے تکبر، غرور، انا، خود پسندی اور خود پرستی کے مرض سے کوسوں دور ہوں۔ یوسف خان ایک عظیم فن کار ہی نہیں بلکہ ایک اعلیٰ اور ارفع انسان بھی تھے جنھوں نے تمام عمر اپنے وقار، حرمت اور پاکیزگی نفس کا لحاظ اور پاس رکھا۔ ان کی زندگی میں بلا کا توازن تھا اور وہ کبھی بھی عزت، شہرت، دولت اور ناموری کے نشے میں ڈوبے نہیں۔ انھوں نے نعیم اختر کے ساتھ ایک انٹرویو میں شہرت اور ناموری کو بیماری اور مرض سے تعبیر کیا۔ وہ کہتے تھے کہ ذرا سی شہرت پاتے ہی یہاں انڈسٹری میں لوگ زمین کی سطح سے اوپر چلنا شروع کر دیتے ہیں۔ لیکن ایسے لوگوں کو چاہیے کہ ان کا ذہن و دل زمین پر جما رہے۔ انسانیت کی قدروں اور اس کے مرکز سے ہٹے نہیں اور اپنی شہرت سے خود ہی متاثر نہ ہو جائے۔ اس لیے میں نے اس مرض کے علاج کے لیے انسانیت کے فلاحی امور کو انجام دینا شروع کر دیا۔ غریب، معذور اور ذہنی طور سے معذور بچوں کے لیے چلائے جانے والے پروگرام میں شرکت کرتا ہوں اور ایسے لوگوں کی زندگی میں خوشیاں لانے کے لیے میں ہر طرح کا تعاون کرتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ دلیپ کمار کو فقط ایک بین الاقوامی شہرت یافتہ فن کار کے بطور ہی نہیں جانا اور پہچانا جاتا ہے بلکہ دیگر انسانی اور آفاقی قدروں کے امین تھے اور اپنے فن اور شخصیت سے ایک ایسے ہندوستان کی تصویر پیش کرتے ہیں جس میں رواداری، اخوت، مروت، ہمدردی، اخلاص اور امن عالم کو فروغ ملتا ہے۔

حواشی:

1. دی ٹائمس آف انڈیا، لکھنؤ ایڈیشن، 8 جولائی، 2021
2. بی بی سی اردو سروس، یوٹیوب پوسٹ 9 جولائی 2021، (صحافی طاہر سرور میر اور پاکستانی آرٹسٹ سہیل احمد عزیزی کی دلیپ کمار سے بات چیت)
3. بی بی سی ہندی سروس، یوٹیوب پوسٹ 7 جولائی 2021 (صحافی ونود پانڈے کی دلیپ کمار سے بات چیت)
4. بی بی سی ہندی سروس (برمنگھم میں) مہیندر کول کی دلیپ کمار سے بات چیت، 1980، یوٹیوب پوسٹ 10 ستمبر 2016
5. ایضاً
6. جشن سحر، کنور مہیندر سنگھ بیدی سحر، 1989، یوٹیوب پوسٹ
7. ساہتیہ تک (آج تک)، 7 جولائی 2021، ڈاکٹر کمار وشواس اور شوبھا سنگھ کی بات چیت
8. گفتگو: نور جہاں اور دلیپ کمار، دوردرشن بمبئی کیندر، 1983، پرسار بھارتی آرکائیوز (www.archives.prasarbharti.org)
9. دلیپ کمار: دی سبس ٹینس اینڈ دی شیڈو لانچ، یوٹیوب پوسٹ، 23 نومبر 2016، نئی دہلی 24 تاس

■

Dr. Muntazir Qaimi
Department (Urdu)
FAA Govt. PG College
Mahmudabad (Awadh)
Sitapur -261203 (UP)
Mob.:8127934734

اردو لوک گیتوں کے امتیازات

عبداللہ امتیاز احمد

> لوک گیت ہمارا قومی سرمایہ ہے جس کا نمونہ مختلف مواقع پر اکثر و بیشتر ہمارے گھروں میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ مختلف علاقوں سے تعلق رکھنے والے لوک گیتوں کی زبان ضرور بدلی ہوئی معلوم ہوتی ہے مگر ان سب کا بنیادی جذبہ ایک ہی ہے کیوں کہ لسانی تفریق کی وجہ سے ایک ہی لوک گیت مختلف مقامات پر مختلف طریقے سے گایا جاتا ہے جس کی وجہ سے الفاظ اور آوازوں میں واضح طور پر فرق دکھائی دیتا ہے مگر ان کے جذبات و خیالات میں یکسانیت پائی جاتی ہے۔

لوک گیت لوک ادب کی اہم شاخ ہے جس میں زندگی کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی کی جاتی ہے۔ اس میں انسان کی پیدائش سے لے کر موت تک کے تمام موضوعات بیان کیے جاتے ہیں۔ لوک گیت میں عوام کے جذبات کا فطری اور براہ راست اظہار ہوتا ہے یہ عوام کے ذہنوں میں محفوظ رہنے والا وہ ادبی سرمایہ ہے جو کبھی ضبط تحریر میں نہیں آیا اس لیے آج تک لوک گیتوں کی کوئی تحریری شکل دستیاب نہیں ہوئی۔ اس میں انسان کے دلوں کی آوازیں واضح طور پر سنی جا سکتی ہیں جس میں انسان کے سادہ جذبات بیدار نظر آتے ہیں اور اجتماعی خوشیوں اور غموں کا اظہار ہوتا ہے۔ انسان اپنی خوشیوں کا جسمانی اظہار رقص کے ذریعے اور زبانی اظہار گیت کے ذریعے کرتا ہے۔ در اصل جب انسان بے انتہا خوش ہوتا ہے تو کچھ نا کچھ گنگناتا ہے اور جب کبھی خوشی کی انتہا ہوتی ہے تو اپنے جسمانی اعضا کو بھی حرکت دینے لگتا ہے۔ یہیں سے رقص کا آغاز ہوتا ہے اور جب ان جذبات کو گیت کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے تو اسے لوک گیت کہتے ہیں۔

لوک گیت زمانی اعتبار سے اتنے ہی قدیم ہیں جتنی خود انسانی تہذیب۔ قدیم عہد میں لوگ اپنی خوشیوں کا اظہار مختلف طریقوں سے کرتے تھے اور ان کی اس خوشی میں معاشرے کا ہر فرد شامل رہتا تھا۔ اس موقع پر سارے لوگ ناچ گا کر اپنی خوشیوں کا اظہار کرتے اور غموں میں بین کرتے تھے۔ حقیقت میں دیکھا جائے تو جب انسان کا وجود عمل میں آیا تو سب سے پہلے اس نے اپنی بات سمجھانے کے لیے اشاروں کا استعمال کیا بعد میں زبان وجود میں آئی جب زبانی شکل میں اس نے اپنی بات کو پیش کیا تو سب سے پہلے اس نے نظم کو اپنا وسیلۂ اظہار بنایا۔ یعنی شعری زبان کا استعمال کیا جب یہی وسیلۂ اظہار شعری پیکر میں ڈھلنے لگے تو لوک گیت کا وجود عمل میں آیا۔ لوک گیت کے ابتدائی نمونے ہمیں قدیم مذہبی مقدس کتابوں میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ وید، پران اور اپنشد میں لوک گیت کے ابتدائی نمونے موجود ہیں جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ لوک گیتوں کی روایت بہت قدیم ہے۔ ویدوں میں سب سے پہلے گاتھا اور گاتھن لفظ استعمال ہوا ہے جس سے یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ لوک گیتوں کی روایت دور قدیم سے چلی آ رہی ہے۔ پراکرت اور اپ بھرنش زبانوں میں بھی لوک گیت کے نمونے دستیاب ہیں۔

سب سے پہلے لوک گیت کب وجود میں آیا؟ اس کا پختہ ثبوت ہمارے پاس موجود نہیں ہے کیوں کہ لوک گیتوں کا کوئی قلمی نسخہ ابھی تک دستیاب نہیں ہوا ہے جس کی بنیاد پر لوک گیت کی ابتدا اور ارتقا کی کہانی بیان کی جا سکے۔ ہاں اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ ویدوں سے لوک گیت کی روایت کی ابتدا ہوتی ہے۔ اس کے بعد مختلف مذاہب کی مقدس کتابوں میں اس کے ابتدائی نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں البتہ ان گیتوں میں پیش کردہ معاشرے اور نظام سیاست کو دیکھتے ہوئے یہ ضرور اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان گیتوں کا تعلق کس عہد سے رہا ہوگا۔ یہ لوک گیت نہ نئے ہوتے ہیں نہ پرانے بلکہ اس کی جڑیں ماضی میں پیوست ہوتی ہیں۔ لوک گیت ہمارا قومی سرمایہ ہے جس کا نمونہ مختلف مواقع پر اکثر و بیشتر ہمارے گھروں میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ مختلف علاقوں سے تعلق رکھنے والے لوک گیتوں کی زبان ضرور بدلی ہوئی معلوم ہوتی ہے مگر ان سب کا بنیادی جذبہ ایک ہی ہے کیوں کہ لسانی تفریق کی وجہ سے ایک ہی لوک گیت مختلف مقامات پر مختلف طریقے سے گایا جاتا ہے جس کی وجہ سے الفاظ اور آوازوں میں واضح طور پر فرق دکھائی دیتا ہے مگر ان کے جذبات و خیالات میں یکسانیت پائی جاتی ہے۔ عام طور پر لوک گیت مندرجہ ذیل موضوعات پر مشتمل ہوتے ہیں:

i. بچے کی پیدائش کے موقعے پر گائے جانے والے

مختلف اقسام کے گیت

ii. شادی بیاہ کے موقعے پر گائے جانے والے گیت
iii. موسموں اور تہواروں سے مناسبت رکھنے والے گیت
iv. پیشہ ورانہ افراد کے گیت

مذکورہ بالا امور پر بحث کرنے سے قبل یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ لوک گیت کے لفظ، ہیئت اور تعریف پر ایک نظر ڈالی جائے۔

انگریزی ادب میں لوک گیت اور لوک کتھاؤں کے لیے Ballad لفظ استعمال ہوا ہے، Ballad کا مادہ دراصل لاطینی زبان کا لفظ (بے لارے) ہے رابرٹس گریس نے لکھا ہے کہ اس کا تعلق Balle لفظ سے ہے اس کا مطلب اس گیت سے تھا جو گیت رقص کرتے وقت گایا جائے مگر بعد میں اس کا استعمال ہر طرح کے گیتوں کے لیے ہونے لگا۔

لوک گیت کی تعریف:

Understanding Poetry کے مصنف جیمس ریوس لوک گیت کی تعریف اس طرح بیان کرتے ہیں:

''لوک گیت عوام کے جذبات کا براہ راست اور فطری اظہار ہوتے ہیں، یہ عوام کے ذہن میں محفوظ رہنے والا وہ ادبی سرمایہ ہے جو ضبط تحریر میں نہیں آتا ہے۔'' (ص ۲۱)

پنڈت رام نریش ترپاٹھی لوک گیت کی تعریف یوں بیان کرتے ہیں:

''ان پڑھ دیہاتیوں کے دلوں سے نکلے ہوئے وہ جذباتی بول جو شعری اور لسانی پابندیوں سے آزاد ہوں پھر بھی ان میں لحن اور ایک قسم کا میٹھا سر ہے۔''

(پنڈت رام نریش ترپاٹھی، گرام گیت، کویتا کومدی، ص4)

اڑیسہ کے مشہور لوک ادیب K. B. Das لوک گیت کی تعریف اس طرح بیان کرتے ہیں:

''عوام کے دلوں سے نکلے ہوئے بول جو غیر اختیاری طور پر اضطراری حالت میں کسی المناک یا طربناک جذبے سے تاثر کے بعد نکل جاتے ہیں۔''

(بحوالہ اظہر علی فاروقی: اتر پردیش کے لوک گیت، ص18)

ڈاکٹر مجیب الاسلام لوک گیت کی تعریف ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

''لوک گیت عوامی ادب کی وہ مشہور صنف سخن ہے جو انسانی پیدائش سے ظہور میں آئی۔ اس کی جغرافیائی حد بندیاں تو ضروری ہیں۔ لیکن اس کے باوجود یہ عوام کے ذہنوں میں محفوظ رہنے والا وہ قیمتی سرمایہ ہے جسے ضبط تحریر میں نہیں لایا جاتا تھا۔ یہ ان عوام کے داخلی جذبات کا فطری اظہار ہے۔ اس کا خاص کام خواتین کے جذبات کا بے اختیار اور ان کے بھرپور احساسات کا بیان ہوتا تھا۔''

(مرتبہ: پروفیسر قمر رئیس، اردو میں لوک ادب، ص284)

اس طرح لوک گیتوں کی بیان کردہ تعریفوں کی بنیاد پر لوک گیتوں کے واضح نقوش ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ ان تعریفوں کو پڑھنے کے بعد ان کی تاریخ کا عکس بھی واضح طور پر ہمارے سامنے آتا ہے۔ لوک گیت ہمارے ماضی کی زندگی کے عکاس ہیں جس میں عوام کے جذبات، خیالات و نظریات کا گہرا عکس نظر آتا ہے۔ اس میں عوام کی سادگی اور معصومیت واضح طور پر دیکھی جا سکتی ہے۔ چونکہ اس کا ماخذ انسان کا دل ہوتا ہے اس لیے ایک دل کی بات دوسرے دل پر گہرا اثر ڈالتی ہے۔ لوک گیت کے چند الفاظ ہماری زندگی کے تاریک پہلوؤں کو روشن تر بنا دیتے ہیں۔ اس میں پوری قوم کی تہذیب و تمدن کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ عموماً لوک گیتوں میں سنجیدگی، سادگی اور بے ساختگی پائی جاتی ہے۔ لیکن کبھی کبھی گیتوں میں گہرا طنز بھی دیکھنے کو مل جاتا ہے۔ لوک گیتوں کی کوئی تحریری شکل دستیاب نہیں ہے۔ یہ زیادہ تر سینہ بہ سینہ ایک شخص سے دوسرے شخص تک پہونچتا رہتا ہے۔ لوک گیت اور ہماری تہذیب و تمدن کے درمیان ایک گہرا رشتہ پایا جاتا ہے۔ اسی لیے لوک گیتوں میں ایک مخصوص سماج کا عکس واضح طور پر دیکھنے کو ملتا ہے۔ ان لوک گیتوں میں سماج اور انسانی زندگی کے بے شمار پہلوؤں کی عکاسی کی جاتی ہے۔ لوک گیتوں کی نوعیت انفرادی کے ساتھ اجتماعی بھی ہے۔ کیونکہ اس میں مشترکہ طور پر پورے سماج کے رسم و رواج، عقائد و توہمات اور عادات و اطوار کا بیان ہوتا ہے اور ان لوک گیتوں کی تخلیق میں پورے معاشرے کے لوگ شامل رہتے ہیں۔ اس میں چھوٹے بڑے، اعلیٰ و ادنیٰ، امیر و غریب اور رؤسا و امرا سبھی کا ذکر ملتا ہے۔ عام طور پر دیہاتی زندگی کے ہر پہلو کا گیتوں میں ذکر ملتا ہے۔ اگر ہم لوک گیتوں کو دیہاتی لوگوں کا منظوم تذکرہ کہیں تو غلط نہ ہوگا۔ جیسا کہ اظہر علی فاروقی نے لکھا ہے:

''یہی وجہ ہے کہ لوک گیت کہنے پر عام طور پر وہ گیت سمجھے جاتے ہیں جو دیہاتیوں کی زندگی کے ترجمان ہوں۔ اور دیہاتی سماج کی نمائندگی کریں اور جس پر شہری زندگی اور تمدن کی چھاپ نہ ہو اور شاید اسی لیے لوک گیت کی اصطلاح سے پہلے ان کے لیے گرام گیت لفظ مستعمل رہا ہے۔'' (اتر پردیش کے لوک گیت، ص17)

لوک گیت کی تاریخ:

لوک گیت کی تاریخ پر نظر ثانی کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان لوک گیت کی روایت بہت قدیم ہے۔ یہاں تک کہ علما کا خیال ہے کہ یہ لوک گیت رگ وید سے قبل بھی گائے جاتے تھے۔ کیوں کہ رگ وید میں لوک گیت کا ذکر کئی مقام پر ملتا ہے۔ رگ وید کب تصنیف ہوا اس کی تاریخ آج تک طے نہیں کی جا سکی، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ لوک گیت کی روایت بہت قدیم ہے۔ رگ وید کے بعد مختلف مذہبی مقدس کتابوں مثلاً ارڑ یک برہمن، پران، مہابھارت اور رامائن وغیرہ میں بھی مختلف موقعوں پر گیت گانے کا ذکر ملتا ہے۔ کسی راجا کی ستائش اور یگیہ کے موقع پر بھی گیت گانے کا رواج عام تھا۔ جس کا ذکر کرتے ہوئے اظہر علی فاروقی لکھتے ہیں:

''عہد قدیم میں کسی فرماں روا کی کارگزاریاں، اس کے فلاح و بہبود کے کارناموں کی ستائش گاتھا بہت کچھ تبدیل ہو کر عوام کے زباں زد ہو جاتے تھے اور پیڑھی در پیڑھی اور سینہ بہ سینہ چلتے رہتے تھے۔ جو بعد میں جن گاتھا یا لوک گیت کے نام سے مشہور ہوئے۔'' (ایضاً ص19)

قدیم عہد میں یہ گیت ان ستائشی گاتھاؤں کے علاوہ شادی بیاہ کے موقعوں پر بھی گائے جاتے تھے۔ اس میں خصوصیت کے ساتھ دیوتاؤں کا ذکر کیا جاتا تھا۔ پارسیوں کی مذہبی کتاب 'اویستا' میں بھی پارسی مذہب کے بنیادی اصولوں کو گیتوں کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ گوتم بدھ کی پیدائش کے متعلق 'جاتک کتھاؤں' میں بھی خوبصورت گیت دیکھنے کو ملتے ہیں۔ مطالعہ کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ وکرم سنوت کی تیسری صدی میں جس وقت پراکرت زبان اپنے عروج پر تھی اس زبان میں بے شمار لوک گیت تخلیق کیے گئے۔ راجا شالی واہن کے عہد میں لوک گیت تخلیق کرنے اور گانے کا ذکر کئی مورخوں نے کیا ہے۔ یہاں تک کہ اس راجا نے تقریباً سات سو گیتوں کو محفوظ بھی کیا تھا۔

بالمیکی رامائن میں پروشوتم رام کی پیدائش کے وقت عورتوں کے ذریعے گیت گانے کا ذکر ملتا ہے۔ اس موقع پر گیت گانے اور رقص کرنے کا بیان تاریخ میں موجود ہے۔ کالی داس نے راجا دلیپ کے دربار میں گیت گانے اور طوائفوں کے ذریعے رقص کیے جانے کا بھی ذکر کیا ہے۔ صرف اتنا ہی نہیں محنت مزدوری کرتے وقت ایک ساتھ جمع ہو کر گیت گانے کا رواج عام تھا۔ سنسکرت کے مشہور شاعر وجکا نے ایک عورت کے ذریعے موسل سے دھان کوٹتے وقت خوبصورت گیت گانے کا ذکر کیا ہے۔ بلکہ ایک عورت کھانا بنا رہی ہے مگر لکڑی کے دھوئیں سے اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہا ہے۔ اس معمولی سے موقع پر بھی گیت گانے کا ذکر تاریخ میں ملتا ہے۔ اس طرح اگر

ہم دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ گیت گانے کا رواج زمانہ قدیم سے آج تک جاری وساری ہے۔

ان گیتوں کا سلسلہ مختلف ادوار سے ہوتے ہوئے مسلمانوں کے ہندوستان آنے تک جاری وساری رہا۔ مسلمانوں کی آمد کے بعد یہاں ایک نئی زبان وجود میں آنے لگی جسے بہت بعد میں اردو کے نام سے موسوم کیا گیا لیکن اس دوران بھی مقامی بولیوں میں لوک گیتوں کا چلن تھا کیونکہ فاتح اپنے ساتھ کوئی زبان لے کر نہیں آتا بلکہ وہ بہت حد تک مفتوح ہی کی زبان اور رسم ورواج میں گھلنے ملنے کی کوشش کرتا ہے۔اس طرح غیر ملکیوں اور مقامی افراد کے میل جول سے ایک مخلوط زبان وجود میں آئی مگر یہاں کے مقامی اثرات کی بنیاد پر ترکی اور فارسی زبان میں بھی گیتوں کا چلن ہوا یہاں تک کہ امیر خسرو کے عہد میں یہ اثرات واضح طور پر ہمارے سامنے آتے ہیں۔اس نئی زبان میں انھوں نے ایسے گیت تخلیق کیے جسے ہم لوگ گیت کہہ سکتے ہیں۔ جیسے قوالی، رنگ شریف، خیال اور قال وغیرہ راگوں کی ایجاد کی۔نمونے کے لیے ان کا یہ مکھڑا دیکھیے۔

دھیرے بہو ندیا مورے پیا ہیں اترت پار
گھی کے دہ نا بارو ندیا ہمرے گھر آئے محمدؐ بانرا

امیر خسرو سے یہ سلسلہ چلتا ہوا مغلیہ عہد تک پہونچا اور شہزادہ سلیم کی شادی کی تقریب میں دیسی بولیوں میں

لوک گیتوں کی کئی ایسی خصوصیات ہیں جو انہیں مروجہ شاعری سے الگ مقام عطا کرتے ہیں جیسے ان لوک گیتوں میں ردیف اور قافیہ کی قید و بند نہیں ہوتی بلکہ دیہاتی لوگوں کے جذبات کا برملا اظہار ہوتا ہے۔ اس میں وزن کی کوئی قید نہیں ہے۔ بلکہ گیت پڑھتے وقت حسب ضرورت گیت کی لے کو کھینچ تان کر پڑھنے سے وزن برابر ہو جاتا ہے۔ چونکہ لوک گیتوں کا عوام کے دلوں سے گہرا رشتہ ہوتا ہے اس لیے ان گیتوں میں پیچیدگی نہیں پائی جاتی بلکہ جیسی ان کی سیدھی سادی زندگی ہوتی ہے ویسے ہی وہ سیدھے سادے الفاظ میں اپنے جذبات کا اظہار بھی کرتے ہیں۔

راجپوتوں کے ذریعے گیت گانے کا ذکر ملتا ہے جو اس طرح ہے۔

تم شاہنشاہ ہم آپ کے داس
رہے کرم شاہ کا ٹوٹ نہ جائے آس

یہ سن کر اکبر نے جذباتی انداز میں کہا۔

ہم شاہنشاہ سہی پھر بھی آپ کے بھائی
اور راجکماری محل کی آبرو اور چوکھٹ کی لاج

اس طرح اندازہ ہوتا ہے کہ مغلیہ عہد میں ترکی اور فارسی گیتوں کے علاوہ مقامی گیت بھی مختلف موقعوں پر گائے جاتے تھے۔مثلاً شادی بیاہ،سنسکاروں اور دوسری تقریبات کے موقعوں پر ان گیتوں کا چلن عام تھا۔گیتوں کے رشتے کو انسانی تہذیب وتمدن سے جوڑتے ہوئے اظہر علی فاروقی نے لکھا ہے:

''بہر کیف گاتھا کا وجود بالکل نظر آتا ہے اور انسان میں جذبہ قدیم عہد سے پایا جاتا ہے اگر بنی نوع انسان اور شاعری دونوں ہم عمر کہے جاسکتے ہیں تو لوک گیتوں اور بنی نوع انسان کی ہم عمری میں بھی کوئی شبہ پیدا نہ ہونا چاہیے۔''(ایضاً ص 21)

لوک گیتوں کے امتیازات:

لوک گیتوں کی کئی ایسی خصوصیات ہیں جو انھیں مروجہ شاعری سے الگ مقام عطا کرتے ہیں جیسے ان لوک گیتوں میں ردیف اور قافیہ کی قید و بند نہیں ہوتی بلکہ دیہاتی لوگوں کے جذبات کا برملا اظہار ہوتا ہے۔ اس میں وزن کی کوئی قید نہیں ہے۔ بلکہ گیت پڑھتے وقت حسب ضرورت گیت کی لے کو کھینچ تان کر پڑھنے سے وزن برابر ہو جاتا ہے۔چونکہ لوک گیتوں کا عوام کے دلوں سے گہرا رشتہ ہوتا ہے اس لیے ان گیتوں میں پیچیدگی نہیں پائی جاتی بلکہ جیسی ان کی سیدھی سادی زندگی ہوتی ہے ویسے ہی وہ سیدھے سادے الفاظ میں اپنے جذبات کا اظہار بھی کرتے ہیں۔اسی لیے لوک گیت کی ایک تعریف یہ بھی ملتی ہے کہ''لوک گیت سیدھے سادے عوام کے دلوں سے نکلے ہوئے وہ احساسات و جذبات ہیں جو شعری اور لسانی پابندیوں سے آزاد ہوتے ہیں لیکن پھر بھی اس میں بلا کی تاثیر ہوتی ہے۔''

لوک گیتوں کا سب سے اہم وصف یہ ہے کہ اس کا تخلیق کار گمنام ہوتا ہے کیونکہ عام طور پر ان گیتوں کی تخلیق پورا معاشرہ مل کر کرتا ہے اس لیے اس کو کسی ایک شخص سے منسوب کرنا قطعی مناسب نہ ہوگا اور گیتوں میں چوں کہ تخلص کا بھی التزام نہیں ہوتا اس لیے ان گیتوں کے تخلیق کار کا علم نہیں ہو پاتا۔ کیونکہ لوک گیت غیر شخصی اور گم نام ہوتے ہیں یہ انفرادی نہیں بلکہ ایک اجتماعی صنف ہے اور نہ کبھی اسے ضبط تحریر میں لایا گیا۔ یہ صنف سینہ بہ سینہ رواں دواں ہے اور انسان کے دل و دماغ میں محفوظ رہتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ اکثر بہت سی چیزیں ایسے لوگوں سے منسوب کردی گئی ہیں جس کا تعلق اس سے دور کا بھی نہیں ہے۔اس کی بہترین مثال امیر خسرو کے بہت سے گیت، غزل، قوالی اور لاونیاں ہیں جنھیں اکثر و بیشتر امیر خسرو سے منسوب کر دیا گیا ہے لیکن تحقیق سے معلوم ہوا کہ ان چیزوں کا امیر خسرو سے کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

رابرٹ گریس نے لکھا ہے:

''موجودہ سماجی حالات میں کسی ادیب وشاعر کا گم نام ہونا اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ اسے اپنی تخلیق کو لوگوں کے سامنے پیش کرنے میں شرم آتی ہے، یا پھر ڈر لگتا ہے،لیکن قدیم سماج میں یہ صرف تخلیق کار کے نام کی بے توجہی کے سبب ہوتی تھی۔''

(The Old English Ballads P.12)

لیکن گیتوں کے متعلق بہت سے علما نے اس بات کو بھی تسلیم کیا ہے کہ ان لوک گیتوں کا کوئی خالق ضرور رہا ہوگا۔کچھ مغربی مفکرین بھی لوک گیتوں کا خالق کسی ایک شخص کو تسلیم نہیں کرتے ہیں لیکن جب تک ہمارے پاس مکمل شواہد موجود نہ ہوں ہم کوئی بات وثوق سے نہیں کہہ سکتے کی گیتوں کا خالق کوئی ایک شخص ہے یا پورا معاشرہ۔ بہر حال آج تک کسی گیت کے تخلیق کار کا علم نہ ہوسکا۔مگر کچھ اصناف جیسے خیال، لاونی، دادر اور برہا وغیرہ کے سلسلے میں کسی حد تک یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ کسی شاعر کی اپنی تخلیق ہیں۔

اکثر و بیشتر لوک گیتوں کے اصل متن کا علم بھی علما کو نہیں ہوتا چونکہ گیت کا وجود مشترکہ طور پر عمل میں آیا ہے اس لیے اس کے بنیادی متن کی تصدیق کرنا بہت مشکل ہے۔تخلیق چاہے جو بھی ہو وہ گیت تخلیق کر کے جدا ہو جاتا ہے اب ایسی حالت میں یہ لوک گیت پورے معاشرے کی امانت ہوتا ہے اس میں وقت اور ضرورت کے لحاظ سے ردو بدل ہوتا رہتا ہے۔اب ایک ہی گیت لسانی تفریق کی وجہ سے مختلف شکلیں اختیار کر لیتا ہے۔اصل گیت میں جب مقامی الفاظ خلط ملط ہو جاتے ہیں تو گیت کا پورا خاکہ ہی بدلا ہوا معلوم ہوتا ہے جس کی وجہ سے گیتوں میں ردوبدل ہوتا رہتا ہے۔جیسا کی رابرٹ گریس نے لکھا ہے کہ:

''کسی لوک گیت کا کوئی Original Version نہیں ہوتا کو عوام اپنی مرضی کے مطابق اس میں پھیر بدل کرتے رہتے ہیں اس لیے کسی ایک Version کو ہی اصل نہیں مانا جاسکتا۔''

(The Old English Bellads, P.12)

مثلاً 'الہا' کا اصل مصنف جگنک کو تسلیم کیا جاتا ہے جو بندیل کھنڈ کی بولی میں تخلیق کی گئی۔ مگر الہا جو آج گایا جاتا ہے اس کو دیکھ کر ضرور کہا جا سکتا ہے اس میں اصل متن اتنا طویل نہیں رہا ہوگا جتنا آج گایا جا رہا ہے۔ اس طرح الہا کی طوالت اس کے اصل متن سے کہیں زیادہ ہے۔ بھوجپوری اور میتھلی میں گائے جانے کی وجہ سے اس کے الفاظ میں بہت سی تبدیلیاں واقع ہو گئی ہیں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ان لوک گیتوں کا کوئی بنیادی متن نہیں ہوتا اور نہ ہی آخری شکل ہوتی ہے۔

لوک گیتوں کا پورا سرمایہ زبان زد روایت پر منحصر ہے جو سینہ بہ سینہ نسل در نسل ایک شخص سے دوسرے شخص تک منتقل ہوتا رہتا ہے جو کہ ہمارے زبانی ادب کا اہم حصہ ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ جب تک رسم الخط ایجاد نہیں ہوئی تھی تب تک تمام چیزیں سینہ بہ سینہ ہی چلتی رہی ہیں یہاں تک کہ ہماری مذہبی کتاب قرآن مجید خود زبانی روایت کی دلیل ہے کیوں کہ جب جبرئیل علیہ السلام وحی لے کر آتے اور محمدؐ انھیں زبانی یاد کر لیا کرتے تھے، یہ وحی بعد میں قرآن مجید کی شکل میں ہمارے سامنے آئی جس کو بہت بعد میں تحریری شکل میں پیش کیا گیا۔ اس طرح زبانی ادب کی اہمیت بھی کم نہیں ہے۔ جو ایک شخص سے دوسرے شخص تک منتقل ہوتی رہی۔ جیسا کہ گومر نے لکھا ہے کہ" زبانی روایت کسی گیت کی اہم خصوصیات ہوتی ہیں۔" اظہر علی فاروقی کا بھی یہی ماننا ہے کہ جو گیت تحریری شکل اختیار کر لیتے ہیں وہ ڈائمنشن سے محروم ہو جاتے ہیں کیونکہ لوک گیت کا تعلق پڑھنے سے زیادہ گانے سے ہے۔

لوک گیتوں میں سادہ اسلوب اور فطری اثر انگیزی ہوتی ہے کیونکہ لوک گیت شاعری سے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ یہ عروضی نظام کی قید سے پوری طرح آزاد ہے۔ یہ وزن، بحر، ردیف، قافیہ اور دیگر شعری لوازمات سے بالکل پاک ہیں۔ یہ دیہی عوام کے دلوں کا فطری اور براہ راست اظہار ہوتا ہے، جس میں ان کے سیدھے سادے اور فطری جذبات و احساسات کا گہرا عکس ہوتا ہے۔ کیوں کہ دیہاتی عوام سادگی پسند ہوتے تھے ایسی صورت میں فنی لوازمات کی پابندی کی ان سے امید بھی نہیں کی جا سکتی تھی کیوں کہ زیادہ تر دیہاتی ناخواندہ تھے اس لیے ان کی اصناف بھی اس طرح کی پیچیدگیوں سے آزاد ہوتی تھیں۔

ان سے الفاظ کے ساتھ لہجے و تلفظ کی صحیح ادئیگی کی امید کرنا بے سود ہے۔ اس لیے لوک گیتوں کی زبان پر مقامی الفاظ کا اثر واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گیتوں کی زبان دیگر شعری اصناف کی بہ نسبت مختلف نظر آتی ہے۔ گیتوں کی زبان کا امتیاز خاص ہے کہ ان گیتوں میں جو الفاظ آ گئے اور ان کے خیالات و جذبات سے مناسبت رکھتے ہیں تو ایسے الفاظ کو انھوں نے قبول کر لیا چاہے بنیادی طور پر وہ لفظ کسی بھی زبان سے تعلق رکھتا ہو۔ وہ نہ تو متروکات کے قائل ہیں اور نہ وضع اصطلاحات کے حامی اور نہ ماخذات کا تصور ان کے یہاں کوئی اہمیت رکھتا ہے۔ مختصر طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ گیتوں کی زبان لوچدار Flexible ہوتی ہے، جس کی وجہ سے وہ الفاظ کو توڑ مروڑ کر اپنے اعتبار سے ڈھال لیتے ہیں۔

لوک گیتوں پر مقامی اثرات کا گہرا عکس ہوتا ہے اور معاشرے سے لوک گیت کا تعلق ہوتا ہے اس معاشرے کے خط وخال کو پوری طرح اجاگر کر دیتا ہے چاہے اس میں کسی طرح کے مضمون کیوں نہ بیان کیے جائیں۔ مقامی اثرات کی نمائندگی واضح طور پر نظر آئے گی یہی وجہ ہے کہ جس قوم، نسل، یا ملک میں جو لوک گیت رائج ہوتا ہے وہاں اس میں عوام کے تمام متعلقات کا ذکر خوبصورت طریقے سے ہوتا ہے۔ کبھی کبھی ان گیتوں میں مقامی تاریخی واقعات کا بھی ذکر ہوتا ہے۔ ان گیتوں کا موسیقی اور رقص سے چولی دامن کا رشتہ ہے کیوں کہ لوک گیت کے لیے Ballad لفظ استعمال کیا جاتا ہے جس کا مطلب ہوتا ہے وہ گیت یا گانا جو رقص کے ساتھ پیش کیا جائے، جیسا کہ" بے لارے" کے معنی" ناچنا" ہے اس طرح Ballad گیت کو عام لوگ کورس میں گاتے تھے Exciting and respective music کے بغیر بنایا گیا گیت ادھورا ہے کیوں کہ موسیقی اس کی روح ہے۔

ڈھولک گیت، چہار بیت، قوالی اور لاونی وغیرہ میں موسیقی کو اہمیت حاصل ہے۔ اسے اکثر گاجے باجے کے ساتھ ہی گاتے ہیں۔ اس دوران ایک شخص کے ذریعے گائے جانے والے گیت کو کورس میں لوگ دہراتے ہیں۔

لوک گیتوں پر مقامی اثرات کا گہرا عکس ہوتا ہے اور معاشرے سے لوک گیت کا تعلق ہوتا ہے اس معاشرے کے خط وخال کو پوری طرح اجاگر کر دیتا ہے چاہے اس میں کسی طرح کے مضمون کیوں نہ بیان کیے جائیں۔ مقامی اثرات کی نمائندگی واضح طور پر نظر آئے گی یہی وجہ ہے کہ جس قوم، نسل، یا ملک میں جو لوک گیت رائج ہوتا ہے وہاں اس میں عوام کے تمام متعلقات کا ذکر خوبصورت طریقے سے ہوتا ہے۔ کبھی کبھی ان گیتوں میں مقامی تاریخی واقعات کا بھی ذکر ہوتا ہے۔ ان گیتوں کا موسیقی اور رقص سے چولی دامن کا رشتہ ہے کیوں کہ لوک گیت کے لیے Ballad لفظ استعمال کیا جاتا ہے جس کا مطلب ہوتا ہے وہ گیت یا گانا جو رقص کے ساتھ پیش کیا جائے، جیسا کہ" بے لارے" کے معنی" ناچنا" ہے اس طرح Ballad گیت کو عام لوگ کورس میں گاتے تھے Exciting and respective music کے بغیر بنایا گیا گیت ادھورا ہے کیوں کہ موسیقی اس کی روح ہے۔

گیت اور موسیقی کا رشتہ اتنا گہرا ہے کہ جہاں کہیں موسیقی کے آلات دستیاب نہیں ہوتے، لوگ ان کی جگہ دوسری چیزوں سے آلات موسیقی کا کام لیتے ہیں۔

لوک گیتوں میں حزن و یاس کی بھی خوبصورت تصویر دیکھنے کو ملتی ہے۔ جس میں ہمارے معاشرے کے دردناک پہلوؤں کی عکاسی کی جاتی ہے۔ کیوں کہ دیہاتی لوگوں کا غموں اور مصیبتوں سے گہرا رشتہ ہے جس کی وجہ سے وہ اکثر مفلسی اور درد کا شکار رہے، یہی وجہ ہے کہ ان کے گیتوں میں بھی اس پہلو پر اچھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ عام طور پر گیتوں میں عوام کے غم بھی مشترک نظر آتے ہیں۔ جیسے خانگی زندگی میں ساس نند کا سلوک، بیٹی کی رخصتی، شوہر سے جدائی اور بانجھ عورت کا درد وغیرہ سے متعلق گیت دیہاتی لوگوں کے غموں کی عکاسی کرتے ہیں۔

■

Dr. Abdullah Imteyaz Ahmad
Head, Dept of Urdu
B-Wing, 1st Floor, Ranade Bhavan
University of Mumbai
Kalina Campus, Santa Cruz (E)
Mumbai - 400098 (MS)
Mob.:9869198168,9839194123

اردو میں طنزیہ و مزاحیہ کالم نگاری

رفیق احمد

اردو زبان میں کالم نویسی کی تاریخ کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا آغاز منشی سجاد حسین کے 'اخبار اودھ پنچ' کے اجرا سے ہوتا ہے یوں تو اس سے پہلے بھی کالم نگاری کا ثبوت ملتا ہے مگر باقاعدہ طور پر بہ حیثیت ایک اخباری صنف کے کالم نگاری کی ابتدا 'اودھ پنچ' کی اشاعت کے ساتھ مخصوص کردی گئی ہے چنانچہ اس سلسلے میں ڈاکٹر انور ظہیر خان (شعبۂ اردو مہاراشٹر کالج) نے اپنے مضمون 'مشفق خواجہ کی خامہ بگوشی' میں لکھا ہے:

''غالباً ہماری زبان اردو میں کالم نگاری کا آغاز 1777 میں منشی سجاد حسین کے 'اودھ پنچ' سے ہوتا ہے اودھ پنچ کے بعد تو اخباروں اور رسالوں میں کالم نویسی کا ایک تار سا بندھ جاتا ہے۔'' (ماہنامہ 'کتاب نما' نئی دہلی، شمارہ مارچ 1997، ص 45)

بیسویں صدی کے ابتدائی دور ہی سے اردو صحافت اور کالم نویسی کی دنیا میں زبردست تبدیلی پیدا ہوئی اور کالم نگاروں نے اپنے مخصوص طنزیہ و مزاحیہ اور فکاہیہ کالموں کے ذریعے اردو کالم نگاری کی تاریخ میں اخبارات کو جو شہرت و مقبولیت اور پذیرائی بخشی ہے اس سے انکار ممکن نہیں اس سلسلے میں اردو کالم نگاری کے حوالے سے فکر تونسوی کا نام بڑی اہمیت رکھتا ہے جنہوں نے اپنے طنزیہ کالموں میں زمانے کی سیاسی بازی گری اور ستم ظریفی کو انتہائی جرأت و بے باکی کے ساتھ بے نقاب کیا ہے۔

کالم نویسی کا فن مسلسل ریاض اور محنت و مشقت چاہتا ہے مکمل یکسوئی اور دلجمعی کے بغیر کالم نگاری کے فن پر دسترس اور عبور حاصل کرنا ممکن نہیں، عمدہ کالم نگار بننے کے لیے ضروری ہے کہ قارئین کو ہمیشہ نئے موضوع اور سرخی کے تحت کوئی ایسی بات اپنے کالموں میں پیش کی جائے جس سے جانکاری میں اضافے کے ساتھ حالات حاضرہ سے واقفیت ہو اور ساتھ ہی ساتھ تفریح طبع کا بھی خصوصی خیال رکھا جائے، ایک ہی عنوان کے ذریعے گھسی پٹی باتوں کو بار بار لکھنے سے کالم نگار کا وقار مجروح ہوگا اور اخبار کے سرکولیشن پر بھی بدنما داغ ہوگا۔

کالم نگاروں کو اس بات پر بھی دھیان دینا چاہیے کہ پیش کش اور طرز ادا میں انفرادیت کے ساتھ زبان و بیان کی سادگی ہو، ثقیل اور مشکل الفاظ کے استعمال سے گریز ضروری ہے اس جانب اشارہ کرتے ہوئے عصر حاضر کے نامور طنز و مزاح نگار اور کالم نویس مجتبیٰ حسین نے اپنے مضمون 'ایک کتاب کی رسم اجرا' میں لکھا ہے کہ: ''روز مرّہ کے چھوٹے موٹے واقعات کے اطراف طنز کا تانا بانا بننا اور انہیں لطیف پرائے میں اس طرح بیان کرنا کہ قاری کو اس میں اپنے دل کی دھڑکن سنائی دے مزاح نگار اور کالم نگار کا بنیادی منصب ہوتا ہے۔ آخر میں ایک بار اور عرض کرتا چلوں کہ طنزیہ کالم نگاری اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کالم نگار کو زبان و بیان پر پوری قدرت حاصل نہ ہو اور وہ ادب کی کلاسیکی قدروں سے واقف نہ ہو۔'' (ماہنامہ 'کتاب نما' مکتبہ جامعہ، نئی دہلی فروری 1997، ص 68)

ایک اچھے کالم نگار کے لیے ضروری ہے کہ وہ معاصرانہ چشمک کا شکار نہ ہو اس کے لیے یہ بھی لازم ہے کہ اپنے کالموں میں بدلے کی بھاؤنا اور انتقامی جذبے سے پرے ہٹ کر ذاتی بغض و عناد سے پرہیز کرے اور کسی فرد واحد کو ہدف تنقید نہ بنائے۔

اردو کے مشہور ادیب و دانشور اور صحافی احمد ندیم قاسمی نے اس جانب اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''کالم نویس کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ کالم نویس ذاتیات سے مکمل طور پر پرہیز کرے کیونکہ ذاتیات سے تلخیاں جنم لیتی ہیں اور کسی فرد کے ذہن میں یا اس کے بارے میں تلخی پیدا کرنا میری نظر میں کوئی اچھا فعل نہیں ہے''۔

(سرچشمہ گورنمنٹ اسلامیہ کالج، میگزین لاہور، پہلا شمارہ جنوری 1983، ص 205)

کالم نگاری کا فن کسی پہاڑ سے جوئے شیر لانے، چاول پر قل ھو اللہ لکھنے اور اونٹ کو سوئی کے سوراخ سے گزارنے جیسا مشکل عمل ہے مگر ایک جرأت مند کالم نگار حالات کی سردی گرمی کو برداشت کرتے ہوئے سحر خیزی اور آبلہ پائی کرتے ہوئے اخبار کے قارئین تک اپنا کالم پیش کرتا ہے۔ کالم لکھنا کتنا مشکل کام اور دشوار ترین مرحلہ ہے کہ مرتے جیتے ہر حال میں اگلی صبح کالم نگار کو اپنے قارئین کے روبرو ہونا ہے یومیہ کالم لکھنے کی دشواری کا اندازہ وہ لوگ بخوبی لگا سکتے ہیں جنھوں نے فلم 'میرا نام جوکر' دیکھی ہوگی جس میں ہیرو باپ کی لاش کے پاس ہی سامعین اور ناظرین کو اپنے مزاحیہ کرتب دکھا کر دل پر پتھر باندھ کر اندر سے دل فگار ہوتے ہوئے بھی اپنے سامنے والے کے لبوں کو قہقہے کی دولت سے نوازتا ہے۔

ایسا ہی کچھ عمل ایک کالم نگار کو بھی کرنا پڑتا ہے اس تعلق سے مجتبیٰ حسین نے لکھا ہے ''میں نے بھی کم و بیش سترہ برسوں تک حیدرآباد کے روزنامہ 'سیاست' میں کالم نگاری کی ہے اس پورے عرصے میں ہفتے کے چھ دنوں میں میرا کالم نہایت پابندی سے چھپتا تھا روزانہ کالم نگاری کتنا جان لیوا کام ہے اس کا مجھے اندازہ ہے کیسی کیسی حالتوں میں بہرحال میں یہ کالم لکھتا تھا ایک بار تو یہ بھی ہوا کہ میری چھ سال کی بیٹی دنیا سے رخصت ہوگئی قبرستان سے واپس ہوا تو قبر کی مٹی ہاتھوں سے جھاڑے بغیر ہی مزاحیہ کالم لکھنے بیٹھ

گیا جب اگلے دن اس کالم کو بہت پسند کیا گیا تو اس دن مجھے پہلی بار اوراک ہوا کہ سچے مزاح کی سرحد اپنے اندر غم کو انگیز کرنے کے بعد ہی شروع ہوتی ہے۔''

(ماہنامہ 'کتاب نما' مکتبہ جامعہ نئی دہلی شمارہ فروری 1997 ص 68-67)

اردو زبان میں طنزیہ ومزاحیہ کالم نگاری کی تاریخ اور روایت بہت قدیم نہیں ہے بلکہ اردو صحافت کے آغاز کے بعد اصناف صحافت کی ایک ہر دل عزیز صنف کالم نگاری کی ابتدا ہوتی ہے اردو میں کالم نویسی کا آغاز تقریباً ڈیڑھ سو سال قبل سے تسلیم کیا جاتا ہے، یوں تو اخبارات میں بہت سے کالم مثلاً سیاسی، سماجی، سائنسی، ثقافتی، مذہبی، ادبی وتعلیمی، اقتصادی ومعاشی اور حالات حاضرہ سے متعلق موضوعات پر شائع ہوا کرتے ہیں مگر ان کالموں میں طنزیہ ومزاحیہ کالم کی اپنی انفرادیت اور شناخت ہوا کرتی ہے، اور اردو اخبارات میں خصوصاً یہ کالم اپنے قارئین کی توجہ کا ہمیشہ سے مستحق رہا ہے اس کی پذیرائی اور شہرت ومقبولیت کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ عصر حاضر کے بہت سے ادیب ودانشور، صحافی وماہرین تعلیم اور اعلیٰ منصب پر فائز پروفیسران حضرات جو روزی روٹی تو اردو کی کھاتے ہیں مگر اخبارات کسی اور زبان کے پڑھنے کے عادی ہیں۔ یہ لوگ بھی منہ کا ذائقہ بدلنے، تفریح طبع اور موڈ فریش کرنے کے لیے طنزیہ ومزاحیہ کالم پڑھنے کی خاطر اردو کے اخبارات خریدنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

اردو میں طنزیہ ومزاحیہ اور فکاہی کالم نگاری کی روایت اور تاریخ وارتقاء کا جائزہ لیتے ہوئے سید نصر الدین احمد یوگس حیدر آبادی کا خیال ہے کہ اردو میں طنز ومزاح کو فروغ دینے میں کالم نویسی کو بڑا دخل حاصل رہا ہے کالم نویسی کا رواج اردو صحافت میں 'اودھ پنچ' سے باقاعدہ شروع ہوتا ہے اودھ پنچ سے بہت پہلے اردو صحافت کے آغاز ہی سے طنزیہ کالم لکھے جاتے رہے ہیں۔ 'اودھ پنچ' کے مختلف کالم مختلف ناموں سے لکھنے والوں میں خاص طور پر سید محمد آزاد محفوظ بدایونی قابل ذکر ہیں۔

تمام صحافتی کالموں میں صرف طنز ومزاح کا کالم ہی ادبی رہا ہے، اردو اخباروں کی طنزیہ کالم نگاری کی تاریخ میں 'اودھ پنچ' کے بعد جو اخبار اردو صحافت بلکہ ادب میں بھی اہمیت رکھتا ہے وہ 'الہلال' ہے جس میں مولانا ابوالکلام آزاد جیسے جلیل القدر ادیب، 'افکار وحوادث' کے نام سے مستقل طور پر ایک کالم لکھا کرتے تھے۔ یہ طنزیہ ومزاحیہ کالم آج بھی اردو طنز ومزاح کا افتخار کہا جاسکتا ہے۔

'افکار وحوادث' کا یہ نام اتنا مقبول ہوا کہ جب 'زمیندار' لاہور سے 1911 میں نکلنے لگا تو اس میں بھی 'افکار وحوادث' کا کالم مستقل طور پر لکھا جانے لگا 'زمیندار' کا یہ کالم مولانا عبدالمجید سالک لکھا کرتے تھے ان کی طنزیہ ومزاحیہ تحریر کی وجہ سے اس کالم کو بہت زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی 1927 میں جب مولانا عبدالمجید سالک 'زمیندار' سے علاحدہ ہو گئے اور 'انقلاب' نکلنے لگا تو اپنے ساتھ یہ کالم یعنی 'افکار وحوادث' بھی لے گئے اور اب مستقل طور پر 'انقلاب' میں افکار وحوادث والا کالم چھپنے لگا جس زمانے میں 'انقلاب' نکلا کرتا تھا اس زمانے میں مولانا چراغ حسن حسرت 'نئی دنیا' جو کلکتہ سے نکلا کرتا تھا اس میں فکاہی کالم 'کولمبس' کے نام سے لکھنے لگے اور پھر جب وہ پنجاب گئے اور 'زمیندار' سے وابستہ ہو گئے تو انھوں نے 'سندباد جہازی' کے فرضی نام سے ایک فکاہی کالم لکھنا شروع کیا بعد میں جب 1934 'احسان' نکلنے لگا تو وہ اس میں بھی 'سندباد جہازی' ہی کے نام سے کالم لکھتے رہے مولانا چراغ حسن حسرت ان اخباروں کے علاوہ شیرازہ، پنچایت، مہاجر، امروز، نوائے وقت، میں بھی فکاہی کالم لکھا کرتے تھے۔ 'اودھ پنچ' میں سجاد حسین 'لوکل' اور 'موافقت زمانہ' کے عنوان سے سماجی وسیاسی طنزیہ کالم لکھا کرتے تھے۔

فکاہی کالم کو امتیازی مقام بخشنے میں مولانا محمد علی جوہر کا اخبار 'ہمدرد' بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے اس میں وہ خود بھی طنز ومزاح کے تیر برساتے تھے اور سید محفوظ علی بدایونی بھی اس میں لکھا کرتے تھے سلطان حیدر جوش 'ببوق' کے نام سے 'ہمدرد' میں طنز ومزاح کا کالم ایک مدت تک لکھتے رہے طنز ومزاح کے کالم کے ذریعے جن ادیبوں نے طنز ومزاح کی روایت کو آگے بڑھانے میں اہم رول ادا کیا ہے ان میں مولانا عبدالماجد دریابادی، قاضی عبدالغفور، دیوان سنگھ مفتون، اور میکش حیدرآبادی کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

مولانا عبدالماجد دریابادی اپنے اخبار 'صدق' میں 'سچی باتیں' کے نام سے اپنا طنز ومزاح کا کالم لکھتے رہے طنز ومزاح کے کالم نویسوں میں مجید لاہوری کا 'نمکدان' بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے احمد ندیم قاسمی 'عنقا' کے نام سے لاہور سے نکلنے والے اخبار 'امروز' میں 'حرف وحکایت' کا کالم لکھا کرتے تھے معروف اور اہم ادیبوں میں جو ادیب طنز ومزاح کا کالم لکھتے رہے ہیں ان میں شوکت تھانوی ابن انشا یہ دونوں 'اخبار جنگ' میں فکاہی کالم لکھتے رہے ہیں۔

''جنگ' سے ایک اور مشہور ومعروف ادیب جو کالم نویس کے سلسلے میں وابستہ رہے ہیں ان میں ابراہیم جلیس (مجتبیٰ حسین کے بھائی) کا نام بھی خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ انتظار حسین 'آفاق' اخبار میں فکاہی کالم ایک عرصے تک لکھتے رہے حیدرآباد سے نکلنے والے روزنامہ 'سیاست' میں مشہور شاعر شاہد صدیقی 'کوبکن' کے نام سے طنزیہ ومزاحیہ کالم 'شیشہ وتیشہ' لکھا کرتے تھے شاہد صدیقی کے انتقال کے بعد اس کالم کو مشہور طنز ومزاح نگار مجتبیٰ حسین پابندی سے لکھ رہے ہیں، روزنامہ 'رہنمائے دکن' میں بھی 'رہنما و راہرو' کے نام سے فکاہیہ کالم لکھا جاتا تھا اس طرح حیدرآباد کے ایک اور روزنامہ 'انگارے' میں 'نمک پارے' کے نام سے فکاہی کالم چھپتا رہا روزنامہ 'منصف' میں 'من موجی' کالم چھپتا ہے اس طرح ہفتہ وار 'بلٹز' میں مشہور ادیب خواجہ احمد عباس 'آزاد قلم' کے نام سے آخری صفحہ لکھا کرتے تھے۔

بنگلور سے نکلنے والے روزنامہ 'نشیمن' میں 'تھپراخیں' چھپتا تھا ساگر چند گورکھا روزنامہ 'پرتاب' میں 'گپ شپ' نامی طنزیہ کالم تحریر کرتے تھے روزنامہ 'سیاست جدید' کانپور میں سید حبیب طنزیہ ومزاحیہ کالم 'راز ونیاز' لکھا کرتے تھے اور 'ملت' میں قمر اجنالوی 'کاروان ہاشمی' کے نام سے کالم لکھا کرتے تھے محمودہ سلطانہ روزنامہ 'انجام' میں 'برق وشرر' کا کالم تحریر کرتی ہیں رنبیر اور مسافر کی 'چٹکیاں'، 'ملاپ' کے صحافتی کالموں میں طنز ومزاح کے مواقع فراہم کرتے تھے اس طرح اردو اخبارات میں طنز ومزاح کے کالم ہمیشہ شریک رہے۔ 'ملاپ' میں فکر تونسوی کا طنزیہ ومزاحیہ کالم 'پیاز کے چھلکے' 1995 سے اب تک چھپتا رہا۔ ان سالوں میں فکر نے تقریباً چھ ہزار کالم لکھ ڈالے ہیں۔

اردو کی صحافتی اصناف میں فکاہیہ کالم نویسی کے حوالے سے مولانا ابوالکلام آزاد، قاضی عبدالغفار، اختر حسن، عبدالعزیز فلک پیما، چراغ حسن حسرت، نسیم انہونوی، فکر تونسوی، خوشتر گرامی، شوکت تھانوی، عبدالماجد دریابادی اور ڈاکٹر عابد حسین وغیرہ کے نام بڑی اہمیت کے حامل ہیں خاص طور سے 1925 واحد علی کی ادارت میں شائع ہونے والے رسالہ 'حسن وادب' سے وابستہ ہونے سے قبل شوکت تھانوی 1920 میں پندرہ روزہ قلمی رسالہ پندرہ سال کی عمر میں خوشخط لکھ کر اپنے احباب میں تقسیم کیا کرتے تھے اس کے بعد وہ رسالہ 'تحریک'، 'ہمدم'، 'سرپنچ' اودھ اخبار، ماہنامہ 'شباب' روزنامہ لکھنؤ ماہنامہ کائنات روزنامہ 'طوفان' 1938 روزنامہ 'جنگ' 1958 وغیرہ سے وابستہ رہے اور مزاحیہ کالم نگاری کے جوہر دکھاتے رہے وجاہت علی سندیلوی 'قومی آواز' میں مزاحیہ کالم لکھا کرتے تھے دیگر مزاحیہ کالم نویسوں میں فرقت کاکوروی، شاہد صدیقی، عبدالمجیب سہالوی، عامر عثمانی، مجتبیٰ حسین اور یوسف ناظم وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

اردو میں طنزیہ ومزاحیہ کالم نگاری کو ترقی دینے میں ہفت روزہ 'بلٹز' کی خدمات ناقابل فراموش ہیں ایک مخصوص نظریے کا حامل یہ اخبار اپنی پالیسی میں کامیاب رہا ہے احتجاجی صحافت میں اس نے اہم رول ادا کیا ہے بمبئی سے شائع ہونے والے اردو بلٹز کا شہرۂ آفاق کالم 'پتہ نہیں بیٹا' جاں نثار اختر لکھا کرتے تھے جو اپنے عہد کا کافی مقبول کالم ہوا کرتا تھا۔ 'پتہ نہیں بیٹا' میں سوال بیٹے کی جانب سے ہوتا تھا باپ پر جواب کی ذمے داری ہے۔ مرتب کا نام نہیں لکھا جاتا، بیٹا کافی ہوشیار ہے اس لیے شاید ایسے چبھتے ہوئے سوال کرتا ہے کہ ڈیڈی کو 'پتہ نہیں بیٹا' کہنا پڑتا ہے۔ اناج کی قلت کے تعلق سے ایک کالم ملاحظہ ہو:

ڈیڈی! ہاں بیٹا۔ گجرات میں بیسیوں افراد پولس کی گولی سے ہلاک ہوگئے۔

ہاں بیٹا۔ وہاں کے لوگ بیوپاریوں سے ذخیرہ کیا ہوا اناج نکالنے کے لیے کہہ رہے تھے۔

ڈیڈی: کیا حکومت چھپے ہوئے اناج پر ہاتھ ڈالنے سے ڈرتی ہے یا وہ غریبوں کو مار کر غریبی مٹانا چاہتی ہے۔

پتہ نہیں بیٹا۔'' (ہفت روزہ بلٹز بمبئی، شمارہ سنیچر 26 جنوری 1974)

سنیچر گیارہ دسمبر 1976 کو یوسف ناظم نے ہفتہ وار بلٹز میں 'باتیں ہماریاں' کے نام سے کالم نگاری کی۔ ان کا مزاحیہ کالم موجودہ دور کے مجلّہ 'البلاغ' بمبئی میں کافی مدت تک شائع ہوتا رہا۔ بلٹز میں یوسف ناظم کا کالم چند شماروں کے بعد بند ہوگیا اس کی جگہ 'بکواس' کے نام سے کالم شائع ہوا کرتا تھا۔

نظام آباد آندھرا پردیش سے شائع ہونے والے ہفتہ وار اخبار 'نوید سحر' میں اس کے ایڈیٹر کاظم علی خان نامور ادیب وشاعر ایک مستقل طنزیہ ومزاحیہ کالم 'سینے اور سر دھنیے' کے نام سے لکھا کرتے تھے اس کالم میں موجودہ حالات پر طنزیہ تبصرہ ہوا کرتا تھا، 'رہنمائے دکن' حیدرآباد میں 'رہنما و رہرو' کا مختصر کالم شائع ہوتا تھا، روزنامہ 'خوں ناب' میں شریف اسلم 'سرراہ چلتے چلتے' نامی کالم لکھا کرتے تھے، رہنمائے دکن میں 'خبر و نظر' اور 'سچی باتیں' نامی کالم بھی شائع ہوتا تھا۔ روزنامہ 'سیاست' حیدرآباد میں نامور شاعر شاہد صدیقی مزاحیہ کالم 'شیشہ و تیشہ' کے نام سے اپنی وفات کیم اگست 1962 تک لکھتے رہے۔ 7 اگست 1962 سے مجتبیٰ حسین نے یہی کالم لکھنا شروع کیا اور نومبر 1972 میں دہلی منتقل ہونے تک یہ کالم لکھتے رہے وہ کوہکن کے بجائے 'کوہ پیما' کہلائے۔

تانیثی ادب کا ترجمان نسوانی ماہنامہ 'حریم لکھنؤ' میں برق آشیانوی نے طنزیہ و مزاحیہ فیچر 'درون خانہ سے بیرون خانہ تک' لکھنے کا آغاز مارچ 1978 میں کیا۔ عبدالمجیب سہالوی نے 'گلوریاں' کے نام سے طنزیہ ومزاحیہ کالم لکھے۔

کیفی اعظمی نے 'نئی گلستاں' نامی کالم لکھنے کا آغاز ہفت روزہ بلٹز میں کیا تھا، اس اخبار میں ستمبر 1970 میں نامور شاعر جاں نثار اختر نے 'ہزاروں باتیں' کے نام سے کالم لکھا۔ قومی آواز کا کالم 'گلوریاں' ایک زمانے تک نامور صحافی حیات اللہ انصاری اور احمد جمال پاشا لکھا کرتے تھے۔

مندرجہ ذیل سطور میں ہم کچھ مشہور زمانہ اور نمائندہ کالموں کا جدول (Table) پیش کر رہے ہیں:

	کالم کی سرخی	کالم نویس	اخبار ورسائل کا نام	مقام اشاعت
1	پیاز کے چھلکے	فکر تونسوی	ملاپ	دہلی، حیدرآباد
2	افواہیں	فکر تونسوی	بیسویں صدی	نئی دہلی
3	تیر ونشتر	خوشتر گرامی	بیسویں صدی	نئی دہلی
4	شیشہ و تیشہ	شاہد صدیقی (کوہکن)	سیاست	حیدرآباد
5	شیشہ و تیشہ	مجتبیٰ حسین (کوہ پیما)	سیاست	حیدرآباد
6	سرراہ چلتے چلتے	شریف اسلم	خوں ناب	حیدرآباد
7	راہنما و رہرو	——	رہنمائے دکن	حیدرآباد
8	سینے اور سر دھنیے	کاظم علی خان	نوید سحر	نظام آباد اے پی
9	پل قدیم سے پل صراط تک	ڈاکٹر ایس جے صادق	نغمۂ حیات	حیدرآباد
10	باتیں ہماریاں	یوسف ناظم	بلٹز	بمبئی
11	ہزاروں باتیں	جاں نثار اختر	بلٹز	بمبئی
12	پتہ نہیں بیٹا	جاں نثار اختر	بلٹز	بمبئی
13	نئی گلستاں	کیفی اعظمی	بلٹز	بمبئی
14	گلوریاں	عبدالمجیب سہالوی	قومی آواز	لکھنؤ
15	گلوریاں	احمد جمال پاشا	قومی آواز	لکھنؤ
16	شذرات	عبدالماجد دریابادی	صدق جدید	لکھنؤ
17	سچی باتیں	عبدالماجد دریابادی	صدق جدید	لکھنؤ
18	مسجد سے میخانے تک	عامر عثمانی	تجلی	دیوبند
19	افکار وحوادث	ابوالکلام آزاد	الہلال	کلکتہ
20	افکار وحوادث	عبدالمجید سالک	زمیندار، انقلاب	لاہور
21	کولمبس	چراغ حسن حسرت	نئی دنیا	کلکتہ
22	سندباز جہازی	چراغ حسن حسرت	زمیندار	لاہور
23	لوکل، موافقت زمانہ	منشی سجاد حسین	اودھ پنچ	لکھنؤ
24	راز و نیاز	سید حبیب	سیاست جدید	کانپور
25	گپ شپ	ساگر چند گورکھا	پرتاب	دہلی

مختصر یہ کہ اردو زبان میں کالم نگاری کو بڑی اہمیت حاصل رہی ہے اس فن کو ترقی دینے میں ہمارے اردو صحافیوں نے جو گراں قدر خدمات انجام دیے ہیں اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔ آج بھی اردو کالم نگاری اردو صحافت میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے۔

■

Dr. Rafique Ahmad
Asst Professor, Dept of Urdu
DCSK (PG) College
Maunath Bhanjan - 275101 (UP)
Mob.:9236126977

ماہنامہ سب رس
ایک تحقیقی وتنقیدی جائزہ

قمر احمد

ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد کے زیر اہتمام شائع ہونے والا عہد ساز رسالہ ماہنامہ 'سب رس' ڈاکٹر سیّد محی الدین قادری زور نے جنوری 1938 میں حیدرآباد دکن سے جاری کیا۔ ماہنامہ 'سب رس' کا پہلا شمارہ مکتبہ 'ابراہیمیہ مشین پریس' میں طبع ہوکر دفتر ادارہ رفعت منزل خیریت آباد سے منظر عام پر آیا۔ ڈاکٹر زور معتمد عمومی 'ادارہ ادبیات اردو' جو اس زمانے میں جامعہ عثمانیہ میں اردو کے پروفیسر کے عہدہ پر فائز تھے۔ 'سب رس' کے نگراں مقرر ہوئے اور صاحبزادہ میر محمد علی خان میکش کو 'سب رس' کی ادارت کے فرائض سونپے گئے۔ خواجہ حمید الدین شاہد مہتمم ادارہ نے میکش کو اپنے بھرپور تعاون سے نوازا۔ 'سب رس' کے پہلے شمارے کے لیے مایہ ناز حسن کار عبدالرحمان چغتائی نے ایک خوبصورت سرورق تیار کیا تھا جس نے رسالہ 'سب رس' کے ظاہری حسن کو دوبالا کردیا۔ 'سب رس' کی دلکشی اور جاذبیت میں اضافہ کرنے کے لیے بہت ساری قدیم، نایاب اور قلمی تصویریں بھی شائع کی گئیں۔ اس رسالے کو ایک طرف معلومات آفریں بنایا گیا تو دوسری طرف اس میں سلاست اور افادیت کا بھی خاص خیال رکھا گیا۔ اس لیے یہ حیدرآباد میں ہی نہیں بلکہ حیدرآباد سے باہر بھی مشہور ہوا۔ رسالہ 'سب رس' کی ابتدائی حیثیت کے بارے میں ڈاکٹر محی الدین قادری زور لکھتے ہیں:

'سب رس' ادارہ ادبیات اردو کا ترجمان ہے جو ہر مہینے اردو زبان وادب کے لیے شائع ہوا کرے گا۔ اس ادارہ نے اب تک سنجیدہ علمی وادبی کتابیں شائع کرکے اردو کی جو خدمت کی ہے وہ علم دوست اصحاب سے مخفی نہیں ہے۔ لیکن اس خدمت سے خاص خاص اہل ذوق ہی مستفید ہوسکتے ہیں۔ اس لیے ابتدا ہی سے دھیان لگائے ہوئے تھا کہ ایک ایسا رسالہ بھی نکالا جائے جس کی رسائی سب تک ہو اور جس میں سب کی دلچسپی کا خیال رکھا جائے۔''

(ڈاکٹر محی الدین قادری زور۔ اداریہ۔ رسالہ سب رس، جنوری 1938، ص 5)

ماہنامہ 'سب رس' ایک سال تک پابندی سے شائع ہوتا رہا مگر جب اس کی مانگ بڑھی تو اس کے لیے ایک مجلس انتظامی کی ضرورت محسوس کی گئی۔ چنانچہ 1939 کے آغاز میں ڈاکٹر زور نے دوسرے شعبوں کی طرح 'سب رس' کی بھی ایک مجلس ادارت قائم کردی، جس کے اراکین میں صاحبزادہ محمد علی خان میکش، سکینہ بیگم، خواجہ حمید الدین شاہد اور معین الدین انصاری تھے۔ خواتین کے مضامین اور نظموں کا انتخاب سکینہ بیگم کے سپرد کیا گیا۔ پہلے تو 'سب رس' کے آخری صفحات پر ہی 'بچوں کا سب رس' ضمیمہ کی حیثیت سے شائع کیا جاتا تھا۔ لیکن اس کی مقبولیت اور بچوں کی دلچسپی کو دیکھتے ہوئے اس بات کی ضرورت محسوس کی گئی کہ بچوں کے لیے علاحدہ رسالہ جاری کیا جائے۔ چنانچہ 'بچوں کا سب رس' علاحدہ نکالا جانے لگا، جس کی ترتیب کی ذمے داری معین الدین انصاری کے سپرد تھی۔ بچوں کے سب رس کے علاوہ 1940 میں ایک اور رسالہ 'سب رس معلومات' کے نام سے جاری کیا گیا، جس میں مشاہیر کی زندگیاں، عام فہم سائنس کے مضامین، تعلیمی اور سیاسی خبریں، مسابقتی امتحانات سے متعلق معلومات، کھیل کی خبریں وغیرہ شامل کی گئیں، جس کا اصل مقصد یہ تھا کہ جو لوگ حیدرآباد یا برطانوی ہند کے مسابقتی امتحانات میں حصہ لینا چاہتے ہیں ان کے لیے اردو زبان میں قیمتی معلومات اور حالات حاضرہ سے متعلق تمام باتیں فراہم کی جائیں۔ اس کی ترتیب کا کام عبدالحفیظ صدیقی بی۔ ایس۔ سی سرانجام دینے لگے۔ تقریباً دو سال بعد مالی دشواریوں کے باعث 'سب رس معلومات' کو بند کردیا گیا اور آگے چل کر وسائل کی قلت کے سبب بچوں کی معلومات کا حصہ بھی 'سب رس' ہی میں ضم کردیا گیا۔ اس کے متعلق پروفیسر سیّدہ جعفر نے لکھا ہے:

'سب رس' ادارے کا ترجمان تھا اور جنوری 1938 میں اس کا پہلا شمارہ طبع ہوکر منظر عام پر آیا تھا۔ بچوں کے لیے 'بچوں کا سب رس' اور 'سب رس معلومات' شائع کیے تھے جو بعد میں بند کردیے گئے اور 'سب رس' ہی میں چند صفحات بچوں کے لیے مختص کردیے گئے تھے۔ رسالہ کے اس حصے میں محترمہ لطیف النساء بیگم، بشیر النساء، نعیم النساء اور دوسری خواتین کی نگارشات شائع ہوکر مقبول ہوئیں۔''

(پروفیسر سیّدہ جعفر: ہندوستانی ادب کے معمار ڈاکٹر زور، ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی، مطبوعہ 1984، ص 39)

ماہنامہ 'سب رس' کی ادارتی ذمے داریوں کو ڈاکٹر زور کی حیات اور نگرانی تک صاحبزادہ میکش، خواجہ حمید الدین شاہد، سلیمان اریب، وقار خلیل اور پروفیسر محمد اکبرالدین صدیقی نے مشاورتی بورڈ کے تعاون سے بہتر طور پر انجام دیا۔ ڈاکٹر زور کی وفات کے بعد رسالہ 'سب رس' کو ان کی یادگار ہونے کا شرف حاصل ہوا اور صدر ادارہ پروفیسر سید علی اکبر نے اس کی ادارت قبول فرمائی۔ اس کے بعد محمد اکبر الدین صدیقی، میر حسن اور غلام جیلانی نے 'سب رس' کی ادارت کے فرائض انجام دیے۔ جامعہ عثمانیہ کے ان ارباب ثلاثہ نے 'سب رس' اور 'ادارہ ادبیات اردو' کی سرگرمیوں کو عصریت اور مقبولیت سے ہم کنار کیا۔ برصغیر کے نامور نقاد پروفیسر مغنی تبسم اکتوبر 1978 میں 'سب رس' سے وابستہ ہوئے۔ ڈاکٹر زور کے بعد 'سب رس' کو امتیازی خصوصیت عطا کرنے میں پروفیسر مغنی تبسم کا غیر معمولی کردار رہا ہے۔ انھوں نے 'سب رس' کے معیار پر اس قدر توجہ کی کہ آج 'سب رس' کا شمار اردو کے صفِ اول کے رسائل میں ہوتا ہے۔ انھوں نے دشوار اور نامساعد حالات میں بھی ادارے اور 'سب رس' کی سرگرمیوں کو خوش اسلوبی کے ساتھ جاری رکھا۔ پروفیسر مغنی تبسم نے طبیعت کے ناساز ہونے کے باعث نومبر 2009 کو 'ادارہ ادبیات اردو' کے معتمد عمومی کی حیثیت سے استعفیٰ پیش کیا اور ساتھ ہی 'سب رس' کی ادارت سے بھی کنارہ کشی اختیار کرلی۔ 2010 کے آغاز سے تا حال رسالہ 'سب رس' کی ادارت کے فرائض عہد حاضر کے مشہور فکشن نگار پروفیسر بیگ احساس بخوبی انجام دے رہے ہیں۔

ماہنامہ 'سب رس' کا شمار ہندو پاک کے موقر رسائل میں ہوتا ہے۔ 'سب رس' کے تخلیقی، تحقیقی اور تنقیدی موضوعات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ ابتدا سے حال تک 'سب رس' نے مطلع ادب کو روشن رکھا اور اس کی ادبی خدمات کا دائرہ ہر نئے شمارے کے ساتھ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا آرہا ہے۔ ڈاکٹر زور نے واضح طور پر کہا تھا کہ

افسانوں، نظموں، تحقیقی، علمی، ادبی اور تنقیدی مضمونوں اور اردو کی مطبوعات پر غیر جانب دار تنقیدوں کے سوا آرٹ پر بھی مضمون چھپتے رہیں گے۔ اس معیار کو رسالہ 'سب رس' نے ہر دور میں اولیت دی۔ عصر حاضر میں رسالہ ایک نئے گیٹ اپ کے ساتھ شائع ہو رہا ہے، جس میں اداریہ، مضامین، خراج عقیدت، آپ بیتی، خودنوشت، طنز و مزاح، ترجمہ، افسانے، شاعری، مطالعہ، خطوط اور تبصرہ وغیرہ کے عنوانات کے تحت مواد کو شامل کیا جاتا ہے۔ غرض 'سب رس' مضامین کی رنگارنگی اور تنوع کے باعث رسائل کی دنیا میں نمایاں مقام کا حامل بن گیا ہے۔ حضرت امجد حیدرآبادی نے اسے تحفہ لاجواب قرار دے کر ایک رباعی کہی تھی۔

یہ تحفہ ہے لاجواب از بس لے لو
مرغوب دل ہر کس و ناکس لے لو
سب کا لینا تو امر ناممکن ہے
سب میں بہتر یہ ہے کہ سب رس لے لو

اردو میں ادبی رسائل کی تاریخ اس اعتبار سے بہت المناک رہی ہے کہ بہت سے اچھے رسائل کم سنی میں دم توڑ گئے۔ ڈاکٹر زور نے جب ادبی صحافت کا آغاز کیا تو صرف ماہنامہ 'اردو' اور 'نگار' کو چھوڑ کر بقیہ سب تخلیقی ادب کو اپنا سہارا بنائے ہوئے تھے اور تنقید بھی کبھی، مگر تحقیق کا تصور ان رسائل کے پاس نہ تھا۔ البتہ 'اردو' اور 'نگار' میں تحقیقی اور تنقیدی مضامین شائع ہوتے تھے اور ان کا معیار بھی بلند تھا۔ لیکن یہ بات بھی قابل غور ہے کہ 'نگار' اور 'اردو' کا محور اور مرکز نیاز فتح پوری اور مولوی عبدالحق کی ذات تھی مگر 'سب رس' کے ساتھ کوئی ایسی بات نہ تھی حالانکہ اس کے بانی ڈاکٹر زور تھے مگر انھوں نے بھی اپنی ذات کو کبھی رسالے پر مسلط کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اردو رسائل کی تاریخ میں 'سب رس' وہ واحد رسالہ ہے جس نے نہ صرف اپنے معیار کو بلند رکھا بلکہ پچھلے بیاسی برس سے زبان اور علم و ادب کی خدمات انجام دے رہا ہے۔ زمانے کے تھپیڑوں کو برداشت کرتے ہوئے بلا ناغہ اس رسالے کا شائع ہونا یقیناً اردو داں اور ادبی طبقے میں مقبولیت کا غماز ہے۔ رسالہ کسی مخصوص تحریک کا علمبردار نہیں رہا لیکن ہر دور کے بدلتے ہوئے رجحانات کا ساتھ ضرور دیتا رہا ہے۔ اعتدال پسندی کو اس نے اپنا شعار بنایا اور ادبی معیارات کو اولیت دی۔ طیب انصاری اپنی کتاب 'حیدرآباد میں اردو صحافت' میں 'سب رس' کی علمی و ادبی خدمات پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''علمی و ادبی نقطہ نظر سے 'سب رس' کی اشاعت بے حد اہمیت رکھتی ہے۔ تحقیق کے میدان میں 'سب رس' خضر کا فرض انجام دیتا ہے۔ یہ 'باب الداخلہ' ہے جہاں سے ہر ادیب اور محقق کو ہو کر گزرنا پڑتا ہے۔ 'سب رس' ہمیشہ سے موقتی تحریکوں سے محفوظ رہا ہے لیکن ہر نئے رجحان کو اس میں جگہ ملی ہے۔ اس رسالہ کی اگر خصوصیت ہے بھی تو یہی کہ اس کے صفحات دکنی ادب کی بازیافت کے لیے ہمیشہ کھلے رہے ہیں۔''

(طیب انصاری: حیدرآباد میں اردو صحافت، اعجاز پرنٹنگ پریس حیدرآباد، مطبوعہ جون 1980، ص 189)

رسالہ 'سب رس' نے دکن کے اہل قلم اصحاب، شاعروں، افسانہ نویسوں، جامعہ عثمانیہ کے فرزندوں اور خواتین قلم کاروں کی حوصلہ افزائی کو اپنے دور اول سے اب تک اولیت دی ہے اور ان اصحاب کے دوش بدوش ہندو پاک کے صفِ اول کے لکھنے والوں کا تعاون بھی 'سب رس' کو ہر عہد اور ہر دور میں رہا ہے، جن میں محی الدین قادری زور، عبدالقادر سروری، علی عباس حسینی، پروفیسر مسعود حسین رضوی، قاضی عبدالغفار، امجد حیدر آبادی، نصیر الدین ہاشمی، سلیمان اریب، اکبر الدین صدیقی، میراں جی، محبوب حسین جگر، عابد علی خان، پروفیسر گوپی چند نارنگ، مغنی تبسم، مجتبیٰ حسین اور بیگ احساس وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

اس رسالے کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس نے دکنی ادب کے نوادرات اور جواہر ریزوں کو ادبی دنیا سے متعارف کرایا اور بعد کی تحقیق کے لیے راہیں ہموار کیں اور ساتھ ہی دکن کی کئی اہم ادبی شخصیتوں کی تعمیر بھی کی جن میں خواجہ حمید الدین شاہد، لطیف النساء بیگم، اکبر الدین صدیقی، بشیر النساء بیگم، اور مدیر اول میکش وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ اس سلسلے میں خواجہ حمید الدین شاہد لکھتے ہیں:

'سب رس' نے ایک طرف علم و ادب کی خدمت کی تو دوسری طرف ملک کے نوجوانوں میں ادبی ذوق اور جوش عمل کی روح دوڑا دی۔ نوجوانوں کی علمی و ادبی صلاحیتوں کی صحیح رہنمائی کر کے ان کی قلمی کاوشوں کو سب رس میں شائع کر کے ان کو اردو دنیا سے روشناس کرایا۔ بعض اصحاب تو ایسے ہیں جن کی ادبی زندگی کی ابتدا 'سب رس' ہی میں مضامین کی اشاعت سے شروع ہوئی۔ اور آج وہ اردو دنیا میں شاعر اور ادیب کی حیثیت سے کافی روشناس ہیں۔''

خواجہ حمید الدین شاہد: سرگزشت ادارہ ادبیات اردو، اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد، مطبوعہ 1940، ص 184

ادارہ ادبیات اردو نے 'سب رس' کے معمولی شماروں کے علاوہ مختلف موقعوں پر خاص نمبر بھی شائع کیے ہیں جو دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں اور اردو دنیا میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ ان خصوصی اشاعتوں میں عصر حاضر تک 83 خصوصی نمبرات اور 50 کے قریب خصوصی گوشے شائع ہو چکے ہیں۔ یہ خاص نمبر مختلف موضوعات اور ان کی اہمیت کو نمایاں کرتے ہیں۔ ان میں علمی، ادبی اور سیاسی شخصیتوں پر بھی خاص نمبر ملتے ہیں اور ساتھ ہی ادبی تحریکوں اور ادبی اداروں پر بھی خاص نمبر نکالے گئے ہیں۔ چند کے نام یہاں درج کیے جاتے ہیں۔ محرم نمبر مارچ 1938۔ اقبال نمبر جون 1938۔ دکن نمبر جنوری 1939۔ اردو نمبر جنوری 1940۔ جنگ نمبر فروری 1942۔ ترقی پسند ادب نمبر جولائی 1944۔ قلی قطب شاہ نمبر اپریل، مئی و جون 1958۔ ٹیگور نمبر جون 1961۔ ڈاکٹر زور نمبر اکتوبر، نومبر و دسمبر 1963۔ نصیر الدین ہاشمی نمبر جنوری 1965۔ غالب نمبر حصہ اول ستمبر و اکتوبر 1969۔ حصہ دوم دسمبر 1969۔ احتشام نمبر مارچ 1973۔ اقبال نمبر نومبر 1977۔ حمید الدین شاہد نمبر دسمبر 2001۔ غالب نمبر فروری 2006۔ یہ خاص نمبر اتنے مقبول ہوئے کہ 'سب رس' کے ہم عصر رسائل و جرائد نے اپنے صفحات میں تعریفی و توصیفی الفاظ میں ان پر تبصرے کیے، جن کو بعد میں ادارے کی رپورٹوں میں شامل کیا گیا۔

اردو زبان و ادب کے فروغ میں ماہنامہ 'سب رس' کی خدمات سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن آج کے اس ترقی یافتہ دور میں کمپیوٹر، موبائل فون اور انٹرنیٹ جیسی سہولیات میسر ہونے کے باوجود ایک ریسرچ اسکالر کو 'سب رس' کے ادبی ذخیرے سے استفادہ کرنے کے لیے کافی مشکل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ 'ادارہ ادبیات اردو' کے کتب خانے میں رسالہ 'سب رس' کے تمام پرچے دستیاب نہیں ہیں جو ہیں وہ بھی اور دیگر بے شمار نایاب اور بیش قیمتی کتابیں کرم خوردگی اور گرد و غبار کی نذر ہو رہی ہیں۔

'سب رس' کے سیکڑوں شماروں اور اس میں شائع ہونے والے ہزاروں مقالات و نگارشات سے استفادہ کرنا بھی ایک حد تک ناممکن امر لگتا ہے۔ اس ناممکن کو ممکن بنانے کے لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ رسالے کی آن لائن ویب سائٹ تیار کی جائے اور اس پر تمام شماروں کے مقالات کو بھی اپلوڈ کیا جائے تاکہ ادب دوست اصحاب اور ریسرچ اسکالرز دنیا کے کسی بھی کونے میں بیٹھ کر ان سے استفادہ کر سکیں۔ اس سارے عمل سے تحقیق کے شعبے کو فروغ ملے گا اور عصر حاضر کے تقاضوں کے تحت جو سہولتیں دوسری زبانوں اور علوم میں ایک محقق کو حاصل ہیں وہ اردو کے محققین کو بھی حاصل ہو سکیں گی۔

■

Qammer Ahmed
Research Scholar
Hostel C. Room No. 313
University Of Hyderabad- 500046
Mob: 7006014038
Email: qammerahmed3@gmail.com

جن کتابوں نے مجھے متاثر کیا

خطاب عالم شاذ

میرا خیال ہے کہ زندگی کے نشیب و فراز میں کامیابی یا ناکامی کا سہرا دلچسپی کو جاتا ہے" جہاں دلچسپی کا سامان میسر ہو تو وہاں کام بھی دل سے کیا جاتا ہے اور ایسا کام یقیناً کامیابی سے ہمکنار ہوتا ہے، اس لیے ضروری ہے کہ زندگی کے ہر شعبے میں اپنی دلچسپی کے مطابق کام کا انتخاب کریں اور کامیاب رہیں۔"

مجھے بچپن سے ہی کہانیاں سننے کا شوق تھا۔ شفیع گنج (بہار) جب بھی ننھیال جاتا، میرے نانا کہانیاں سناتے تھے۔ مدرسہ سے نکل کر'حمایت الغرباء پرائمری اسکول' کے درجہ چہارم میں داخل ہوا تو یہاں کہانیاں پڑھنے کا شوق ہوا۔ نصابی کتابوں میں جو بھی کہانیاں ہوتیں وہ مجھے یاد ہو جایا کرتی تھیں۔ کانکی نارہ مدرسہ جامع مسجد میں مولانا و قاری عبدالحمید قاسمی، مولوی عبدالرشید، حافظ فضل الرحمٰن، حافظ سفیر الدین جب بھی وعظ فرماتے میں بغور سنتا تھا۔ یہی حال پرائمری اور ہائی اسکول میں رہا جب بھی نصاب کے حوالے سے یا نصاب سے ہٹ کر ہمارے اساتذۂ کرام اخلاقی یا سماجی باتیں سمجھانے لگتے وہ باتیں میرے ذہن و دل پر نقش کر جاتیں۔ یہ ذہن و دل پر نقش کر جانا اس بات کی دلیل ہے کہ مجھے اچھی باتیں سننے میں دلچسپی تھی بعد ازاں پڑھنے کا رجحان ہوا، پڑھنا اور سننا دونوں ہی میری دلچسپی کے سامان ہیں۔

یہ 1991 کا زمانہ تھا جب میں کلاس پنجم میں 'کانکی نارہ حمایت الغرباء ہائی اسکول' میں داخلہ لیا۔ گرمی کی چھٹی میں، میں اپنے ننھیال گیا تو دیکھا کہ حسب معمول میرے نانا مولوی عظیم الدین (مرحوم) کے پاس شام کے وقت بعد نمازِ مغرب دو چار لوگ آ ہی جاتے تھے۔ خیر و خیریت جاننے کے بعد دنیاوی باتیں ہوتی تھیں اور کبھی لوگوں کے اصرار پر مولوی صاحب اپنے بیان میں دین کی باتیں بتاتے اور پیغمبروں کی کہانیاں سناتے تھے۔ ان ہی کہانیوں میں دو کہانیاں میرے ذہن میں آج بھی محفوظ ہیں۔ پہلی کہانی صبر ایوبؑ اور دوسری کہانی حضرت یوسفؑ کی۔ حضرت یوسفؑ کی کہانی سناتے وقت انھوں نے کہا کہ یوسفؑ پر لکھی کتاب 'داستانِ یوسف' میری الماری میں ہے۔ یہ میرے دو چھوٹے چھوٹے نواسے جو یہاں بیٹھے ہوئے ہیں وہ اسے پڑھ سکتے ہیں لیکن پوری طرح سمجھ پانا ابھی ان کے بس سے باہر ہے کیونکہ اس کتاب میں پوری داستان نظم میں لکھی ہوئی ہے۔ سن کر تجسس بڑھا اور دوسرے دن صبح ان کی الماری کھولا 'داستانِ یوسف' نہیں ملی مگر 'ھدیٰ ڈائجسٹ' میرے ہاتھ لگا اور اوراق گردانی کرتے وقت عنوانات دیکھ کر پڑھنے پر آمادہ ہو گیا۔ پہلا مضمون پڑھ کر ایسا لگا کہ کچھ اور پڑھنا چاہیے اس طرح مذہبی اور اخلاقی مضامین اس ڈائجسٹ میں جتنے بھی تھے پڑھ لیا۔ میں جب تک شفیع گنج رہا، اس درمیان اپنے میلان کے مطابق دوسرے ڈائجسٹ کے مضامین پڑھ لیے۔ 'ھدیٰ ڈائجسٹ' کے مضامین مذہبی، سماجی، اخلاقی اور ثقافتی ہوتے ہیں اس لیے اس کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ 1995 میں میری ماں کا انتقال ہوا، ماں کے انتقال کے تین ماہ بعد گرمی کی چھٹی میں ننھیال گیا تو بہت تلاش کے بعد کتاب 'داستانِ یوسف' مل گئی اور میں نے داستان یوسف نانا مرحوم کی زندگی میں ہی بہار سے بنگال لے آیا۔ یہاں ایک بار نہیں، میں نے کئی بار اس منظوم داستان کو پڑھا تب جا کر باتیں سمجھ میں آئیں۔ شاعری سے شغف رکھنے والے حضرات کو ایسی منظوم کتاب پڑھنی چاہیے۔ میرے نانا 'ھدیٰ ڈائجسٹ' کے خریدار تھے۔ میں جب بھی جاتا اسے وہیں پڑھ لیا کرتا تھا۔

پانچویں سے آٹھویں تک کی درسی کتابوں میں اردو سے میرا لگاؤ زیادہ رہا۔ کہانیاں پڑھتا جوں جوں دن گزرتے گئے وہ کہانیاں بھی میرے ذہن سے مدھم ہو گئیں۔ مگر نہم کلاس میں مجھے اصناف کا پتہ چلا، اس سے پہلے میں سبھی کو بس کہانیاں ہی سمجھتا تھا۔ نہم تا دوازدہم کے نصاب میں شامل اردو کتاب کے مضامین یا افسانے آج بھی میری زندگی کے محور میں گردش کر رہے ہیں۔ مثلاً ڈپٹی نذیر احمد کا ناول مراۃ العروس، افسانوں میں علی عباس حسینی کا 'باسی پھول'، راجندر سنگھ بیدی کا بھولا، ایک چادر میلی سی، لاجونتی، دانہ و دام اور سعادت حسین منٹو کا کالی شلوار، ٹھنڈا گوشت، ٹوبہ ٹیک سنگھ، نیا قانون، کھول دو، خاکوں کا مجموعہ گنجے فرشتے اور جوش ملیح آبادی کی خودنوشت 'یادوں کی بارات' وغیرہ سے میں بہت متاثر ہوا۔ سر سید احمد خان کا ایک مضمون 'رسم و رواج کی پابندی' نے مجھے بہت متاثر کیا اور جب ان کی زندگی کو پڑھا تو ان کا گرویدہ ہو گیا کہ وہ کن کن حالتوں کا سامنا کرتے ہوئے ایک مدرسے کی بنیاد رکھی جو بعد میں اسکول، اسکول سے کالج اور کالج سے یونیورسٹی بنا اور آج یہ بین الاقوامی شہرت یافتہ یونیورسٹی ہے۔

سر سید احمد خان کا مضمون 'رسم و رواج کی پابندی' بہر حال ہر ایک کی زندگی سے بہت قریب رہتا ہے۔ مگر سر سید احمد خان کی سوچ ہم سبھوں سے بہت مختلف تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جو ہم آج سوچ رہے ہیں، وہ انھوں نے سو سال پہلے سوچا، اس پر کام کیا، تبھی ہم سر اٹھا کر ہندوستان میں جینے کے لائق ہوئے ہیں۔ شاذ و نادر ہی ایسی شخصیت جنم لیتی ہے۔ اس لیے میں نے اپنا تخلص شاذ رکھ لیا۔ سعادت حسین منٹو کی بیباکی بھی سماج کے لیے آئینہ اور سماجی حقیقت کی ترجمان ہے۔ راجندر سنگھ بیدی کا ایک افسانہ 'بھولا' میں کبھی نہیں بھولتا، شاید اس لیے میرے بڑے بھائی احمد وکیل علیمی اور خواجہ احمد حسین بھی مجھے بھولا ہی سمجھتے ہیں۔ راجندر سنگھ بیدی کے سبھی افسانے حقیقی زندگی سے بہت قریب تر نظر آتے ہیں۔

ان سب سے ہٹ کر 'شیو کھیڑا' کی لکھی کتاب 'You Can Win' کا ہندی ترجمہ 'جیت آپ کی' پڑھا،

جس نے میری سوچ ہی بدل دی۔ اس کتاب نے مجھے احساس کمتری سے نکال کر پُر عزم بنانے میں کلیدی کردار ادا کیا۔ ہر انسان کو جو کسی بھی شعبے میں کامیابی حاصل کرنا چاہتے ہیں انھیں اس کتاب کو پڑھنا چاہیے۔ اس کتاب میں سیکڑوں حوصلہ افزا حوالے موجود ہیں جو آپ کی راہ میں حائل رکاوٹوں کو دور کرنے میں مددگار ثابت ہوں گے۔ شیوکھیڑا کی اس کتاب کا ترجمہ اب تک 25 زبانوں میں ہو چکا ہے۔ اردو ترجمہ 'تم جیت سکتے ہو' کے نام سے ہے۔

شاعروں میں میر تقی میر، اسد اللہ خاں غالب، علامہ اقبال، فیض احمد فیض کی شاعری سے بھی میں بہت متاثر ہوا۔ میر تقی میر اور غالب کی زندگی سے متاثر ہو کر مجھے غربت سے شکایت دور ہو گئی مگر کتاب 'ذکر میر اور دیوانِ غالب' نہیں پڑھ سکا، صرف 'ذکر میر' کا ذکر سنا اور 'دیوانِ غالب' کے بہت سارے اشعار پڑھے۔ کلیات اقبال میرے ہاتھ آئی تو میں بانگ درا، بال جبرئیل، ضرب کلیم اور ارمغان حجاز پڑھ ڈالا، پڑھ کر حب الوطنی اور تصوف کی طرف مائل ہو گیا لیکن ان کے بہت سارے اشعار جو فارسی زبان میں ہیں سمجھ ہی نہیں پایا۔ فیض احمد فیض کی شاعری نہ صرف اردو دنیا بلکہ غیر اردو داں میں بھی مقبول ہیں۔ ان کے بہت سارے اشعار جو میرے دل کو چھو گئے، ان کی شاعری سے میں بہت متاثر ہوا اور زندگی کے قریب تر پایا لیکن یہاں صرف تین شعر جو مجھے بہت پسند ہیں ذیل درج ہیں۔

ہم پرورش لوح و قلم کرتے رہیں گے
جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے

یہ شعر ہر قلم کاروں کے دل کی آواز ہے۔

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے

یہ بات بھی بیشتر قلم کاروں میں پائی جاتی ہے۔

گلوں میں رنگ بھرے باد نو بہار چلے
چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے

اور یہ شعر ہر نقیب جلسہ شروعاتی دور میں استعمال کر کے نقابت کی مشق کرتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ہنسنا صحت کے لیے فائدہ مند ہے تو میری نظر میں دنیائے ادب میں صحت کے لیے فائدہ مند صنف 'طنز و مزاح' ہے۔ اب دنیائے ادب میں یہ صنف صحت مند ہے یا نہیں یہ ادب کے ڈاکٹر بتائیں گے۔ طنز و مزاح کے حوالے سے میں یہی کہنا چاہوں گا کہ بچپن سے طنز کو عار اور مزاح کو عیب سمجھتا تھا اس لیے طنز و مزاح پڑھنے کی طرف راغب نہ ہوا۔ مگر آج سے قریب چھ سال قبل 2015 میں میرے عزیز دوست علی شاہد دلکش جب جناب قیوم بدر (مغربی بنگال کے مشہور و معروف طنز و مزاح نگار) کا انٹرویو لے نے جا رہے تھے تو مجھے بھی اپنے ساتھ لے گئے۔ واپسی میں انھوں نے ہم دونوں کی خدمت میں اپنی دو کتابیں پیش کیں۔ سوچا کہ طنز و مزاح میں ان کا نام بہت سنا ہوں۔ اب یہ کتابیں میرے ہاتھ آ ہی گئی ہیں تو پڑھ کر دیکھوں کہ کیسا طنز اور کس طرح کا مزاح ہوتا ہے ایسی کتابوں میں؟۔ میں اُن کے مزاحیہ خاکوں کا مجموعہ 'ہمارے ہاتھ سے گر کر جو آئینہ ٹوٹا' پڑھنا شروع کیا تو ہنسی آئی، اتنی آئی کہ مت پوچھیے، اب ہنسنے کے لیے ان کی کتاب کو پڑھنے لگا اور اس طرح مجھے بھی طنز و مزاح سے انسیت ہو گئی۔ ان کی دی ہوئی دوسری کتاب طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا مجموعہ 'ناریل کے پیڑ سے لٹکا ہوا سیب' بھی بڑے ذوق وشوق سے پڑھا۔ حالانکہ اس سے پہلے مقبول زمانہ کتاب 'ہم قبرستان سے بول رہے ہیں' کا ذکر بار ہا سنا مگر کبھی پڑھنے کی خواہش نہیں ہوئی جبکہ قیوم بدر صاحب کے بڑے صاحبزادے خورشید اقبال میرے ہم جماعت ساتھی رہے ہیں۔ کالج کے زمانے تک قیوم بدر کے گھر آنا جانا رہا لیکن میں کبھی ان کے قریب نہیں گیا اور نہ کبھی انھوں نے مجھے اپنے قریب بلایا۔ بہر حال اب میں ان کے بہت قریب ہوں اور ان کی کتابوں کے اسلوب سے بھی بہت متاثر ہوں۔ بات بات میں مزاح پیدا کرنا ان کی فطری عادت ہے۔ قیوم بدر کو مغربی بنگال کا اکلوتا طنز و مزاح نگار ہونے کا شرف حاصل ہے۔ علاوہ ازیں انھوں نے خاکہ نگاری میں بھی اپنی الگ شناخت بنائی ہے ان کا حالیہ مزاحیہ خاکوں کا مجموعہ 'ہمارے ہاتھ سے گر کر جو آئینہ ٹوٹا' مغربی بنگال میں اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے۔ میرے لیے یہ نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں جسے وقفے وقفے سے پڑھنے سے ذہنی انتشار میں راحت کا احساس ہوتا ہے۔

مختصر یہ کہ میں نوعمری میں زیادہ تر پیغمبر اور ولی اللہ کی کہانیاں پڑھنے میں دلچسپی رکھتا تھا مگر کہیں بھی یکجا نہیں پایا۔ اس تشنگی کو ھدیٰ ڈائجسٹ نے پوری کیا۔ نانا صاحب کے انتقال کے بعد ھدیٰ کا نیا شمارہ گاؤں جانے پر بھی ہاتھ نہیں لگتا اور بنگال میں اس ڈائجسٹ کو جب بھی بک اسٹال میں سجا ہوا دیکھتا تو خریدنے کا من کرتا، قیمت دیکھتا تو جیب اس کی اجازت نہیں دیتی تھی، اس لیے صبر کر لیا کرتا تھا۔ ایک دن میں اپنے پڑوس کے گھر کسی کام سے گیا تو وہاں ھدیٰ ڈائجسٹ کی کاپی دیکھ کر ان سے پوچھا کہ کیا آپ اس کے خریدار ہیں، انھوں نے کہا نہیں، میں اپنی پسند کے مطابق خرید لیتا ہوں۔ میرا دوسرا سوال تھا کہ آپ کیا پڑھنا پسند کرتے ہیں؟۔ ان کا جواب تھا صرف ولی اور پیغمبر کے بارے میں۔ یہ سن کر میں نے کہا کہ ہم دونوں ایک ہی مزاج کے مالک ہیں تو یقیناً آپ کے پاس یہ دونوں کا پیاں ہوں گی۔ بولے ہاں ہے مگر وہ چھپا کر رکھا ہے تاکہ کوئی مانگ نہ لے کیونکہ مانگ کر لے جانے والے زیادہ تر واپس ہی نہیں کرتے لیکن آپ کو اگر چاہیے تو میں دے دوں گا۔ میں نے کہا کہ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ آپ چھپی چیز کو ظاہر کر کے بغیر منھ کھولے مجھے دینے کے لیے راضی ہو گئے۔ شکر الحمد للہ میں نے انھیں سے لے کر یہ دونوں نمبروں کو پڑھا اور پڑھ کر انھیں واپس کر دیا۔ پیغمبر نمبر اور ولی اللہ نمبر ہر ایک مسلمان کو بار بار پڑھنا چاہیے تاکہ ایمان تازہ رہے۔

''اللہ نے ہر انسان کو شکل وصورت کے ساتھ اندر کے اوصاف بھی مختلف دیے ہیں۔ ہر انسان اپنی دلچسپی کا سامان اسی طرز پر رکھتا ہے اور متاثر بھی اسی کے مطابق ہوا کرتا ہے لیکن جو ان سب میں مشترک ہے وہ ہے زیست کے ارد گرد گھومنے والی اشیا جیسے زندگی کی بنیادی ضرورتیں، افکار و کردار، عادات واطوار اور اخلاق وغیرہ جو اچھا سے اچھا ہو۔ یہ سبھی باتیں عملی جامہ پہنانے کے لیے ایک ایسی کتاب میں پائی جاتی ہیں جس نے پوری دنیا کو متاثر کیا، تو بھلا ہم اس سے متاثر کیسے نہ ہوتے؟ وہ کتاب قرآن شریف ہے''

قرآن شریف کو اگر بالترتیب نزول مع ترجمہ وتفسیر پڑھا جائے تو یہ سمجھ پائیں گے کہ کن کن حالتوں میں قرآن کا نزول ہوا اور اللہ تعالیٰ نے کس کس موقعے پر دنیا والوں کو، ایمان والے مسلمانوں اور مومنوں کو کس طرح کی ہدایتیں دیں؟ کس کو خوشخبری سنائی؟ کس پر رحمتوں کی بارش کی اور کیوں کی؟ کس پر پھٹکار لگائی اور کیوں لگائی؟ یہ ساری باتیں سمجھ میں آئیں گی۔ اس دنیا میں زندگی گزارنے کا مکمل ضابطہ قرآن میں موجود ہے جو مکمل سائنٹیفک ہے اور دنیا کے سبھی سائنسی ایجادات قرآن کی روشنی میں ہی ہوئی ہیں۔ دنیا کی سب سے مؤثر ترین کتاب قرآن شریف ہے جسے جتنی بار پڑھیں گے اتنی بار متاثر ہوں گے کیونکہ ہر بار کچھ الگ باتیں آپ کے سامنے آئیں گی اور نزول کے حساب سے حقیقی معنی ومطلب سمجھ پائیں گے۔

■

Khattab Alam
H/No: 23, BL. No:5
Post: Kankinara- 743126
Distt.: North 24, Parganas (W.B)
Mob.:09339966186

عہد وسطیٰ کے دیہی بازار اور زرعی پیداوار

منصور احمد صدیقی

آج اکیسویں صدی کی ترقی یافتہ دنیا کے چمکتے دمکتے پُر رونق بازار اور ان کی گہما گہمی دیکھ کر دلی سلطنت و مغلیہ عہد کے ان بازاروں کا تصور محال ہے جہاں فروخت ہونے والی اشیا عموماً ذاتی ضرورتوں کے مطابق ہی مہیا ہوتی تھیں۔ یقیناً اس دور میں انسان کی ضروریات زندگی بھی محدود تھیں۔ عہد وسطیٰ کے شہروں میں تو ہمیں پھر بھی کچھ سامان تعیش بکتا نظر آتا ہے جس کے صارفین امرا و روسا بلا شبہ بہتر معیار حیات رکھتے تھے۔ مگر گاؤں کے بازاروں کی صورت حال بالکل الگ تھی، جس کا تجزیہ آسان نہیں ہے۔ آج بھی کہا جاتا ہے کہ اصل ہندوستان گاؤں میں بستا ہے جہاں کی اہم آبادی کسانوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ گاؤں کے بازار اس زندگی کی تصویر پیش کرتے ہیں جو صرف کسان کے گرد گھومتی ہے۔ عہد وسطیٰ کے دیہی بازار ہمیں اس زمانے کے کسان کی ہی تصویر نہیں دکھاتے ہیں بلکہ ان کے جائزہ سے ملک کی زرعی اشیا کی پیداوار اور ان اشیا کی تجارت سے بھی آگاہی ہوتی ہے۔

کسان کی سادگی اور محدود ضروریات زندگی دیہات کے طرز معاشرت کی نہ صرف عکاسی کرتی ہیں بلکہ ہندوستانی آبادی کے بڑے حصے کی صورت حال بھی بیان کرتی ہیں۔ اگر قحط و ٹڈی دل جیسی قدرتی آفات سے محفوظ رہ جائے تو اس کے کھیت نہ صرف گاؤں کی پوری آبادی کے لیے خوراک مہیا کر دیتے ہیں بلکہ بازار کے لیے بھی اناج فراہم ہو جاتا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے جب ہم عہد وسطیٰ پر نظر ڈالتے ہیں تو صورت حال گاؤں کی معاشی اہمیت اور کسان کی کسمپرسی کو اور زیادہ اجاگر کر دیتی ہے۔ سلاطین دہلی اور مغلوں کے دور حکومت میں بہت سے چھوٹے بڑے شہر ہندوستان کے نقشے پر نظر آتے ہیں۔ فیروز تغلق نے جونپور، فیروز پور اور حصار جیسے کئی اہم شہر آباد کیے تھے۔ اکبر کے دور حکومت میں 120 بڑے شہر اور 3200 چھوٹے قصبات تھے جن کے تحت 100 سے لے کر ایک ہزار تک گاؤں آتے تھے۔[1] آگرہ سترھویں صدی کا سب سے بڑا شہر تسلیم کیا جاتا ہے جس کی آبادی زیویئر کے مطابق 6 لاکھ سے بھی زیادہ تھی۔ دہلی آگرہ سے چھوٹا تھا مگر پھر بھی یوروپ کے سب سے بڑے شہر پیرس کے مساوی آبادی رکھتا تھا۔[2] ان کے علاوہ لاہور، ملتان، ڈھاکہ، احمد آباد اور پٹنہ وغیرہ دیگر اہم اور بڑے شہر تھے مگر یہ تمام بڑے شہر معاشی معاملات میں دیہات پر منحصر تھے۔ ایک طرف گاؤں ان کے لیے سامان خوراک فراہم کرتے تو دوسری طرف ان کی صنعتوں کے لیے خام مال بھی دیہات ہی سے آتا تھا جن کی مدد سے سامان تعیش تیار ہوتا جو شہر کے صارفین بازار اور خصوصاً طبقہ امرا کے گھروں کی زینت بنتا مگر غذائی اشیا کی مانگ سب سے زیادہ تھی جو ظاہر ہے عوام کی بنیادی ضرورت تھی۔ انھیں بھی گاؤں پورا کرتے تھے۔

اس دور میں گاؤں تقریباً ایک خود کفیل ادارہ کی حیثیت رکھتا تھا جہاں ضرورت کے لیے اشیا پیدا کی جاتی تھیں اگر فصل اچھی ہوتی یا کئی سال تک اچھی ہوتی رہتی تو کسان اتنا اناج پیدا کر لیتا جسے قریبی منڈی میں فروخت کے لیے لے جایا جاتا۔ حالانکہ حمل و نقل کی قلت کے سبب ایک خطے سے دوسرے خطے کو منتقل ہونے والا یہ سامان کل پیداوار کا ایک چھوٹا حصہ ہوتا تھا۔

اس دور میں بھی کئی بڑی شاہرائیں ہندوستان کے سینے پر بل کھاتی نظر آتی ہیں[3] مگر لمبے فاصلے کی تجارت کا بڑا حصہ بیل گاڑیوں، اونٹوں اور بار برداری کے بیلوں کے ذریعے ان کچے راستوں سے ہوتا جس کی حیثیت پگ ڈنڈیوں سے زیادہ نہ تھی اور جہاں بڑی شاہراہوں کی طرح نہ تو سرائے موجود تھیں اور نہ ہی قیام و طعام کا کوئی انتظام تھا۔ یہی وجہ تھی کہ بڑے پیمانے پر تجارت ایک مخصوص طبقے یا چند ذاتوں تک ہی محدود تھی۔ چھوٹے قصبوں کے کاروبار پیشہ ور تاجروں کے ہاتھ میں تھے۔ شمالی ہند میں ملتانی اور مغربی ساحل پر گجراتی پیشہ ور اہم تجارتی اقوام تھیں۔ کچھ تاجر تھوک فروش تھے اور کچھ چھکر بیچنے والے تھوک فروش تاجروں کو سیٹھ یا بوہرہ کہا جاتا اور پھکڑ تاجر بیوپاری یا پایک کہلاتے۔ جنوبی ہند میں تجارتی برادری شیٹی لوگوں پر مشتمل تھی۔ بھاری اور بڑے سامان مثلاً اناج، شکر، گھی، نمک وغیرہ کی تجارت بنجاروں کے ذریعہ انجام پاتی۔ بنجارے مال سے لدے ہوئے بیلوں کے بڑے بڑے ریوڑوں کے ذریعے جن میں منڈی اور تھامس کے مطابق 20 ہزار تک بیل ہوتے اور ڈھائی ہزار ٹن تک مال ڈھو سکتے تھے ایک جگہ سے دوسری جگہ سامان منتقل کرتے۔[4] مورخین کے مطابق فوج کو رسد پہنچانے کے لیے ایک لاکھ سے بھی زیادہ بیل استعمال ہوتے تھے۔ دیگر ذرائع کے مقابلے میں بنجاروں کے ذریعے سامان کی منتقلی سستی ثابت ہوتی مگر تمام ذرائع سے ہونے والی لمبے فاصلے کی تجارت کے ذریعے جو سامان ایک سے دوسری جگہ منتقل ہوتا وہ کثیر ہونے کے باوجود عرفان حبیب کی رائے میں کل پیداوار کا ایک چھوٹا سا جز ہوتا۔[5] ہمارا عہد وسطیٰ جو سلاطین دہلی اور مغل بادشاہوں کے دور حکمرانی پر محیط ہے گاؤں کی تجارتی و معاشی زندگی کی ایک بہتر تصویر پیش کرتا ہے گو یہ سچ ہے کہ ہمارے ماخذ سیاسی معاملات میں جتنے مفصل اور واضح نظر آتے ہیں، اقتصادیات میں اتنا نہیں ہیں، مگر پھر بھی ان کا محتاط جائزہ عہد وسطیٰ کے دیہات کی تجارتی سرگرمیوں پر کافی روشنی ڈالتا ہے۔

مورلینڈ و عرفان حبیب کی تحقیق کے مطابق عہد وسطیٰ کی اہم فصلوں میں گیہوں، باجرہ، جو، چاول، دالیں، گنا، کپاس اور تیل کے بیج وغیرہ شامل ہیں۔ ان کے علاوہ خوشبودار لکڑی اور گرم مصالے بھی خاص پیداوار میں گنے جاتے ہیں۔[6] مراقشی سیاح ابن بطوطہ کا کہنا ہے کہ الٰہ آباد کے قریب کڑا اور مانک پور سے عمدہ قسم کا چاول، گیہوں اور گنا دہلی کو برآمد کیا جاتا تھا۔ بعد میں عمدہ قسم کا چاول لاہور میں بویا جانے لگا تھا۔ نقدی فصلوں میں کپاس خاندیش کے خطہ اور تقریباً پورے شمالی ہندوستان میں کاشت کی جاتی۔ شکر کے لیے بنگال اہم علاقہ تھا۔ نل سب سے بہتر آگرہ کے قریب بیانہ میں پیدا ہوتا۔ مصالحہ جات میں لمبی سیاہ مرچ فلفل دراز بنگال میں اور گول سیاہ مرچ مغربی گھاٹ کے پہاڑی سلسلوں میں پیدا ہوتی۔[7] ترکاریوں کی کاشت وسیع پیمانے پر تھی۔ عموماً مالی اس کاشت سے وابستہ تھے جو آبادیوں کے نواح میں انھیں اگاتے تھے۔ شہری مانگ کی وجہ سے ترکاریوں کی کاشت بھی اہمیت اختیار کر گئی تھی۔

اس دور کی مجموعی زرعی پیداوار سیر حاصل تھی۔ زمین کی زرخیزی حکمرانوں کی اس سمت میں کوشش کا نتیجہ تھی۔ جس میں محمد بن تغلق کے دیوان کوہی اور شیر شاہ و اکبر کی مثبت پیش قدمی کا اہم کردار رہا ہے۔ علاوہ ازیں بہتر

آبپاشی نے زراعت کو ترقی دی جس کے نتیجے میں خالصتاً دیہی تجارت کو بھی فروغ ہوا۔ خاص طور سے نقدی فصل کی کاشت کرنے والے علاقوں میں اناج کی ضرورت بازار کے ذریعے ہی پوری کی جاسکتی تھی۔ نمک، گڑ، تیل اور گھی وغیرہ کے معاملے میں بھی سب گاؤں خودکفیل نہیں ہوتے تھے اور ان کی ضروریات بھی دیہی بازار پوری کرتے۔ بے دبہک، سارتھ باہک جیسے ناموں سے پکارے جانے والے تاجر مذکور اشیا کی تجارت کرتے عموماً کسان لگان نقدی کی شکل میں ادا کرتے اس صورت میں اپنی پیداوار کو بازار میں فروخت کرنے کی ذمے داری انھیں ہی اٹھانی پڑتی۔ اس صورت میں وہ اپنی پیداوار خود کی یا کرائے کی گاڑیوں پر مقامی بازار یا قریب کے شہروں کو لے جاکر فروخت کرنے پر مجبور ہوتے۔ گماشتے پیداوار کی فروخت سے منسلک ہوجاتے۔ اکثر کسان کے پاس مقروض ہونے کی شکل میں یہ پیداوار اپنے قرض خواہ کو پہلے سے طے شدہ نرخ پر فروخت کرنے کے علاوہ کوئی اور چارہ نہیں ہوتا اور اس طرح وہ بازار یا منڈی تک پہنچ ہی نہیں پاتا۔ یہی نہیں کسان فصل اگانے کے سلسلے میں جن تاجروں یا گاؤں کے مہاجنوں سے قرض لیتا وہ اپنی رقم کے بدلے میں بہت کم قیمت پر کسان کی پیداوار خریدتے۔ اس کے علاوہ ایک اور مشکل یہ تھی کہ روپیہ کی فوری ضرورت اسے پیداوار کو بہ عجلت فروخت کرنے پر مجبور کرتی۔ علاوہ ازیں اپنی پیداوار کو بازار تک لے جانے میں اسے مختلف محصول اور رشوت بھی ادا کرنی پڑتی تھی۔ عہد وسطیٰ کے کسان کو اجارہ داری کا سامنا بھی کرنا پڑتا تھا جس کے تحت اکثر مقامی حکام اسے مجبور کرتے کہ وہ اپنی پیداوار کسی منفرد خریداروں کے گروہ کے ہاتھ ہی فروخت کرے اس سے کسان کو ملنے والی رقم منڈی کی قیمتوں سے کافی کم ہوتی یہ فرق اگر زیادہ ہوتا تو ان منڈیوں کے تاجر اور خریدار دونوں کوشش کرتے کہ وہ براہ راست کسان سے خریداری کریں جس کے نتیجے میں کسان کو فائدہ ہوجاتا۔

دیہی معاشی نظام کے تحت مقامی تجارت کے کئی مرکز ہوتے۔ گاؤں کے ہی کسی حصے میں مستقل وغیر مستقل دوکانوں پر مشتمل ایک چھوٹا سا بازار ہوتا جہاں چھوٹے چھوٹے دوکاندار اناج، شکر، تیل، مٹھائی وغیرہ ضرورت زندگی کی مختلف اشیا بیچتے ان دیہی بازاروں میں کبھی کبھی صراف کی شکل دکھائی دیتی جو تانبہ اور کوڑیوں کے بدلے چاندی دیتا یہ کم محنت اور تھوڑی اشیا خریدنے کے واسطے کسانوں کی ایسی گزرگاہ تھی جہاں وہ ہمیشہ آجاسکتے تھے۔ گاؤں والوں کی ضرورتوں کو زیادہ بڑے پیمانے پر پورا کرنے کے لیے دو چار دن یا ہفتے بھر کے وقفہ جات بازار لگتے۔ یہ ہاٹ بازار گردونواح کے دیہاتوں کے تجارتی مرکز ہوتے۔ یہاں اناج واشیائے خوردونوش سے لے کر برتن اور چمک والے مصنوعی زیورات تک ملتے۔ سماج میں یہ ہاٹ بازار بڑی اہمیت رکھتے یہاں وہ اس دن یا ہفتے بھر کی ضروریات کا سامان اکٹھا کر لیتے۔ ان بازاروں کی رونق دیہی معاشی سرگرمیوں کی بہترین عکاس ہے جو ہمارے عہد وسطیٰ کے کسان کے لیے آج کے کسی جدید شاپنگ کمپلکس سے کم نہیں تھی۔ ان ہاٹ بازاروں کے علاوہ وقتاً فوقتاً سالانہ لگنے والے میلے بھی تجارت کا بڑا مرکز تھے۔ ان میلوں میں بچے اپنے کھلونوں کے لیے اور عورتیں کپڑا وبرتن اور آرائشی مصنوعات خریدنے کے لیے بے تحاشہ کھنچے چلے جاتے۔ اس معاشی نظام میں حلقے کی منڈیاں لوگوں کی کشش کا خاص مرکز ہوتیں۔ مغلوں کی پالیسیاں معیشت زر کو فروغ دینے میں معاون ثابت ہوئیں۔ ضبطی نظام کے تحت زمین کا لگان مختص کرنے کے بعد اسے نقد وصول کیا جاتا۔ کسانوں کو لگان تشخیص کرنے کے کسی بھی طریقے کو انتخاب کرنے کا حق حاصل تھا۔ وہ فصل کی تقسیم کے طریقے کو اپناتا تو سرکاری حصے کا غلہ آڑھتیوں کی معرفت گاؤں میں بھی فروخت کیا جاتا۔ ایک اندازے کے مطابق دیہی پیداوار کا 20 فیصد حصہ بازار میں جاتا تھا۔ دیہی غلہ منڈیوں کے اضافہ نے چھوٹے چھوٹے قصبوں کی تعداد بڑھادی۔

بازاروں اور منڈیوں کے علاوہ گاڑیوں میں چھوٹے چھوٹے دوکاندار و تاجر گھوم گھوم کر اشیا فروخت کرتے۔ یہ پھیری والے بیلوں وغیرہ پر مختلف اشیاء لاد کر جگہ جگہ جاتے اس طرح دیہی صارفین تک سامان ان کے گھروں پر ہی پہنچا دیتے۔ بیل، گائے، بھینس، بکری اور اونٹ وغیرہ کے لیے مویشیوں کے علیحدہ بازار لگتے تھے۔

مختلف اقسام کے دیہی بازاروں میں فروخت ہونے والی اشیا کا جائزہ لینے سے اندازہ ہوتا ہے کہ گاؤں کے عوام کی ضروریات زندگی نہ صرف محدود تھیں بلکہ ان میں تنوع بھی نہیں تھا۔ کسان اپنی ذات پر غلہ کی کتنی مقدار خرچ کرتا تھا اس کی معلومات ناکافی ہیں۔ البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ کسان اپنے اوپر اپنی پیداوار کی سب سے معمولی قسم خرچ کرتا ایک جائزہ کے مطابق آگرہ و دہلی میں بہترین گیہوں پیدا ہوتا لیکن یہاں کے عوام کی غذا میں یہ شامل نہیں تھا اور یہ لوگ چاول باجرہ اور جو کھاتے۔ اسی طرح ان کا لباس سادہ، مکانات عموماً لکڑی و پھوس کے ہوتے۔

دیہی بازار میں منڈیاں جو کسان کی زندگی کا اہم حصہ تھیں قحط کے زمانے میں ویران ہوجاتیں اگر مناسب وقت پر بارش نہ ہوتی یا زیادہ ہو جاتی یا کوئی دیگر قدرتی آفت فصلوں کو تباہ کردیتی تو پھر کسان کا بھی سب کچھ برباد ہو جاتا۔ موجودہ دور میں ریلوے کے بہتر نظام اور حمل ونقل کی دیگر سہولیات کے سبب متاثرہ علاقوں میں دوسری جگہوں سے غذائی اشیا کو بہ آسانی پہنچایا جاسکتا ہے جو عہد وسطیٰ میں ممکن نہیں تھا۔ گویا قحط کے دوران مقامی تجارت بالکل ٹھپ ہوجاتی۔ دیہی بازار سونے ہوجاتے۔ غذا کی قلت کے سبب بچے کوڑیوں کے بھاؤ بیچ دیے جاتے۔ مثلاً 1554-55 میں پڑنے والے قحط نے آگرہ، بیانہ اور دہلی کے آس پاس کے علاقوں کو تباہ کردیا۔ بڑی تعداد میں ہلاکتیں ہوئیں۔ جنگل کی خشک گھاس، مصری کانٹے کے بیج اور جانوروں کا چمڑہ لوگ کھانے پر مجبور ہو گئے۔[8] اس دوران نہ بازار کھلے نہ ضرورت کے لیے سامان ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جایا گیا، ساری معاشی وتجارتی سرگرمیاں ٹھپ ہوگئیں۔ مردم خوری کی نوبت آگئی، کسان اور کاشتکار لاپتہ ہو گئے۔ ہمارا عہد وسطیٰ اس طرح کی بہت سی مثالوں کا شاہد ہے۔ تباہ شدہ کھیت، کسانوں کو اپنے گھروں کو خیرباد کہنے اور دور دراز علاقوں میں منتقل ہونے پر مجبور کردیتے۔

عہد وسطیٰ کا دیہات ایک ایسی خودمختار معاشی اکائی کی حیثیت رکھتا ہے جو اپنی ضرورت زندگی کے لیے عموماً کسی دوسرے کا محتاج نہیں ہوتا، کسان مرکزی کردار ہوتا جو پورے گاؤں کے لیے خوراک مہیا کرتا۔ دوسرے لوگ مثلاً بڑھئی، لوہار، فوجی، دھوبی، نائی، گوالے، پجاری، ڈاکٹر یہاں تک کہ فقیر و جادوگر بھی کسان کے معاون کی حیثیت سے نظر آتے ہیں۔ لوہے کے اوزار، گھریلو برتن اور چولھے بنانے والے اپنی غذا کے لیے اسی کسان سے وابستہ ہوئے۔ غرض تمام لوگ ایک ایسی اکائی کی شکل میں کام کرتے جس کی کارکردگی زندگی کو رواں دواں رکھتی۔

حواشی:

1 نظام الدین احمد، طبقات اکبری، ببلکا انڈیا، کلکتہ 3، ص 345
2 ایف برنیئر، ٹریولس ان دی مغل ایمپائر، لندن، 1916، ص 281
3 طبقات اکبری، (2) ص 106
4 جے۔ بی۔ ٹریونیئر، ٹریولس ان انڈیا، لندن، 1925، ص 33-34
5 عرفان حبیب، مغل ہندوستان کا طریق زراعت (ترجمہ) ص 122
6 ایضاً، ص 65-70
7 ابوالفضل، آئین اکبری، ببلکا انڈیا، کلکتہ، 1867 (1) ص 390
8 عبدالقادر بدایونی، منتخب التواریخ، ببلکا انڈیا، کلکتہ 1864 (1) ص 428-29

■

Dr. Mansoor Ahmad Siddiqui
Asst. Prof. Dept of History
G.F. College
Shahjahanpur - 242001 (UP)
Mob.: 8171451517
Email.: mansoorsiddiqui1967@gmail.com

انس مسرور انصاری سے ایک ملاقات

ساجد جلال پوری

خطّۂ اودھ میں گھاگھرا ندی کے کنارے آباد قدیم ادبی،تہذیبی وصنعتی شہر ٹانڈہ، ضلع امبیڈکر نگر(یو۔پی۔) اہم مقام رکھتا ہے یہاں مختلف علوم و فنون اور شعبوں سے تعلق رکھنے والی شخصیات ہر دور میں موجود رہی ہیں۔ کارخانوں کے شور وغل سے اگر انتظامِ لباس و جامہ ہے تو صاحبان علم و فن کے یہاں صریرِ خامہ بھی ہے۔ادب میں کثرت سے ایسی شخصیتیں گزری ہیں جنھوں نے غربت و تنگدستی کے باوجود تعلیم و تعلم،مطالعہ،تصنیف و تالیف کا دامن نہیں چھوڑا۔ادبی جنون کا وہ عالم کہ نا مساعد و نا موافق حالات سے لڑ کر علم و ادب کی خدمت کرتے رہے۔شاعرِمزدور احسان دانش سے لے کر آج تک بے شمار ادیب و شاعر، عہدہ،منصب،ثروت،انعام و اکرام سے بے نیاز ہو کر دن رات عروسِ ادب کی زیبائش و آرائش میں مصروف ہیں۔اسی قبیل میں ایک خاموش طبیعت، ملنسار شاعر،ادیب،محقق و صحافی اور پچاس کے قریب کتابوں کے مصنف جناب انس مسرور انصاری صاحب بھی ہیں۔ان سے ہوئی گفتگو کی کچھ باتیں پیش خدمت ہیں۔

ساجد جلال پوری: آپ کی پیدائش کب اور کہاں ہوئی ؟

انس مسرور انصاری: 2 مئی 1952 کو(تخمینی سنہ) قصبہ ٹانڈہ، ضلع فیض آباد(موجودہ ضلع امبیڈکرنگر) میں پیدا ہوا۔

س ج: اپنے تعلیمی سفراور تفصیلات سے آگاہ فرمائیں۔ سنا ہے کہ غریبی اور تنگ دستی کے سبب بچپن میں کسی اسکول یا مدرسے میں داخلہ نہ لے سکے اور چودہ پندرہ سال کی عمر میں اپنے تعلیمی سفر کا آغاز کیا ؟

ا م ن: جی ہاں۔دراصل اقتصادی اور تعلیمی پسماندہ معاشرے میں میری پرورش ہوئی۔ بہت ہی کم لوگ تعلیم یافتہ تھے۔واجبی تعلیم کی طرف بھی لوگوں کی توجہ نہ تھی۔ ہاں،مکاتب بہت زیادہ تھے۔قرآن مجید کو حفظ کرنے کا بڑا رواج تھا۔قصبے کے اکثر گھروں میں کئی کئی حافظ قرآن تھے۔ جہاں تک میں جانتا ہوں، ملک بھر میں شاید ہی کوئی قصبہ ہو جہاں اتنی کثرت سے لوگ حافظ قرآن ہوں۔ رمضان شریف میں یہاں کے حفاظ کو دور دور سے تراویح پڑھانے کے دعوت نامے آتے۔شہروں اور قصبوں میں حفاظ پھیل جاتے اور ایک ماہ اپنے وطن اور اہلِ وعیال سے دور تراویح پڑھاتے۔

غریبی اور تنگ دستی مگر سادگی پسندی، خلوص ومحبت، اُخوت، بھائی چارہ اور ایثار وقربانی کے جذبوں پر جس معاشرے نے تشکیل پائی تھی، میں اُسی کا پروردہ ہوں۔ میری ایک بڑی بہن مدینہ خاتون ہیں جو الحمدللہ ابھی حیات ہیں۔ان کی پیدائش کے بیس سال بعد والدین کی دعاؤں اور منتوں، مرادوں کے بعد میں عالمِ وجود میں آیا۔خوب جشن منائے گئے۔اس کے بعد میرے چھوٹے بھائی محمد ارشد ہیں جو بعد میں ڈاکٹر چودھری محمد ارشد کے نام سے معروف ہوئے۔ انھوں نے بنارس ہندو یونیورسٹی سے ڈاکٹر حکم چندنیّر کی نگرانی میں، ان کے حکم پر پنڈت دیاشنکر نسیم کی مثنوی 'گلزارِ نسیم' پر تحقیقی کام کیا اور 'گلزارِ نسیم کا لسانی مطالعہ' لکھ کر پی،ایچ،ڈی کی سند حاصل کی۔

پانچ چھ سال کی عمر ہوئی تو میرے والد نے مجھے حافظ غلام رسول شاہ کے مکتب میں حفظِ قرآن کے لیے داخل کیا جہاں میں نے قرآن پڑھا اور حفظ کیا۔

ہمارے قصبے میں اکثریت میں لوگ پارچہ بافی کی صنعت سے منسلک تھے۔گھروں میں ہتھ کرگھے پر کپڑوں کی بنائی ہوتی۔یہی ذریعہ معاش تھا۔گھر میں چار چھ لوگ ہوتے تو ایک کی کمائی پر سب کی گذراوقات ہو جاتی۔ بڑی بے فکری کا زمانہ تھا۔قناعت پسندی عام تھی۔میرے گھر میں بھی ایک ہتھ کرگھا تھا جس پر میرے والد کپڑا بنتے اور بازار میں فروخت کرتے۔ہم دو بھائی اور دو بہنیں تھیں۔ چھوٹی بہن فوت ہوگئی۔ بڑی بہن اپنے گھر کی تھیں۔ پانچ نفوس پر مشتمل کنبہ تنگی مگر سکون اور عافیت میں تھا۔ابا کماتے اور ہم سب کے لیے کافی ہو جاتا۔اس زمانے میں مال جمع کرنے کا لالچ نہ تھا۔زندگی بڑی پُرسکون تھی۔

حافظہ کرتے کرتے میری عمر بارہ تیرہ سال کی ہوگئی۔ اسکول اور مدرسے بہت کم تھے۔لوگوں میں تعلیم کی رغبت نہ تھی۔میری مزید تعلیم کی طرف والدین نے کوئی خاص توجہ نہ کی اور میں آوارہ گردی کرنے لگا۔

س ج: اپنے خاندانی پس منظر پر تھوڑی روشنی ڈالیں۔ کیا گھر میں شعروادب کا ماحول تھا؟

ا م ن: عموماً میرے خاندان میں مذہبی تعلیم کا رواج تھا۔ میرے نانا حافظ فخرالدین کا ایک بڑا مکتب تھا جہاں سے کثیر تعداد میں حفاظ پیدا ہوئے۔ میرے ماموں مولانا مفتی زین العابدین پایہ کے عالم اور مدرسہ منظرِ حق میں صدرالصدور تھے۔میرے تین داداؤں میں چھوٹے دادا جناب فقیر محمد صاحب شعروشاعری کا ستھرا ذوق رکھتے تھے اور ڈاکٹر ذوقی کے حلقۂ تلامذہ میں تھے۔ان کے علاوہ میرے خاندان میں دور تک شعری ذوق کا پتا نہیں چلتا۔

س ج: آپ کا ذریعۂ معاش کیا ہے؟

ا م ن: پارچہ بافی کی صنعت۔

س ج: شاعری کا آغاز کب ہوا؟ اگر پہلا شعر یاد ہو تو سنائیں۔

ا م ن: 1970 کے آس پاس میں نے شعر کہنا شروع کیا۔ وہ پہلا شعر مجھے اب تک یاد ہے۔راہ چلتے چلتے اچانک نازل ہوا۔

کیا خوش گوار موسم کیا دلنشیں ہَوا ہے
جو کچھ بھی ہے جہاں میں سب رحمتِ خدا ہے

میرے استادِ محترم مولانا عبیدالرّحمٰن منظری نے پہلا مکمل شعر سنا تو بہت خوش ہوئے۔میری بڑی حوصلہ افزائی فرمائی۔

س ج: آپ کی پہلی تخلیق کس رسالے میں شائع ہوئی۔؟

ا م ن: روزنامہ 'قومی آواز' (لکھنؤ) کے سنڈے اڈیشن میں میری پہلی نظم 'مطربہ' نمایاں طور پر شائع ہوئی۔ میں خوشی سے دیوانہ سا ہو گیا۔قارئین نے نظم کی بڑی تعریف کی۔میرا حوصلہ اور بلند ہوگیا۔نظم کی اشاعت کا پس منظر نہ بیان کروں تو بڑی ناشکر گذاری ہوگی۔ میں رسائل وجرائد میں اپنی تخلیقات برابر بھیجتا رہتا تھا۔اکثر نا قابلِ اشاعت

کے نوٹ کے ساتھ واپس آجاتیں۔ چھپنے کا بڑا شوق تھا لیکن صورتِ حال بہت مایوس کن تھی۔ قومی آواز میں جب میں نے مذکورہ نظم اشاعت کے لیے بھیجی تو بالکل اُمید نہ تھی کہ چھپ سکے گی۔ میں نے بھی عہد کر رکھا تھا کہ اپنی تخلیقات برابر بھیجتا رہوں گا۔ سو میں اس پر قائم تھا۔ چند ہفتے بعد ایک صاحب نے مجھے خبر دی کہ قومی آواز میں آپ کی نظم شائع ہوئی ہے، مجھے یقین نہ آیا۔ پھر بھی میں بھاگا بھاگا قریبی چائے خانے میں پہنچا اور اپنی نظم 'مطربہ' دیکھی تو بہت جذباتی ہوگیا۔ یہ نظم اصلاح کے بعد شائع کی گئی تھی۔ اس زمانے میں حیات اللہ انصاری قومی آواز کے ایڈیٹر تھے۔

نظم کا پہلا شعر مجھے یاد ہے۔

مرے مطرب ابھی رہنے دے اپنے سرمدی نغمے
ابھی کتنے ہی مژگاں ہیں کہ آنسو تھرتھراتے ہیں

س ج: اپنے آبائی وطن ٹانڈہ کے قدیم ادبی ماحول پر کچھ نہ کچھ تبصرہ فرمائیں۔

ا م ن: ٹانڈہ اپنی پارچہ بافی کی قدیم صنعت کے سبب مشہورِ زمانہ رہا ہے۔ ہتھ کرگھے کی رخصتی کے بعد جب پاورلوم آگیا تو لوگوں کی فرصتیں کم ہوگئیں۔ مشینوں کے شور سے رات دن قصبے کی فضائیں گونجنے لگیں تاہم یہاں کے باشندوں کا روایتی علمی وادبی ذوق اپنے شباب پر تھا۔ بڑے بڑے مشاعرے منعقد ہوتے جن میں ہندوستان کے معروف شعرا تشریف لاتے۔ مقامی مشاعرے بھی قریب قریب ہر ہفتے ہوتے اور سامعین مقامی شاعروں کو بھی اسی دلچسپی سے سنتے۔ ان مشاعروں میں مومن لائبریری کا سالانہ مشاعرہ بہت مقبول تھا۔

میرے بچپن میں جب ابھی قصبے میں بجلی نہیں آئی تھی، لالٹین کی روشنی میں لوگ کام کرتے تھے۔ دن بھر کام، رات کو آرام۔ رات کے اوّل پہر کی فرصتیں تھیں۔ حقہ پینے والوں کے گروہ در گروہ تھے۔ چاندنی راتوں میں حضرت مولانا عبدالعزیز صاحب سے مثنوی مولانا روم سننے کا بڑا رواج تھا۔ مولانا صاحب کے لیے ایک چوکی بچھائی جاتی جس پر ایک سفید چادر ہوتی۔ لوگ ننگے فرش پر بیٹھ کر مولانا صاحب سے 'مثنوی مولانا روم' سنتے۔ مولانا بھی ترنم سے شعر پڑھ کر اتنی شرح وبسط کے ساتھ آسان زبان میں ترجمہ بیان کرتے کہ کوئی جواب نہ تھا۔ آئے دن اس طرح کی محفلیں سجتیں۔ جب حفیظ جالندھری کا شاہنامۂ اسلام آگیا تو اسی اہتمام سے شاہنامے کی محفلیں بھی منعقد ہونے لگیں۔

صنعتی قصبہ اور ناخواندگی کے باوجود اس سرزمین نے بڑے بڑے نامور علما، شعرا اور ادبا پیدا کیے یہاں کے پسماندہ سماج نے جن شخصیات کی تشکیل کی ان میں شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی، حکیم خلیل الرحمٰن (شاگرد حکیم اجمل خان)، پروفیسر ظہور الحق (مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) پروفیسر محمود الٰہی (گورکھ پور یونیورسٹی) ڈاکٹر سید عبدالباری (شبنم سبحانی صدر ادارہ ادب اسلامی ہند) مجروح سلطانپوری، ڈاکٹر محمد ایوب ذوقی (گولڈ میڈلسٹ) الحاج محمد زماں (امیر جماعتِ اسلامی۔ بنیاد گزار مسلم نسواں انٹر کالج) وغیرہ کے نام اور کام بہت روشن ہیں۔

س ج: آپ کی اب تک کتنی تصنیفات زیورِ طبع سے آراستہ ہوچکی ہیں۔؟

ا م ن: میری اب تک 38 کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔ علمی وادبی مضامین کے دو مجموعے 'دھوپ اور سائبان' اور 'عکس اور امکان' زیرِ طبع ہیں۔ مضامین کا ایک اور مجموعہ 'ادراک اور وجدان' اشاعت کا منتظر ہے۔ دس مسودات میرے پاس محفوظ ہیں جن پر کچھ نہ کچھ کام ہوا ہے لیکن قابلِ ذکر نہیں۔

س ج: سنا ہے 'دانش بک ڈپو، ٹانڈہ' کے لیے بھی آپ نے تخلیقی کارنامے انجام دیے ہیں۔ اس تعلق سے کچھ نہ کچھ وضاحت فرمائیں۔

ا م ن: میری پہلی نثری کتاب 'اسلام کا سماجی نظریہ' شائع ہوئی اور سیّد زبیر احمد سبحانی نے مطالعہ کیا تو مجھے اپنے پریس 'نشاط آفسیٹ پریس' میں طلب کیا اور اپنے اشاعتی ادارہ 'دانش بک ڈپو' کے لیے کتابیں لکھنے کی فرمائش کی۔ میں نے حامی بھرلی۔ اس کے بعد وہ مجھ سے مسلسل کتابیں لکھواتے رہے۔ دینیات، ادبیات اور تاریخ میرے خاص موضوعات تھے۔ وہ انھیں موضوعات پر اپنے مکتبے کے لیے کتابیں لکھواتے۔ چونکہ مطالعے کی مجھے بڑی عادت تھی۔ اس زمانے میں ذوق وشوق کے علاوہ مطالعۂ کتب میری ضرورت بن گیا۔ کیونکہ لکھنے کے لیے پڑھنا ضروری تھا۔ مجھے لکھنے کا جنون سا تھا اور کچھ نہ کچھ مالی یافت بھی ہوجاتی اس لیے جب بھی وہ مجھے کوئی عنوان دیتے میں ایک ماہ کے اندر انھیں کتاب لکھ کر دے دیتا۔ اس زمانے میں میرے لکھنے کی رفتار بہت زیادہ تھی۔ اہلِ خانہ کی کفالت کے لیے دن بھر پاورلوم پر کام کرتا۔ رات پڑھنے لکھنے کے لیے وقف تھی۔ بہت کم سونا ہو پاتا۔ مطالعے کی ایسی عادت تھی کہ کھانا کھانے کے لیے بیٹھتا تو بھی کوئی نہ کوئی کتاب میرے سامنے کھلی ہوتی۔ کھانے کے ساتھ ہی ساتھ میں پڑھتا بھی رہتا۔ مجھے ایک لمحہ کی بھی فرصت نہ تھی۔ زندگی انتہائی مصروف تھی۔ نشاط پریس میں آنا جانا لگا رہتا۔ سیّد زبیر احمد سبحانی کے چھوٹے بھائی مشہور ادیب، شاعر اور ناقد ڈاکٹر سیّد عبدالباری (شبنم سبحانی) جب بھی

تصانیف

نور ونکہت (نعت) 1974، سنہری جالیاں (نعت) 198، سبز گنبد (نعت) 1988، دیارِ مدینہ (نعت) 1975، تسبیح کے دانے (نعت) 2006، مخدوم سمنانی (منقبت) 1982، کرب وطرب (نظم وغزل) 1981، قطرہ قطرہ خونِ دل (رباعیات) 2001، فجر کا الاؤ (نظم وغزل) 2006، اسلام کا سماجی نظریہ 1979، ملفوظاتِ جہانگیری 1980، عبدالرحیم خان خاناں 1981، عرب سے یورپ تک 1987، اورنگ زیب عالمگیر 1991، فنِ خطوط نگاری 1992، سیف اللہ خالد بن ولید 1995، رسول اللہ کی تلوار 1995، رسول اللہ کی تلوار 1995، کمسن مجاہد 1995، صلاح الدین ایوبی 1996، خواجہ حسن بصری 1992، ہاتھیوں کی لڑائی 1991، سونے کا باغ 1988، ایک تھی رانی 1990، مولا بخش ہاتھی 1990 (ادبِ اطفال)

انتخابِ کلام

فراق گورکھپوری، مجروح سلطان پوری، شکیب جلالی، بشیر بدر، پروین شاکر، نازش پرتاپ گڑھی، شہریار، مجاز لکھنوی، شاداب احسانی (پاکستان)، ناصر کاظمی (پاکستان)، انس مسرور انصاری، علامہ حماکت بیگ، ہندوستان میں اسلام کے تہذیبی اثرات 2010، دوپہر کی دھوپ (نظمیں) 2015، شام کی دہلیز سے (غزلیں) 2015، دھوپ اور سائبان (ادبی مضامین) زیرِ طبع، عکس اور امکان (ادبی مضامین) زیرِ طبع، انسانی دماغ کمپیوٹر اور تعلیم (ادبِ اطفال) زیرِ طبع، سامانِ آخرت (نعت دو جلدیں) زیرِ طبع، سونے کا باغ (ادبِ اطفال) اضافہ شدہ، ننھے بچے من کے سچے (منظوم)، ادراک اور وجدان (ادبی مضامین)، عطر کے داغ (قطعات ورباعیات)، کربلا کے مسافر (منظوم)

گھر آتے، ان سے پریس میں ملاقات ہوتی، میری بڑی حوصلہ افزائی فرماتے۔

70 اور 80 کی دہائی میں اترپردیش اردو اکادمی اور فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی کے مالی تعاون سے میری نظموں اور غزلوں کے کئی مجموعے شائع ہوئے۔ کتابیں تو برابر چھپتی رہیں لیکن مالی پریشانیوں کی وجہ سے ان کی ترسیل بہت کم ہوسکی۔ ڈاک خرچ کی استطاعت نہیں رکھتا تھا اس لیے تبصرے کے لیے کتابیں نہیں بھیج پاتا تھا۔ دوستوں کو بھی کتابیں بھیجنے سے قاصر تھا۔

مشہور افسانہ نگار اور شاعر شرافت حسین سے میری بڑی گہری دوستی تھی۔ ہم روزانہ ملتے اور گھنٹوں باتیں ہوتیں۔ ان کے زیرِ اثر میں کہانیاں بھی لکھنے لگا جو رسائل

وجرائد میں شائع ہوتی رہیں مگر مجھے محسوس ہوا کہ افسانہ نگاری میرا میدان نہیں، اس لیے افسانے لکھنے بند کر دیے۔ میرا طبعی رجحان مضمون نگاری کی طرف تھا سو میں نے اسی کو مستقل طور پر اختیار کیا۔ میرے چھوٹے بھائی ڈاکٹر چودھری محمد ارشد کہانیاں بھی لکھتے تھے اور مضامین بھی۔ رام لعل سے ان کے بہت گہرے تعلقات تھے اور انھیں کی سفارش پر پروفیسر حکم چند نیّر نے ارشد کے تحقیقی مقالے 'گلزار نسیم کا لسانی مطالعہ' کی نگرانی فرمائی اور پانچ سالہ نصاب کو تین سال میں مکمل کرایا۔ کیونکہ وہ ریٹائر منٹ کے قریب تھے اور اپنی سبکدوشی سے قبل وہ محمد ارشد کو پی، ایچ، ڈی کی ڈگری دلا دینا چاہتے تھے۔ اس لیے استاد اور شاگرد نے بڑی محنت کی۔ حکم چند نیّر کا خواب پورا ہو گیا اور ڈاکٹر شمیم حنفی کی رپورٹ پر ارشد کو ماسٹر آف فلاسفی کی سند مل گئی مگر مسلسل تین سالہ محنت ان پر بری طرح اثر انداز ہوئی اور ان کا ذہنی توازن بگڑ گیا۔ لکھنے پڑھنے سے معذور ہو گئے۔ غریبی ہاتھ دھو کر پیچھے پڑی تھی اور ملازمت مل نہ سکی۔ ان ناخوشگوار حالات نے ایک بہت اچھے ادیب اور ناقد کو قتل کر دیا۔ یہ وہی چودھری محمد ارشد ہیں کہ جب ماہنامہ شاعر بمبئی نے خلیل الرحمٰن اعظمی نمبر نکالا تو ان کے مضمون نے بہت شہرت پائی۔ خلیل الرحمٰن اعظمی پر ان کا مضمون سب سے زیادہ پسند کیا گیا۔ قابل ذکر بات یہ بھی ہے کہ میری ہی طرح ارشد بھی ان پڑھ اور ناخواندہ تھے۔ جب میں نے لکھنا پڑھنا سیکھا تو انھیں بھی پڑھنا لکھنا سکھایا۔ بعد میں ایم۔ اے تک ہم دونوں تعلیمی سفر میں ساتھ رہے۔ شدید خواہش کے باوجود میں پی، ایچ، ڈی۔ نہ کر سکا۔ اقتصادی حالات بے حد ابتر تھے۔

س ج: قومی اردو تحریک کے بانی کی حیثیت سے آپ کے مقاصد کیا ہیں۔؟

ا م ن: اردو زبان کی ترویج واشاعت اور اس کے آئینی حقوق کی بحالی اردو تحریک کا سب سے اہم مشن ہے۔ اردو بیداری مہم، اسکول، کالج اور اعلا تعلیمی اداروں کا قیام جہاں اردو زبان کو لازمی مضمون کی حیثیت حاصل ہو۔ اردو نہ پڑھنے والے طلبا کا داخلہ ممنوع ہو۔ اس تعلق سے تحریک کی جدوجہد جاری ہے۔ قومی اردو تحریک حکومت سے منظور شدہ ایک قومی ادارہ ہے۔ اس کا آغاز قصبہ سے منسلک ویرانے میں برگد کے ایک گھنے درخت کے نیچے چٹائی بچھا کر ہوا۔ اردو زبان کی زبوں حالی اور قومی تعلیمی پسماندگی سے متاثر وقت کی اہم ترین ضرورت کے تحت اس کا قیام عمل میں آیا۔ میں نے چٹائی پر بیٹھ کر تعلیمی سلسلے کو شروع کیا۔ بے حد نامساعد حالات میں بھی میں نے ہمت سے کام لیا۔ پھر جب طلبا وطالبات کی آمد شروع ہوئی تو اساتذہ کی تقرریاں کیں۔ غریب اور نادار بچوں کی مفت تعلیم، ان کے لیے کتابوں اور تعلیمی ضروریات کے سامان کی مفت فراہمی، شبینہ اسکول، اردو، عربی مکاتب کا انتظام کیا اور ان سارے کاموں میں محمد افضل (پان بیڑی فروش) میرے ہم قدم رہے۔ محمد افضل جو ناخواندہ تھے، اپنے قائم کردہ مکتب میں قرآن پڑھا۔

اردوزبان کی ترویج واشاعت اوراس کے آئینی حقوق کی بحالی اردوتحریک کاسب سے اہم مشن ہے- اردو بیداری مہم'اسکول'کالج اور اعلا تعلیمی اداروں کا قیام جہاں اردوزبان کولازمی مضمون کی حیثیت حاصل ہو- اردو نہ پڑھنے والے طلبا کاداخلہ ممنوع ہو-اس تعلق سے تحریک کی جدوجہدجاری ہے-قومی اردو تحریک حکومت سے منظور شدہ ایک قومی ادارہ ہے-

تعلیم وتعلم کے تعلق سے میری عملی جدوجہد اور خلوص کو دیکھتے ہوئے مولانا طفیل احمد صاحب نے اپنی ایک دومنزلہ خالی عمارت میرے حوالے کر دی جو شاہراہ عام پر سکراول بازار میں واقع ہے۔ میں نے اس بازار کو 'اردو بازار' کا نام دیا جس کی خاصی پزیرائی ہوئی۔ اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے امداد وانعام خیال کیا اور اس کا شکر بجا لایا۔ اب یہ مذکورہ ادارہ اسی دو منزلہ عمارت میں قائم علم وادب کا ایک سرچشمہ ہے۔ اپنے دوست اور ادبی ہم سفر ڈاکٹر امین احسن کے تعاون سے ایک لائبریری قائم کی جس میں اردو، ہندی اور انگریزی کتابوں کی خاصی تعداد ہے۔ اسی عمارت میں 'اردو، عربی تعلیمی مرکز، آئیڈیل مدرسہ عربیہ، اور جدید عصری علوم کی تحصیل کے لیے 'آئیڈیل کلاسز' قائم ہے۔ میں نے ویرانے میں ایک بیج بویا تھا جو آج ایک باغ کی شکل میں شاد وآباد ہے۔ اس کے پھولوں اور پھلوں کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا ہوں۔ ہمت اور حوصلوں میں اضافہ ہوتا ہے۔

س ج: کیا آپ کو کبھی کوئی ادبی، سرکاری وغیر سرکاری اعزاز بھی ملا یا نہیں۔؟

ا م ن: میں نے کبھی اعزاز وانعام کی خواہش نہیں کی۔ دل زندہ رکھتا ہوں۔ ضمیر فروشی کو گناہ عظیم سمجھتا ہوں۔ اسی لیے غریبی اور تنگ دستی نے کبھی میرا پیچھا نہیں چھوڑا۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ادب کی دنیا میں بھی غریب کی کیا اوقات ہوتی ہے۔ جوڑ توڑ کرنا آتا نہیں۔ کافی عرصہ پہلے ہندی زبان کے معروف افسانہ نگار، ناول نویس، ڈرامہ نگار اور کالم نویس دھرو جائسوال نے ہولی کے موقع پر رام لیلا گراؤنڈ میں بلا کر مجھے 'ساہتیہ کار' کے اعزاز سے سمانت کیا تھا۔ پھر 2018 میں پندرہ روزہ 'امبیڈکر نگر مہوتسو' میں ہندی صحافیوں نے مجھے بلا کر 'امبیڈکر نگر گورو' کا ایوارڈ دیا۔ اس میں کوئی حیرت نہیں کہ میں پچاس سالوں سے اردو میں لکھ رہا ہوں لیکن کسی اردو تنظیم کو کبھی میری یاد نہیں آئی۔ البتہ 2020 میں ڈاکٹر سلیم احمد صاحب نے اپنے سہ ماہی رسالہ 'ادبی نشیمن' لکھنؤ کے زیر اہتمام ایک تقریب میں 'پروفیسر محمود الٰہی ادبی ایوارڈ' سے مجھے سرفراز کیا۔ میں ان کا اور ان کی سوسائٹی کا شکر گزار ہوں۔

س ج: آج کل آپ کی علمی وادبی مصروفیات کیا ہیں۔؟

ا م ن: آج کل مرزا غالب کے ہم عصر اور لکھنوی دبستان ادب سے متاثر بانکے نواب 'نسیم میسوری' پر تحقیقی کام میں مصروف ہوں۔ ان کا ایک دیوان عرصہ سے میرے پاس محفوظ ہے۔ نسیم، سلطان ٹیپو کے عزیزوں میں تھے۔ کسی تذکرے میں ان کا ذکر نہیں ملتا۔ ہزار جستجو کے باوجود نسیم میسوری کے بارے میں معلومات بہت محدود ہیں۔ ان کا دیوان بھی بہت خستہ حالت میں ہے۔ اس کے علاوہ اپنی طویل نظموں کو جمع کر رہا ہوں جس پر ڈاکٹر رضوان انصاری کام کرنا چاہتے ہیں۔ میری ایک طویل نظم 'آدم اور ابلیس۔ ایک مکالمہ' ہے جسے میں نے رباعی کی صنف میں نظم کیا ہے اور غالباً اردو میں یہ پہلی نظم ہے جو رباعی کے فارم میں اتنی طویل نظم ہے۔

س ج: سنا ہے آپ کو صحافت سے بھی دلچسپی ہے اور آپ نے ٹانڈہ سے کوئی اخبار بھی نکالا تھا۔؟

ا م ن: جی ہاں 1975 میں ہفت روزہ 'مبصر' جاری کیا جو دو سال تک نکلتا رہا۔ ان دو سالوں میں 'مبصر' میں اپنے کئی یادگار مضامین شائع کیے لیکن اپنی عدیم الفرصتی اور حالات کی نامساعدت کی وجہ سے بند کرنا پڑا۔ وہ دستی کتابت اور لیتھو پریس کا زمانہ تھا۔ طباعت واشاعت کی وہ سہولتیں نہ تھی جو آج ہیں۔

س ج: آخری سوال یہ ہے کہ آپ نے اپنی تمام مطبوعہ کتابوں میں کسی سے بھی کچھ نہیں لکھوایا۔؟

ا م ن: میں اس حقیقت کا شدت سے قائل ہوں کہ کتاب خود اپنا تعارف ہوتی ہے۔ اس لیے میں نے بھی کسی سے کچھ نہیں لکھوایا۔ بعد میں ان کتابوں پر کئی ادیبوں اور شاعروں نے مضامین لکھے۔ رسائل وجرائد میں حوصلہ افزا تبصرے شائع ہوئے۔

■

Azadar Husain Sajid Jalalpuri
Mohalla - Jafarabad
Post : Jalalpur
District Ambedkar Nagar- 224149 (UP)
Mobile: 7571867185
Email: azadarhusainsajid@gmail.com

غالب کے غیر متداول کلام سے تین اشعار اور ان کی تشریح

ج،ع،واحد

چند غلط فہمیوں کی بنا پر غالب کا غیر متداول کلام بدقسمتی سے عام طور پر غیر معروف ہے۔ غالب کی شہرت اور مقبولیت کو دیکھتے ہوئے، تعجب ہے اس کے بارے میں لکھا بھی بہت کم گیا ہے۔[1] حتیٰ کہ خود غیر متداول کلام عام قاری کی دسترس سے باہر ہے۔ آج اس کلام کا کوئی ایسا مجموعہ نہیں جو عام قاری کو آسانی سے مل سکے۔[2] اس میں شک نہیں کہ غیر متداول کلام کے بیشتر اشعار دقیق اور عسیر المعنی ہیں،[3] لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ ایک عظیم شاعر کے کلام کا ایک معتد بہ حصہ[4] محض کچھ اشعار کے 'مشکل' ہونے کی وجہ سے پورے کا پورا بنا کسی تنقیدی و تجزیاتی قرأت کے سرسری طور پر نظر انداز کر دیا جائے۔ اصل میں دشواری یہ ہے کہ غیر متداول کلام میں اکثر الفاظ اپنے غیر مانوس معنی، نئی تشبیہات اور کثیر الجہت علامات[5] اور ابہام[6] و تضاد کا استعمال وسیع طور پر ہوا ہے، جس سے بعض اوقات فاضل شارحین بھی دھوکے میں پڑ جاتے ہیں اور اچھے خاصے شعر کو 'لایعنی'، 'مہمل' کہہ دیتے ہیں۔ اس بات کی وضاحت میں غالب کے غیر متداول کلام سے چند اشعار پیش ہیں۔

وسعتِ رحمتِ حق دیکھ کہ بخشا جاوے
مجھ سا کافر کہ جو ممنونِ معاصی نہ ہوا

یہ بہت دلچسپ شعر ہے۔ اس کے معنی میں، خاص کر مصرع ثانی میں بظاہر ایک تضاد ہے۔ شارحین[7,8,9,10,11,12]، غیر متداول کلام غالب اور اس کے انگریزی مترجم[8] نے اس کے معنی الگ الگ دیے ہیں۔ آیئے، پہلے وہ سب بیان دیکھ لیں:

تفسیر غالب... گیان چند جین کہتے ہیں "دوسرے مصرع میں الٹی بات کہی گئی ہے۔ کسی طرح اسے سیدھا کرنا ہے۔ 'ممنونِ معاصی' کے معنی ظاہراً معاصی سے استفاضہ کرنے کے ہوتے ہیں، یعنی ارتکاب گناہ کرنا، لیکن یہاں اس مفہوم کی گنجائش نہیں۔ گناہ مجھ پر یہ احسان کر سکتے تھے کہ مجھ کو اپنا شکار نہ بناتے لیکن میں نے ان کا یہ احسان لینا گوارا نہ کیا اور خود کو ان کا تختۂ مشق نہ ہونے دیا۔ خدا کی رحمت اتنی وسیع ہے اس نے مجھ جیسے کافر کو بھی بخش دیا۔"[13]

مکمل شرح دیوانِ غالب... آسی الدنی اس کی شرح یوں کرتے ہیں "ذرا اس کریم کی رحمت کی وسعت تو دیکھو کہ اس نے مجھ جیسے کافر کو بخش دیا کہ جو ازلی کافر تھا۔ صرف گناہوں کے احسان سے کافر نہ ہوا تھا یعنی ایسا کافر نہ تھا کہ گناہوں نے اسے کافر کیا ہو، بلکہ ازلی اور فطری کافر تھا۔"[14]

باقیاتِ غالب... وجاہت سندیلوی، اس کے تین معنی لکھتے ہیں [جس کے معنی ہیں کہ وہ انھیں ان میں سے کسی کے بارے میں تیقین !] وہ فرماتے ہیں: (1) ''خدا کی رحمت کی تو دیکھیے وسعت کہ اس نے میرے جیسے کافر کو بخش دیا کہ جس نے کوئی گناہ ہی نہیں کیا تھا، کیونکہ اگر مجھے خدا کی رحمت کا اعتقاد ہوتا، تو میں گناہ بھی کرتا، یا (2) یہ کہ میں ایسا ازلی کافر تھا، جو اپنے کفر گناہوں کا منت کش نہیں تھا، میرے ایسے کافر کا بخش دیا جانا خدا کی رحمت کی وسعت ظاہر کرتا ہے۔'' (3) اس شعر کے ایک طنزیہ معنی بھی نکلتے ہیں: رحمت حق نے اگر میرے ایسے کافر کو بخش دیا، جس نے کوئی گناہ ہی نہیں کیا تھا، تو اس میں کیا کمال ظاہر ہوا؟ میں گناہ کرتا اور بخش دیا جاتا، تو تب واقعی ایک بات تھی۔''[15]

عنقائے معانی... سرخوش دہلوی ملاحظہ ہو ''شعرا کہا کرتے ہیں کہ خدا اگر چاہے، تو اپنے گنہگاروں کو اپنی رحمت سے بخش دیا کرتا ہے کیونکہ وہ جس قدر کسی کو عاجز اور گناہوں میں پھنسا دیکھتا ہے، اتنا ہی زیادہ رحم کیا کرتا ہے۔ لہٰذا کہتا ہے کہ خدا کی رحمت کی یہ وسعت دیکھ، اس نے مجھ جیسے کافر کو بھی بخش دیا کہ جس نے معاصی، یعنی گناہوں کا بھی احسان نہیں مانا، جو بخشش کا باعث ہوئے۔ گویا یہ خیال تک نہیں بھی اپنے دل میں لایا کہ میں عاصی و گنہگار ہوں۔ حالانکہ عوام اکثر اقرارِ معاصی کرکے برسوں اپنی مغفرت کے لیے دعائیں مانگا کرتے ہیں پھر بھی ناکام رہتے ہیں۔''[16]

ضامن کنتوری [17] بہت سخت گیر ناقد ہیں۔ ان کی شرح میں کوئی شعر مشکل سے ان کے اعتراض سے بچتا ہے۔ غیر متداول کلام کے اکثر اشعار کو وہ بے معنی، مہمل یا مغلق کہتے ہیں، لیکن اچھے (ان کی نظر میں!) اشعار کی دل کھول کر تعریف کرنے میں بھی بخل نہیں کرتے۔ ان کی اس شعر کی شرح دیکھیے ''اس شعر میں 'ممنونِ معاصی'، 'پشیمانِ معاصی' ہے۔ ورنہ شعر کے کوئی معنی نہیں ہوں گے۔ 'ممنونِ معاصی' یعنی احسان مندِ معاصی، مرتکبِ معاصی کے معنی دے گا پھر جب ارتکاب ہی نہیں کیا، تو معصوم ٹھہرے اور جب معصوم ٹھہرے تو بخشے جانے پر تعجب ہی کون سا؟ اور کافر و معصوم کا اجتماع بے معنی ہوگا۔'' غور فرمائیں یہاں انھوں نے ایک تضاد تو دیکھا ہے، لیکن اس کو بامعنی طور پر سلجھانے میں قاصر رہے۔

اب راقم کی شرح پیش ہے:

میں اپنے گناہوں کو گناہ سمجھتا ہی نہیں تھا، کیونکہ میرے علم اور سمجھ میں یہ گناہ تھے ہی نہیں۔ کسی نے مجھے اس بارے میں واقفیت دی ہی نہیں تھی۔''[18] اس لیے گناہ کا مجھ پر احسان ہی نہیں ہوا... ممنونِ معاصی... یعنی گناہگار نہیں ہوا لیکن میں نے چونکہ اللہ تعالیٰ... یا سماج... کے قوانین کی خلاف ورزی تو بہرحال کی اور دنیاوی عدالتوں میں قانون سے ناواقفیت ایک وافر عذر نہیں مانا جاتا''[19] اس لیے میں سزا کا مستحق تھا لیکن اللہ تعالیٰ کی وسعتِ رحمتِ حق دیکھیے اس نے مجھے جو گناہگار تھا بھی اور نہیں بھی تھا، بخش دیا۔ اس طرح شعر میں ایک تضاد... ابہام [20] ... پیدا کیا گیا ہے، شعر سمجھنے کے لیے جس کا سلجھانا قاری کے لیے ضروری ہوجاتا ہے۔ یہ تضاد کی تکنیک غالب کے اور اشعار میں بھی ملتی ہے۔ ایک سامنے کی مثال ع 'میں نہ اچھا ہوا، برا نہ ہوا'

شیخ جی، کعبے کا جانا معلوم!
آپ مسجد میں گدھا باندھتے ہیں

اس شعر میں فاضل شارحین سے دلچسپ غلطی ہوئی ہے۔ شعر میں لفظ 'گدھا' سے مراد 'شیخ جی' لیے ہیں، جب کہ یہ لفظ... گدھا... شاعر نے خود اپنے لیے کہا ہے۔ یہاں مخاطب... 'آپ'... 'شیخ جی' ہیں۔ اس تسامح کی وجہ سے شارحین قطعی غیر ضروری مشکلات میں پڑ گئے اور اس کی طرح، طرح کی تاویلات کرنی پڑیں۔ نتیجہ میں بے چارہ شعر 'مہمل' اور 'لطیفہ' بن گیا۔

تفسیرِ غالب [21] ... گیان چند جین نے اس کی شرح ان الفاظ میں کی ہے ''آپ کا کعبہ میں جانا ہمیں معلوم ہے۔ یہ ایسی بات ہوگی جیسے مسجد میں گدھا باندھ دیا جائے۔ شیخ جی کو گدھا کہا ہے'' [یہ واضح نہیں کہ شیخ جی کا کعبہ جانا... جو ایک عام اور متوقع بات ہے... اس کو ناممکن (معلوم 'معلوم!') کس لیے قرار دیا ہے۔ دوسرے، شیخ جی کو گدھا کس بنا پر کہا ہے جب کہ شعر میں اس کا کوئی قرینہ نہیں۔ جہاں تک راقم کا علم ہے 'شیخ'، 'واعظ، ناصح، محتسب وغیرہ کو غالب نے کبھی 'گدھا'... جو ایک نہایت تحقیر آمیز خطاب ہے... نہیں کہا بلکہ پوری اردو شاعری میں کسی شاعر نے ایسا نہیں کیا]۔

عنقائے معانی [22] ... سرخوش دہلوی... اس شعر کی تفسیر: ''اجی شیخ صاحب! تم تو مسجد میں اپنا گدھا باندھ کے مسجد کی بے حرمتی کرتے ہو تو پھر کعبہ کیا جاؤ گے۔ تم میں جذبۂ ایمان کہاں؟'' [یہاں سرے سے منطق کا فقدان ہے اور اس کی تلاش بے سود]

شرح دیوانِ غالب [23] ... ضامن کنتوری... نے اس شعر کو ''بالکل مہمل اور قابلِ اخراج'' بتایا ہے۔ وہ کہتے ہیں ''مسجد میں گدھا باندھنا آخر کعبہ جانے سے کس طرح

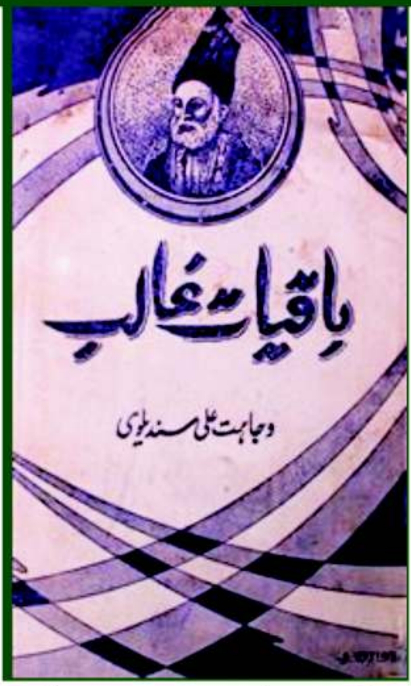

روک سکتا ہے؟'' [ملحوظِ خاطر رہے: شعر میں نہ تو کہیں مسجد میں گدھا باندھنے کو کہا گیا ہے، اور نہ اس عمل کی وجہ سے کعبہ جانے کی رکاوٹ کا ذکر ہے۔ شعر مہمل نہیں، سمجھنے کا فتور ہے]

مکمل شرح دیوانِ غالب [24] ... آسی الدنی... نے اس شعر کی تین الگ الگ شروح دی ہیں جو حسبِ ذیل ہیں:

(1) ''جناب شیخ صاحب، خیر آپ کی زیارتِ کعبہ کا حال تو ہم کو معلوم ہے۔ آپ کہاں، کعبہ کہاں؟ مگر آپ کی تشریف آوری سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ اس قدومِ میمنت لزوم کی وجہ سے مسجد کو ایک اصطبل بنا لیا ہے، جس میں آپ خود گدھے معلوم ہوتے ہیں، یا یہ

(2) شیخ صاحب، آپ نے مجھے کعبہ جانے کی نسبت ارشاد فرمایا ہے۔ اے سبحان اللہ! کیا خوب، کجا میں، کجا کعبہ؟ یہ تو ایسی بے جوڑ بات ہے کہ گویا آپ نے مسجد میں گدھا باندھ دیا ہے، یا یہ:

(3) خود شیخ صاحب کہا گیا ہے کہ آپ کیا کعبہ جائیں گے۔ آپ کہاں، کعبہ کہاں؟

[مندرجہ بالا شرح کے بارے میں عرض ہے: ایک شرح کے تین مختلف معنی، گو شارح کا اپنی شرح پر غیر اعتمادی کا عکاس ہے، لیکن دوسری شرح (''شیخ صاحب، آپ نے مجھے کعبہ جانے کی نسبت ارشاد فرمایا ہے۔ اے سبحان اللہ! کیا خوب، کجا میں، کجا کعبہ؟ یہ تو ایسی بے جوڑ بات ہے کہ گویا آپ نے مسجد میں گدھا باندھ دیا ہے'')، راقم کے خیال میں شعر کے معنی کے قریب ترین ہے، حالانکہ یہ وضاحت طلب اور تشنۂ معنی ہے]

راقم کے خیال میں شعر کے معنی بالکل سیدھے سادے ہیں اور ان میں پیچیدگی پیدا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

شعر اردو میں مروج فارسی کہاوت پر مبنی ہے: ''خرِ عیسیٰ اگر بہ کعبہ رود، چوں بیاید، ہنوز خر باشد'' [حضرت عیسیٰ کا گدھا اگر مکہ جائے، تو واپس آنے پر گدھا ہی رہے گا] یعنی جبلی فطرت نہیں بدلی جاسکتی، خواہ پیغمبروں کی صحبت اور مقدس مقام جانا نصیب ہو۔ [اردو میں قریبی کہاوت ہے: ''گدھا دھوئے سے بیل نہیں بنتا۔'' یعنی اوپری، ظاہرداری سے انسان کی اصلی فطرت میں فرق نہیں آتا] اب شعر کی شرح دیکھیں: ''شیخ جی، آپ کمال کرتے ہیں! آپ مجھے کعبے جانے کی تلقین کرتے ہیں۔ اول، تو مجھ جیسے شرابی کا کعبہ جانا بھلا کس طرح ممکن ہے (معلوم!)۔ پھر بالفرضِ محال، میں اگر کعبہ ہو بھی آؤں، تو مجھ جیسے پختہ کار شرابی گنہگار میں محض کعبہ شریف کی زیارت سے بھلا کیا تبدیلی آئے گی؟ یہ تو بالکل ایسا ہوگا کہ آپ سوچیں کہ مسجد میں گدھا باندھنے سے وہ نمازی اور پرہیزگار ہوجائے گا! شاعر نے اپنے 'آپ'... یعنی، ایک نہ سدھر جانے والے شرابی... کو 'گدھا' سے تعبیر کیا ہے۔ کسی کو 'گدھا' نہیں کہا ہے۔ محض ایک تشبیہ دی ہے، اوپر مقولہ فارسی... اور اردو... ضرب المثل کے مطابق ہے۔ خیال رہے۔ ویسے گدھے کی صفات میں 'خرد ماغی' (یعنی ہٹ دھرمی) مشہور ہے۔

چاہے گر جنت، جز آدم وارثِ آدم نہیں
شوخیِ ایمانِ زاہد، سستیِ تدبیر ہے

اس شعر میں تفسیرِ غالب... گیان چند جین اور باقیاتِ غالب... وجاہت سندیلوی... سے زبردست تسامح ہوا ہے۔ تفسیرِ غالب نے 25 اس کی شرح یوں کی ہے: ''زاہد اگر جنت چاہتا ہے، تو اس کو جاننا کہ آدم کا وارث آدم ہی ہوسکتا ہے۔ اس لیے ہمیں جنت میں داخلہ تو ملنا ہی ہے۔ زاہد اپنے ایمان کی جو تیزی دکھا رہا ہے، یہ تدبیر کی سستی ہے۔ اسے خاموش رہنا چاہیے۔ جنت تو ہر اولادِ آدم کا حق ہے ہی۔''

باقیاتِ غالب 26 کہتے ہیں ''جنت حضرت آدم کے لیے تخلیق کی گئی تھی۔ لہٰذا اولادِ آدم کے علاوہ اس کا کوئی دوسرا وارث ہو ہی نہیں سکتا۔ زاہد کا خیال کہ وہ اپنی عبادت گزاری سے اسے حاصل کرے گا، محض ایک ناسمجھی ہے۔ جب ایک چیز کے ہم قدرتی وارث ہیں، تو پھر اس کے لیے اتنی جدوجہد کرنے کی کیا ضرورت ہے؟''

دراصل یہی مضمون، مرزا نے فارسی میں نظم کیا ہے:

خواجہ فردوس بہ میراث تمنا دارد
وائے! گر در وشِ نسل بہ آدم نرسد 27

خواجہ حالی 28 نے اس کی تفسیر یوں کی ہے: ''خواجہ کا لفظ فارسی اکثر میں ایسے مقام پر بولتے ہیں، جیسے طنز کے موقعے پر اردو میں تیسرے شخص کے لیے 'آپ' یا 'حضرت' بولتے ہیں۔ کہتا ہے کہ آپ آدم کی میراث میں فردوس کے طلبگار رہیں۔ بڑا مزہ ہوا گر آپ کا سلسلہ نسب آدم تک نہ پہنچے... ان کا یہ مطلب ہے آپ کے اخلاق و عادات انسانیت سے اس قدر بعید ہیں کہ ممکن ہے آدم کی نسل سے نہ ہوں۔''

ضامن کنتوری 29 کی شرح دیکھیے ''یعنی جنت کی نسبت یہ خیال کرنا کہ ظاہر ایمان کے طمطراق سے ملے گی، تدبیر کی سستی ہے۔ جنت ملنے کو مسلمان، یہودی، عیسائی ہونا لازم نہیں۔ وہ تو آدم کی میراث ہے۔ ہر حالت میں آدم کی اولاد کو ملے گی مگر مرزا کو یہ خیال نہیں رہا کہ ناخلف بیٹے کو محض بیٹا ہونے سے ارثِ پدر نہیں مل سکتی۔ وہاں تو اسی لیے خدائی فرمان 'لیس من اہلک' کا صادر ہو چکا ہے۔'' اس شرح کے بارے میں دو باتیں قابلِ غور ہیں: (1) دیگر شروح کی طرح یہاں بنیادی غلط فہمی یہ ہے شعر میں یہ کہا ہے کہ ہر انسان غیر مشروط طور پر جنت کا حقدار ہے، چنانچہ اس کے لیے کسی کوشش کی ضرورت نہیں۔ غالب صرف حق المعبود کے ساتھ حق العباد... یعنی انسان دوستی... کی اہمیت کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں، جنت کے لیے فرشتہ بننے کی کوشش کے بجائے اچھا انسان بننے کی کوشش کرنا چاہیے، خاص کر اس کے مدنظر کہ ع 'آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا' اسی مضمون کو میر نے اس طرح نظم کیا ہے: 'برسوں تئیں جب ہم نے تردد کیے ہیں، تب: پہنچایا ہے آدم تئیں واعظ کے نسب کو'

حواشی

1 راقم کے علم میں محض چند مضامین کے علاوہ کوئی مستقل کتاب یا مقالہ اس موضوع پر نہیں گزرا۔ میں یہاں دانستہ پروفیسر خورشید الاسلام کی کتاب 'غالب: تقلید اور اجتہاد' (علی گڑھ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، 1979) کا ذکر نہیں کر رہا ہوں۔ کتاب میں غیر متداول کے بارے میں کچھ نہیں ہے۔

2 راقم نے اس کا ایک مجموعہ مرتب کرنے کی کوشش کی ہے (''مجموعۂ غیر متداول کلامِ غالب: غزلیات، مخمس، رباعیات'' دہلی، غالب اکادمی، 2016) تاہم یہ اس حد تک ناقص ہے کہ اس میں غالب کے قصائد شامل نہیں کیے گئے ہیں۔ اصل میں ضرورت اس بات کی ہے کہ غالب کی اردو نظم کی کلیات کا ایک جامع و مستند ایڈیشن مع گوناگوں حواشی (Variorum) جدید اصولوں پر مرتب کیا جائے۔ ظاہر ہے یہ ایک ادارہ ہی کرسکتا ہے۔

3 اس پر قدرے تفصیل سے بحث کے لیے دیکھیے: راقم ایضاً (مقدمہ) نیز وجاہت علی سندیلوی ''غلطی ہائے مضامین مت پوچھ''، فضل الرحمن اسلامیہ کالج میگزین، غالب نمبر 70-1969 بریلی۔

4 متداول کلام میں غزلیات کی کل تعداد 234 اور غزلیہ اشعار کی تعداد 1462 ہے۔ اس کے مقابلے میں غیر متداول کلام میں غزلیات کی تعداد 391 اور اشعار کی تعداد 1813 ہے۔

5 راقم گنجینۂ معنی، کتابی دنیا، دہلی 2019، 'مقدمہ' (ص 11)

6 شتیق اللہ: ادبی اصطلاحات یک وضاحتی فرہنگ، اردو مجلس، دہلی 1995، 'ابہام' (ص 149) نیز "Where something appears to contain a contradiction and the reader has to find interpretation" (Empson, Wm: Seven Types of Ambiguity) (''عبارت میں بظاہر ایک ایسا تضاد جسے قاری کو دور کرنا پڑے'')

7 گیان چند جین: تفسیرِ غالب، سری نگر، جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر، اینڈ لینگویجز، 1986

8 عبدالباری آسی الدنی: مکمل شرح دیوانِ غالب، لاہور، مکتبہ شعر و ادب، ب۔ت۔

9 وجاہت علی سندیلوی: باقیاتِ غالب، لکھنؤ، نسیم بک ڈپو، 1991

10 شیر علی خان سرخوش: عقائے معانی: مکمل شرح دیوانِ غالب، لاہور مصنف ب۔ت۔ (؟)

11 ضامن کنتوری: شرح دیوانِ غالب (مرتبہ اشرف رفیع)، دہلی، ایجوکیشنل پبلی کیشن، ہاؤس، 2012

12 M. Mujeeb: Ghalib, Delhi, Sahitya Akademi, 1969

13 گیان چند جین، محولہ بالا، ص 72

14 آسی: محولہ بالا، ص 552

15 وجاہت سندیلوی، محولہ بالا، ص 132

16 سرخوش دہلوی، محولہ بالا، ص 552

17 ضامن کنتوری، محولہ بالا، ص 38

18 اسلام میں بھی معذور، یعنی ناواقف، جس کو دعوت نہیں دی گئی (یعنی جس نے اسلام کے بارے میں کبھی سنا ہی نہیں) کو کافر... گنہگار... نہیں کہہ سکتے۔ ملاحظہ ہو: سورۂ بقرہ، آیت 62

19 Ignoreance of law is not a sufficient excuse for committing a crime

20 ایمپسن، محولہ بالا

21 گیان چند جین، محولہ بالا، ص 270

22 سرخوش دہلوی، محولہ بالا، ص 588

23 ضامن کنتوری، محولہ بالا، ص 244

24 آسی الدنی: محولہ بالا، ص 166

25 گیان چند جین: محولہ بالا، ص 413

26 وجاہت سندیلوی، محولہ بالا، ص 174

27 امتیاز علی عرشی دیوانِ غالب (علی گڑھ، انجمن ترقی اردو، 1969)، میں اس شعر کے زیر یہ قطعہ دیا ہے (ص 395) ''یارب! جہانیان دل خرم دہ: در عوئی جنت آشتی باہم دہ
شداد پسر نداشت، با غش ازتست: آن مسن آدم بہ بنی آدم دہ''
[اے پروردگار! دنیا والوں کا دل مسرت سے بھر دے۔ ان میں جنت کے دعوی پر باہم تکرار نہ ہو۔ شداد کے کوئی اولاد نہیں تھی، جو اس کی بنائی جنت کا حقدار ہوتا۔ وہ جنت بھی تیری ہے۔ اس کے لیے جنت کے صحیح وارث آدم کی اولاد ہے، تو انھیں یہ عطا کر]

28 الطاف حسین حالی: یادگارِ غالب، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی 1986، ص 235

29 ضامن کنتوری، محولہ بالا، ص 411

■

Jamal Abdul Wajid
40- D, Mayur Vihar, Pocket 4, Phase: 1
Delhi - 110091

تشریح و تجزیہ

سلطان حیدر جوش علیگ کا افسانہ

’اتفاقات زمانہ‘

شہزاد بخت

سلطان حیدر جوش علیگ صاحب (ولادت: 1886، وفات: 1946) کا شمار افسانوی تاریخ میں ہراول دستے کے سپاہیوں میں ہوتا ہے۔ آپ نے اردو ادب میں اپنی معتدد تصنیفات مختلف اصناف سخن کے حوالے سے گرانقدر اضافے کیے ہیں جن میں ہوائی، صبر کی دیوی، نواب فرید اور ابن مسلم، نقش ونقاش (ناول)، فسانہ جوش (مضامین و افسانے)، اصلاح سخن، ہیری وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ افسانوں میں مسٹر ابلیس، ہاں انہیں، خواب وخیال، نقیب، جذب دل کی دو تصویریں اور اتفاقات زمانہ وغیرہ ہیں۔ آپ کے دور کو رومانوی افسانوں کے دور سے تعبیر کیا جاسکتا ہے اور آپ منشی پریم چند کے معاصرین میں شمار کیے جاتے ہیں۔

موصوف کے قلم سے نکلا ہوا ایک افسانہ ’اتفاقات زمانہ‘ (مطبوعہ ’الناظر‘ ماہ جون 1914، (’فسانہ جوش‘ مطبوعہ دارلناظر پریس لکھنؤ 1926، ص 89 تا 103) کا تجزیہ پیش ہے جو تقریباً ایک صدی قبل شائع ہوا بعدازاں اسے فسانہ جوش میں شامل کیا گیا ہے۔ اس رومانوی دور کے افسانے میں محبت واختیارات ان کے بدلتے محور، خواتین کی نفسیات، نسوانیت کی باہم حرص وحسد، نسائی جذبات، احساسات اور توقعات کی بہترین عکاسی قابل دید اور مصنف کے گہرے مشاہدے اور حافظے کی آئینہ دار ہیں۔ یہ افسانہ تکنیک کے اعتبار سے مکمل بیانیہ اور واحد متکلم کی زبانی انداز تحریر پر مبنی ہے۔ اس دور کے افسانوں کا یہی طریق خاص تھا۔ بعدازاں اہل مغرب کی تقلید میں مکالمے اور ان کے بین السطور کے حوالے سے نظریے کی ترسیل کے ذرائع کے طور طریقے اپنائے گئے۔ مگر یہ بات ملحوظ خاطر رہے کہ مذکورہ افسانے کی اولین اشاعت 1914 ہے جب تک رومانوی تحریک کا ہی زور قائم تھا اور ترقی پسند تحریک اور جدیدیت کی تخم ریزی اور کونپل آوری سب بعد کے قصے ہیں۔

افسانے کا محور/ نقطۂ نظر

مذکورہ افسانے میں عام روایت سے انحراف اور مزاج میں بغاوت کے اثرات ہیں جو مصنف سلطان حیدر جوش کی شخصیت وافکار کا خاصہ تھے۔ وہ بنیادی طور پر انقلابی سوچ اور آزادانہ طرز فکر کے دلدادہ تھے۔ ان کے خیالات کا عکس صاف طور پر ان کی تخلیقات میں بھی جابجا نظر آتا ہے۔ ان کے افسانے ’اتفاقات زمانہ‘ میں ایک ایسی مشہور ومعروف دکان ’عزیز اینڈ اسماعیل جنرل اسٹورس‘ کا ذکر ہے جس سے بمبئی کا بچہ بچہ واقف ہے اس کا مالک اپنی دکان میں عموماً بجائے مرد ملازمین رکھنے کے اہل مغرب کی تقلید میں خواتین ملازمین کو مامور کرتا تھا۔ اس دکان پر عموماً زنانہ ساز وسامان آرائش وزیبائش فروخت ہوتے تھے۔ اس دکان کے داخلی امور میں جہاں رضیہ جو مرکزی کردار کی مدمخالف ہے وہ تو نقد کی وصولی پر مامور تھی۔ ادھر افسانے کا مرکزی کردار حمیدہ لیس، بیل اور فیتے وغیرہ فروختگی کی نگراں تھی۔ دکان میں غالب سرمائے کے مالک عبدالعزیز کی سفارش کردہ حمیدہ ہے اور کمزور شریک اسمٰعیل سیٹھ کی عزیزہ اور سفارش کار رضیہ ہے۔ ان دونوں میں حمیدہ کو رضیہ سے وہ ازلی نسائی رشک وحسد پیدا ہوگئی تھی جو عمومی طور خواتین میں باہمی طور پر پائی جاتی ہے۔ جسے سلطان حیدر جوش کے الفاظ میں ملاحظہ کیجیے۔

”عبدالعزیز کی زندگی میں کئی بار ایسا ہوا کہ حمیدہ نے رضیہ کے لباس پر اس کی طرز رفتار وگفتار پر نکتہ چینی کی۔ ایک مرتبہ اگر حافظہ غلطی نہیں کرتا تو یہاں تک ہوا کہ حمیدہ نے رضیہ کی ریشمی ساڑھی کے باندھنے کے طریقے پر اس کے سامنے دوبدو نقص نکالا۔ لیکن اب جبکہ عبدالعزیز کی آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند ہوگئی تھیں تو وہ اپنے آپ کو کمزور اور بے یار ومددگار پاتی تھی۔ سچ یہ ہے کہ رقابت اور رشک وحسد کا جذبہ مجھے اس سے بحث نہیں کہ اچھا ہے یا برا، صنف نازک میں بہت جلد مشتعل ہوجاتا ہے۔ میں پورے طور پر نہیں کہہ سکتا کہ ایک نوجوان عورت میں دوسری نوجوان عورت سے کن کن باتوں میں رشک یا حسد پیدا ہوتا ہے۔ مگر اس میں شک نہیں کہ اس طبقے میں رشک ورقابت کے شعلہ زن ہونے کے ہزاروں بلکہ لاتعداد طریقے ہیں۔ حسن ومحبت کے چولہے میں ڈالیے، زیور، لباس، تمول، طرز گفتار اور خدا جانے کیا کیا چیزیں ہیں جن پر فوراً شعلے کی طرح جذبۂ رقابت وحسد بھڑک اٹھتا ہے۔“

(مطبوعہ ’الناظر ماہ جون 1914، /(’فسانہ جوش‘ مطبوعہ دارلناظر پریس لکھنؤ 1926، ص 90)

پلاٹ

افسانے کا پلاٹ سادہ اور منظر نامے کا بیشتر حصہ ایک مشہور ومعروف دکان کے داخلی معاملات پر منحصر ہے۔ افسانے کی ابتدا عبدالعزیز کی موت کے بعد حمیدہ کی ذہنی کیفیت، عدم تحفظ اور نسوانی حسد ورقابت، بغض وعناد اور رشک اور حرص جیسے جذبات کے اظہار سے ہوتی

''اتفاقات زمانہ

(1)

ہے۔ ان دونوں میں حسد و رقابت کا سبب سوئے اتفاق روایتی طور پر کسی مردذات کے سبب نہیں بلکہ ان شرکائے تجارت افراد کی مالی شمولیت کی شراکت کے تناسب پر ہوتی ہے۔ حمیدہ کی ملازمت عبدالعزیز کی مرہون منت تھی اس کے برعکس رضیہ کی ملازمت اور خون کی رشتے کی نسبت اسمٰعیل سے تھی جس میں غالب حصہ عبدالعزیز کا تھا اور اسمٰعیل کا حصہ نسبتاً کم تھا۔ مگر جہاں تک ان کے کام کی نسبت ہے حمیدہ کو خواتین کی اشیائے زیبائش اور آرائش کی فروختگی کی نگراں کے طور پر مقرر کیا گیا تھا اور رضیہ نقدی کی وصولی پر مامور تھی اور حمیدہ کے سارے حسد ورقابت کی جڑ یہیں پیوست تھی۔ ایک گاہک کے آنے پر دونوں میں معمولی بات پر تنازعہ ہو جاتا ہے جس پر اسمٰعیل حمیدہ کی سرزنش کرتا ہے مگر اچانک مقیط کے منظر نامے میں بطور عبدالعزیز کے بھتیجے اور اکلوتے وارث کے داخلے سے افسانے کی فضا تبدیل ہو جاتی ہے۔ مقیط نہ صرف کاروبار کی ترقی میں دلچسپی لیتا ہے بلکہ خواتین پر مشتمل عملے میں بھی یکساں دلچسپی رکھتا ہے، بارش کے دنوں میں اپنے ہی عملے کی خاتون سارہ سے اتفاقی تصادم سے رومان پرور ماحول تیار ہو جاتا ہے۔ مقیط کے تیار کردہ منصوبے کے مطابق حمیدہ سارہ کو نہ صرف ہوٹل میں طعام کی دعوت دیتی ہے جہاں مقیط سے ملاقات پھر گاڑی میں سوار ہوکر سنیما بینی اور گھر تک پہنچانے میں جو اتفاقات کا سلسلہ سامنے آتا ہے اور یہی اتفاقات کا سلسلہ افسانے کے عنوان اتفاقات زمانہ کا موجب بنا۔

رومان پرور منظر نگاری

''ایک روز آفتاب ابر غیظ کا اسیر ہو گیا تھا ہوا ٹھنڈی چل رہی تھی اور بارش ہلکی ہلکی پھوار کی صورت میں برابر جاری تھی اور ایسا سماں تھا جس سے نوخیز طبیعت میں خواہ مخواہ رہ رہ کر گدگدی خود بخود محسوس ہونے لگے۔ ایسی بوندا باندی میں خریداروں کا ہر روز کے موافق آنا تو بس معدوم، اس لیے دکان کے متعلقین تقریباً بیکاری میں وقت گزار رہے تھے۔ مقیط آفس سے نکل کر ہال میں آیا۔ وہاں سے ٹہلتا ہوا دروازے تک پہنچا وہ بھی اس وقت ایک سگار سلگائے ایک ہاتھ پتلون کی جیب میں ڈالے ہال سے دروازے تک اور دروازے سے ہال تک برابر ٹہل رہا تھا۔ کبھی کبھی حمیدہ کی میز کے پاس ٹھہر کر دو ایک باتیں کر لیتا تھا۔ ورنہ زیادہ تر سگار کے راکھ بنانے میں دھواں دھار کوشش کر رہا تھا۔ اس وقت اس کی طبیعت پر بھی بھیگی ہوئی ہوا کا پورا پورا اثر تھا۔ وہ کچھ کہتا بھی تو مذاق آمیز لہجے اور تبسم نما دہانے کے ساتھ کہتا نہ صرف حمیدہ سے بلکہ کئی ایک سے اس نے خطاب کیا اور جن الفاظ میں بلکہ جن تیوروں کے ساتھ اس کو جواب ملا وہ افسوس ہے کہ میری کم علمی کی وجہ ہے تحریر کے محدود دائرے میں نہیں آ سکتا۔''

(مطبوعہ 'الناظر' ماہ جون 1941، ('افسانۂ جوش' مطبوعہ دارلناظر پریس لکھنؤ، 1926، ص 102)

کردار نگاری

افسانہ 'اتفاقات زمانہ' میں حمیدہ اور رضیہ کے کردار کے حوالے سے نسوانی جذبات کی عکاسی اس قدر فنکاری سے کی گئی ہے کہ فی زمانہ بھی اس کی تازہ مثال ہمارے اپنے گرد و نواح میں کہیں بھی عام مشاہدے کی بات ہے۔ دکان کی دیگر خادمائیں جوں جوں طاقت یا اختیار کا محور تبدیل ہوتے دیکھتی ہیں وہ بھی اسی روش پر چل پڑتی ہیں۔ جس سے انسانی نفسیات میں موجود عدم تحفظ، خود غرضی اور مطلب پرستی جیسے جذبات ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ مرحوم عبدالعزیز کے بھتیجے مقیط کا تعلیم کو درمیان میں خیرباد کہہ کر اپنے کاروبار میں شامل ہونا انسان کے حریص اور علم کی بجائے دولت یا اختیار کا طلبگار ہونے کا ترجمان ہے۔ اسمٰعیل کا حمیدہ پر معمولی تنازعے کے ضمن میں یوں سب کے سامنے سرزنش کرنا اور رضیہ کی بلا واسطہ حمایت گویا اقربا پروری اور انسانی فطرت کا حصہ ہے۔ سارہ کی معصومیت، کم عمری اور فطری انصاف پسندی اسے سارے عملے میں بھی ممتاز اور الگ رکھتی ہے جو حمیدہ کی حمایتی اور طرفدار ہوتی ہے۔ مگر قسمت جس پر مہربان ہو تو وہ شخص سکۂ رائج الوقت بن کر چمکتا ہے اور دیگر افراد اسے فرط رشک و حیرت و استعجاب سے دیکھتے ہیں۔ حمیدہ کی خود غرضی یہ ہے کہ وہ پہلے سے طے شدہ منصوبے کے تحت نہ صرف مقیط کے منصوبے کو عملی جامہ پہناتی ہے بلکہ ان کے ساتھ سیر سپاٹے، فلم بینی اور طعام کا بھی لطف اٹھاتی ہے اور ان دونوں کی ملاقات میں ثالث کا کردار بھی ادا کرتی ہے۔ تاہم مقیط سے شادی کے بعد وہ سارہ کی ثالثی سے ہی رضیہ سے اپنے اختلافات، منافقت، حسد و رقابت و رشک کو نہ صرف ختم کر دیتی ہے بلکہ ان تینوں میں اتحاد و اتفاق بھی قائم ہوتا ہے۔ مصنف کے الفاظ میں ملاحظہ کیجیے۔

''اس کے پورے دو مہینے بعد رضیہ اور حمیدہ کے نفاق کا خاتمہ ہوا اور وہ بھی محض اتفاق سے ایسے نہ مسز مقیط جن کو دو مہینے پیشتر صرف سارہ کہا جاتا تھا بیچ میں پڑتیں اور نہ اس جنگِ رقابت کا خاتمہ ہوتا۔ کہا جاتا ہے کہ اس وقت سے حمیدہ، رضیہ، سارہ میں ایسا اتحاد قائم ہو گیا ہے جو یورپ کے اتحاد ثلاثہ سے کہیں زیادہ مستحکم اور سچائی پر مبنی ہے۔''

(مطبوعہ 'الناظر' ماہ جون 1914، ('افسانۂ جوش' مطبوعہ دارلناظر پریس لکھنؤ 1026، ص 103)

افسانے میں رومانیت کا عنصر

افسانے میں رومانوی تحریک کے حوالے سے رومانی عناصر جابجا فراوانی سے نظر آتے ہیں۔ ان میں خوبصورت تشبیہات و استعارات اور بلیغ تلمیحات سے افسانے کو مزین کیا گیا ہے۔ خوبصورت منظر نگاری کے طفیل گو افسانہ اپنی ابتدائی کیفیات میں بھی دلکش اور دلچسپ معلوم ہوتا ہے اور کردار نگاری کے حوالے سے انسانی فطرت کی مرقع کشی کا مظہر ہے۔

''یہ وقت اور یہ کیفیت تھی جبکہ دروازے کے قریب کسی کے بے تحاشہ بھاگتے ہوئے سیڑھیوں پر چڑھنے کی آواز آئی۔ مقیط ٹہل تو رہا ہی تھا۔ قدم بڑھاتا ہوا دروازہ میں تھا کہ رکتے رکتے بھی بھاگ کر آنے والے سے ٹکرا گیا۔ اب ایک عجیب قوت مدافعانہ کے ساتھ دونوں ایک دوسرے سے الگ ہو گئے مگر نظریں مل گئیں۔ آنکھیں لڑ گئیں مقیط ایک ناقابل بیان حیرت کے ساتھ جس میں حیرت کے ساتھ ہی ایک جذبہ بھی جھلک مار رہا

تھا۔ سامنے والی تصویر انسانی کو دیکھ رہا تھا اور سارہ کیونکہ یہ آنے والی وہی تھی۔ خدا جانے کس خیال سے اپنی لڑ جانے والی نگاہوں کو پلکوں کی زنجیروں میں باندھ کر زمین پر گرا دینا چاہتی تھی۔ اس کے بال کھلے ہوئے تھے ریشمی ساڑھی کا آنچل ڈھلک کر... شانوں کی روک تھام سے گرنے سے بال بال بچ گیا تھا۔ بے تحاشہ دوڑنے کی وجہ سے غیر معمولی سرخی چہرے پر دوڑ گئی تھی۔ چھتری جو ایک ہاتھ میں تھی سیدھے کاندھے پر گر گئی تھی اور وہ کیفیت جو اس وقت یکا یک مقیط سے ٹکرا جانے سے پیدا ہوئی تھی وہ سونے پر سہاگہ کا کام کر رہی تھی۔ میں یہ نہیں کہ سکتا کہ کیوپڈ کا تیر کون سی ادا کی صورت میں تراز و ہوا۔ لیکن ضرور ہوا۔''

(مطبوعہ 'الناظر' ماہ جون 1914 / ('فسانہ جوش'' مطبوعہ دارلناظر پریس لکھنؤ 1926، ص 100)

رومانیت کا مظاہرہ ایک اور مقام پر قابل دید ہے جب تینوں کردار طعام اور بائیسکوپ سے فارغ ہوتے ہیں تو مقیط پہلے حمیدہ کو اس کے گھر چھوڑ کر وہاں سے پیادہ پا سارہ کے ہمراہ اس کے گھر کی طرف چل پڑتا ہے جو ایک پارک اور چند مکان کے فاصلے پر واقع تھا۔ اس دوران ان میں کیا قول وقرار ہوا مصنف کی زبانی ملاحظہ فرمائیں۔

''تماشہ ختم ہوتے ہی اسی گاڑی میں مقیط نے پہلے حمیدہ کو اس کے گھر تک پہنچایا اور وہاں سے گاڑی چھوڑ کر پیادہ پا سارہ کو پہنچانے اس کے گھر چلا کیونکہ سارہ اور حمیدہ کے مکان میں صرف دو تین مکان اور ایک چھوٹا سا پارک حائل تھا سارہ نے مقیط کو اس تکلف سے باز رکھنے کے لیے بہت کچھ کہا مگر مقیط کو خدا جانے اس تکلف میں کیا لطف تھا وہ نہ مانا۔ راستے میں جو معمولی باتیں خاص جذبہ لیے ہوئے لہجے بن ہوتی رہیں ان کا بیان کرنا قریب قریب فضول ہے۔ پارک میں نارنگی کے درخت کے نیچے ٹھہر کر جو باتیں ہوئیں ان کا پتہ نہ یہاں ہے نہ وہاں ہے تمام راوی اور کل مؤرخ اس گفتگو کی نسبت اپنی معلومات کی شعاع ڈالنے سے قاصر ہیں البتہ ایک سودائی شخص کی زبانی اس قدر معلوم ہو سکا ہے کہ گفتگو کسی لحاظ سے بھی عجوبہ یا نرالی نہیں تھی۔ آج سے ہزار پیشتر ایک جوان گڈریہ بانسی بجانے والے گڈریے نے ایک نوعمر لڑکی کے درمیان جو اپنے گھوڑوں کو پانی پلانے آئی تھی دریائے فرات کے کنارے پر قریب قریب یہ ہی واقعہ پیش آیا تھا الفاظ اور زبان میں چاہے فرق ہو لیکن جذبات فرات کے کنارے بانسی بجانے والے گڈریے کے تھے۔''

(مطبوعہ 'الناظر' ماہ جون 1914 / ('فسانہ جوش' مطبوعہ دارلناظر پریس لکھنؤ 1926، ص 103)

افسانے میں طنز کا عنصر

سلطان حیدر جوش کے ہاں افسانوں میں گہری طنز نگاری کا زبردست اسلوب پایا جاتا ہے بلکہ یہی موصوف کی شناخت ہے۔ ہر چند کہ درج ذیل اقتباس افسانے میں فلسفیانہ ثقالت اور بوجھل پن کا سبب تسلیم کیے گئے ہیں جو کہانی کے فطری بہاؤ اور وحدت تاثر میں رخنہ اندازی کی وجہ بنتے ہیں۔ تاہم یہ مصنف کے اس دور کے حالات کی منظر کشی وقیع مشاہدات، محسوسات اور تجربات پر مبنی ہیں جو سرمایہ دارانہ نظام کی اساس، طبقہ واری فرق اور استحصال کی ذہنیت پر گہرے طنز کے حوالے سے مصنف نے اس دور کی سرمایہ دارانہ طرز فکر پر کاری چوٹ کی ہے۔ جہاں انھوں نے انسانی مزاج کی خودغرضی، چڑھتے سورج کو سلام کرنے کے رجحانات، طاقت کے بدلتے محور اور سائنس کی اندھی تقلید تمام اہداف کو اختصار کے ساتھ ایک ہی تیر سے ترازو کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ موصوف کے الفاظ میں اقتباس پیش ہے۔

سلطان حیدر جوش کے ہاں افسانوں میں گہری طنز نگاری کا زبردست اسلوب پایا جاتا ہے بلکہ یہی موصوف کی شناخت ہے۔ ہر چند کہ درج ذیل اقتباس افسانے میں فلسفیانہ ثقالت اور بوجھل پن کا سبب تسلیم کیے گئے ہیں جو کہانی کے فطری بہاؤ اور وحدت تاثر میں رخنہ اندازی کی وجہ بنتے ہیں۔ تاہم یہ مصنف کے اس دور کے حالات کی منظر کشی وقیع مشاہدات، محسوسات اور تجربات پر مبنی ہیں جو سرمایہ دارانہ نظام کی اساس، طبقہ واری فرق اور استحصال کی ذہنیت پر گہرے طنز کے حوالے سے مصنف نے اس دور کی سرمایہ دارانہ طرز فکر پر کاری چوٹ کی ہے۔ جہاں انہوں نے انسانی مزاج کی خود غرضی، چڑھتے سورج کو سلام کرنے کے رجحانات، طاقت کے بدلتے محور اور سائنس کی اندھی تقلید تمام اہداف کو اختصار کے ساتھ ایک ہی تیر سے ترازو کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

''دنیا فانی اور ناکارہ ہو یا نہ ہو۔ لیکن ظاہر پرست اور مطلب پرست ضرور ہے۔ جس قدر دقیانوسی استقلال اور جہالت آمیز جوش گھٹتا جاتا ہے اسی قدر مطلب پرستی اور طاقت پرستی بڑھتی جاتی ہے۔ موجودہ مہذب تعلیم یافتہ دنیا سائنس کو اپنا مذہب سمجھتی ہے اور سائنس یہ صاف طور پر بتاتی ہے کہ دو طاقتیں جب ایک دوسرے سے ٹکرائیں گی تو زبردست یقینا کمزور کو پسپا کر دے گی۔ اب کوئی وجہ نہیں کہ مہذب دنیا ہمیشہ طاقتور کا ساتھ نہ دے۔ کیونکہ کمزور کی حمایت لینا نہایت غیر فطری اور اصول سائنس کے خلاف ہے۔ کمزور ہستی کو جس قدر جلد دنیا سے خارج کر دیا جائے اسی قدر اچھا ہے۔ کیونکہ یہ مانا جاتا ہے کہ کمزور کا وجود مستقبل کے لیے ضرر رساں ہے۔ وہ جب تک زندہ ہے کمزوری کی وبا پھیلاتا رہے گا اور کمزوری کا بیج بوتا رہے گا۔ اس کی نسل اس سے بھی زیادہ کمزور ہوگی۔ اس لیے نہایت محفوظ اور موجودہ طریقہ یہ ہے کہ کمزور ناچار کا بیج ہی دنیا سے اڑا دیا جائے۔''

(مطبوعہ 'الناظر' ماہ جون 1914 / ('فسانہ جوش' مطبوعہ دارلناظر پریس لکھنؤ 1926، ص 94)

مکالمہ

ترقی پسند تحریک اور جدیدیت کی ہر دو تحریکات کے زمانے میں افسانوں کے اجزائے ترکیبی میں مکالمہ بھی ایک اہم اور لازمی جز و ہے مگر ایک صدی قبل جب افسانہ نگاری کی ابتدا ہوئی تب افسانہ تکنیک کے اعتبار سے واحد متکلم کے انداز بیاں پر مبنی ہوتا ہے۔ لہٰذا افسانے کی ابتدائی ہیئتوں میں بیانیہ اور خصوصاً واحد متکلم کی تکنیک ہی رائج تھی جس میں منظر نگاری، انشا پردازی اور مصنف کے عندیے و نظریے نیز مافی الضمیر کی ترسیل خود ہی کرنی پڑتی تھی۔ جبکہ بعد کے ادوار میں مصنف کے عندیے اور مافی الضمیر کی ترسیل کا بوجھ کرداروں کے شانوں پر آن پڑا جو بڑے طویل عرصے پر محیط بہت تجربات، مغربی انداز بیاں کی تقلید اور بہت مشقوں اور تنقیدوں کے بعد نکھر کر سامنے آیا ہے۔

زبان و بیان

سلطان حیدر کی زبان و بیان میں پرانی ٹکسالی، با محاورہ، تشبیہات، استعارات، تلمیحات سے آراستہ اور ماضی کے دلچسپ حوالوں سے مزین ہے اور افسانے کے بہاؤ کو قاری کی ذہنی رو سے ہم آہنگی رکھتی ہے۔ ان اوصاف کے بجز ان کی زبان میں متروک، ثقیل اور پیچیدہ الفاظ مفقود ہیں۔ حسن بیان کے ساتھ تاثر کا پہلو ہاتھ سے جانے نہیں پاتا اور قاری کو ساتھ لیے ہوئے افسانہ اختتام کو پہنچتا ہے۔

نقطۂ عروج

فی زمانہ رائج نقطۂ عروج اس افسانے میں دھیما ہے دور حاضر کی طرح اس قدر چونکانے والا تو نہیں ہے مگر مجموعی تاثر اور اس زمانے کی اقدار، سوچ وفکر اور حالات کی تصویر کشی موصوف نے بڑی عمدگی ومہارت سے کی ہے۔

■

Shahzad Bakht Ansari
238, New Ward, Mamletdar Lane
Malegaon-423203
Dist. Nashik (Maharashtra)

سوالنامہ برائے انٹرویو

ماہنامہ'اردو دنیا' میں مشاہیر ادب کے انٹرویوز شائع کیے جاتے تھے، یہ ایک مقبول کالم تھا۔ یہ کالم ہنوز جاری ہے۔ بس اس کی شکل وصورت ذرا سی تبدیل کردی گئی ہے تا کہ اردو کے تعلق سے غیر ضروری مباحث کے بجائے قارئین اردو زبان کی حقیقی صورت حال سے آگاہ ہوسکیں۔

س: زبانوں کی موت کی وجوہات کیا ہیں؟

س: زبانوں کو زندہ رکھنے کے لیے کون سا طریقہ کار اختیار کیا جانا چاہیے؟

س: زبان کا تہذیب و ثقافت سے کیا رشتہ ہے؟

س: کیا زبانوں کی موت سے انسانی وراثت کے تحفظ کا مسئلہ بھی جڑا ہوا ہے؟

س: کیا کسی زبان میں خواندگی، سائنسی، سماجی مواد کی کمی سے زبان پر منفی اثرات پڑتے ہیں؟

س: موجودہ حالات میں اردو زبان کو کس طرح کے خطرات لاحق ہیں؟

س: کیا اردو کا چہرہ مسخ ہو رہا ہے؟ کیا اردو کی شکل بگڑ رہی ہے؟

س: اردو کا مستقبل کیا ہے؟

س: زبان کی سطح پر جو بگاڑ پیدا ہو رہا ہے اس کو روکنے کے لیے کون سی ترکیبیں استعمال کی جاسکتی ہیں؟

س: کیا اردو کے ادارے، تنظیمیں، زبان سے زیادہ ادب پر توجہ دے رہے ہیں اور زبان سے متعلق کتابوں کی اشاعت تقریباً رک سی گئی ہے؟

س: کیا کلاسیکیت، جدیدیت وغیرہ پر گفتگو سے زبان کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے؟

س: آپ کے علاقے میں کتنے اردو میڈیم اسکول ہیں اور ان میں اساتذہ کی کتنی تعداد ہے؟

س: آپ کے علاقے میں کتنی لائبریریاں ہیں اور وہاں کون سے اخبارات اور رسائل آتے ہیں؟

س: آپ کے علاقے میں کتنی اردو تنظیمیں، ادارے اور انجمنیں ہیں اور وہ کس نہج پر اردو کے فروغ کے لیے کام کر رہے ہیں؟

س: آپ کے علاقے میں اردو سے جڑی ہوئی کتنی شخصیات ہیں جن کی خدمات کا اعتراف علاقائی، قومی سطح پر نہیں کیا گیا ہے؟

س: آپ مقامی سطح پر اردو کے فروغ کے لیے کیا کوششیں کر رہے ہیں؟

س: آپ کے ذہن میں فروغ اردو کے لیے کیا تجاویز اور مشورے ہیں؟

س: اردو رسم الخط کی بقا کے لیے کیا کوششیں کیا جاسکتی ہیں؟

س: دوسری علاقائی زبانوں میں اردو کے فروغ کی کیا صورتیں ہوسکتی ہیں؟

س: کیا آپ کے اہل خانہ اردو زبان لکھنا پڑھنا اور بولنا جانتے ہیں؟

س: آپ کے بعد کیا آپ کے گھر میں اردو زندہ رہے گی؟

س: غیر اردو حلقے میں فروغ اردو کے لیے کیا حکمت عملی اختیار کی جانی چاہیے؟

س: آپ کے علاقے میں کتنے کالجز یا یونیورسٹیز ہیں جن میں اردو کی تعلیم دی جاتی ہے اور وہاں اردو پڑھنے والوں کی تعداد کتنی ہے؟

س: ملکی سطح پر غیر سرکاری تنظیموں سے اردو کی ترویج و اشاعت کے سلسلے میں کس طرح سے مدد لی جاسکتی ہے؟

س: سینٹرل اسکولوں اور نوودے ودیالیہ میں اردو کی تعلیم کا کوئی معقول انتظام ہے؟

ماہنامہ'اردو دنیا' میں اسی سوالنامے کی روشنی میں ان لوگوں کے انٹرویوز شائع کیے جائیں گے جو اردو زبان و ادب سے جڑے ہوئے ہیں اور اردو کی خدمت کا بے پناہ جذبہ رکھتے ہیں مگر انھیں اپنے خیالات کے اظہار کا موقع نہیں ملتا۔ یہ سوالنامہ ہر اس فرد کے لیے ہے جو اردو کاز اور مشن سے جڑا ہوا ہے۔ اس سوالنامے کے ذریعے ہمیں اردو زبان کے تعلق سے حقیقی صورت حال کا علم ہوگا اور اسی کی روشنی میں فروغ اردو کے لیے ایک روڈ میپ تیار کیا جائے گا۔ اپنے جوابات کے ساتھ سوانحی کوائف مع تصویر درج ذیل ای میل آئی ڈی پر بھیجیں: editor@ncpul.in ➢ urduduniyancpul@yahoo.co.in➢

تبصرہ و تعارف

تبصرہ نگاری ادبی تنقید ہی کی ایک شکل ہے جس میں کتاب کے مواد، اسلوب اور معیار کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ کتاب کے مالہ وما علیہ اور دیگر جزئیات کے حوالے سے قارئین کو بہت قیمتی معلومات عطا کی جاتی ہیں۔ اردو میں تبصرہ نگاری کی ایک مضبوط اور مستحکم روایت رہی ہے، خاص طور پر قدیم مجلات نے مطبوعات جدیدہ کے تعارف کا جو سلسلہ قائم کیا تھا وہ بہت ہی مفید تھا۔ تبصرہ بہت ذمے داری کا کام ہے اس لیے مبصرین کو چاہیے کہ وہ کتابوں کے انتخاب میں بھی اپنے اعلیٰ ذوق کا ثبوت دیں اور تبصرہ کرتے وقت غیرضروری تمہید، افراط و تفریط، بے معنی تحسین اور بے جا تنقید سے گریز کرکے کتاب کے اہم اور افادی نکات کی نشاندہی کریں۔ اردو کے علاوہ انگریزی، ہندی یا دیگر زبانوں میں اردو زبان و ادب سے متعلق جو کتابیں شائع ہوتی ہیں ان پر بھی آپ تبصرے بھیجیں تو بہتر ہو گا۔

اردو شاعری میں قومیت کا تصور

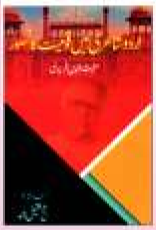

مصنف: مغیث الدین فریدی

ترتیب و تقدیم: شیخ عقیل احمد

صفحات: 234، قیمت: 135، سنہ اشاعت: 2021

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: حقانی القاسمی، شاہین باغ، نئی دہلی

قومیت یا نیشنلزم پولیٹکل ڈسکورس کا بھی حصہ ہے۔ اس کے تعلق سے ماضی میں بھی مختلف زاویہ ہائے نظر، تصورات، نظریات اور مطالعات انگریزی ہندی اور دیگر زبانوں میں سامنے آئے ہیں جن میں قومیت کے تصور کی تشریحات اور تعبیرات پیش کی گئی ہیں۔ یہ بہت ہی اہم موضوع ہے جس کے حوالے سے بہت سے دانشوروں نے بیش قیمت خیالات کا اظہار کیا ہے اور یہ وضاحت کی ہے کہ نیشنل ازم کی کون کون سی صورتیں اور شکلیں مختلف ادوار میں ہیں۔ ہندوستان بھی ایک ایسا ملک ہے جہاں قومیت کی جڑیں بہت مضبوط رہی ہیں اور اسی قومیت کے تصور نے ہی اس تہذیبی تکثیریت کے حامل ملک کو اتحاد اور سالمیت کی لڑی میں پروئے رکھا ہے۔ ہندوستان میں قومیت کا تصور بہت وسیع ہے اور اس کے دائرے کو اور وسعت بخشنے میں اردو زبان دیگر زبانوں سے پیچھے نہیں رہی ہے۔ اردو زبان نے ہمیشہ قومیت کے تصور اور تحریک کو ایک نئی تقویت اور توانائی عطا کی ہے۔ ڈاکٹر مغیث الدین فریدی کی یہ کتاب 'اردو شاعری میں قومیت کا تصور' اسی حوالے سے ہے جس سے یہ اندازہ لگانا آسان ہو جاتا ہے کہ اردو میں قومیت کا نہایت ہی جامع تصور ہے اور اردو کے شاعروں و ادیبوں نے تصور قومیت کی تشریح و تعبیر شعری اور نثری اصناف میں کی ہے۔ ڈاکٹر مغیث الدین فریدی نے اس موضوع کے تمام مقتضیات، محتویات مالہ وماعلیہ کو اپنی اس کتاب میں شامل کرتے ہوئے عالمانہ اور دانشورانہ گفتگو کی ہے اور اس تصور کے تمام جہات اور زاویوں کی عمدہ پیرائے میں تشریح بھی کی ہے اور یہ واضح کیا ہے کہ قومیت ایک ایسا تصور ہے جس کی گونج اردو شعر و ادب میں ہمیشہ سنائی دیتی رہی ہے اور اردو کا بیشتر سرمایہ اسی تصور قومیت کا ترجمان ہے۔

یہ کتاب پانچ ابواب پر محیط ہے۔ پہلے باب میں قومیت کی تعریف کی گئی ہے جس میں مختلف نظریات اور تصورات کے حوالے سے انھوں نے جامع گفتگو کی ہے۔ دوسرے باب میں اردو شاعری میں وطن دوستی کا تصور، اردو شاعری میں تہذیب لین دین کی نشانی، دکن کی اردو شاعری میں وطن دوستی کا تصور، شمالی ہند میں 1857 تک کی شاعری کا سیاسی پس منظر پر روشنی ڈالی گئی ہے اور اس ذیل میں انھوں نے غزل، قصیدہ، مثنوی، مخمس اور مسدس کے حوالے سے اس تصور کو واضح کیا ہے۔ اس کے علاوہ فریدی صاحب نے وطنی نظموں اور شہر آشوب کے ذریعے اردو شاعری میں قومیت اور وطنیت کے تصور کی مکمل تفصیل پیش کی ہے جس کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے شاعروں نے ارضیت اور مقامی تہذیب و معاشرت کی عکاسی کرتے ہوئے وطن دوستی کا خاص طور پر خیال رکھا ہے۔ ان کے بقول مثنویوں میں قومیت کی بہت ہی دلآویز تصویر ملتی ہے۔ انھوں نے شمالی ہند کی تمام شعری اصناف کے حوالے سے وطن دوستی کے اشعار کی نشاندہی کی ہے۔ اسی طرح وطنی نظموں کے تعلق سے انھوں نے ان تمام شعرا کو سمیٹ لیا ہے جن کے یہاں وطنیت اور قومیت کی خوبصورت تصویریں ملتی ہیں۔ تیسرے باب میں انھوں نے مختلف تحریکات کا ذکر کیا ہے جنھوں نے قومیت اور وطنیت کے تصور کو فروغ دینے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ چوتھے باب قومی بیداری میں یہ واضح کیا ہے کہ قوم کو بیدار کرنے میں اردو شاعری کا بہت ہی اہم رول رہا ہے۔ پانچواں باب قومی آزادی کے عنوان سے ہے۔ اس میں بھی انھوں نے ان شاعروں کے حوالے دیے ہیں جنھوں نے قومیت کے جذبے کو جگایا اور عوامی بیداری کے لیے اپنے شعر و ادب کو ذریعہ بنایا۔

یقینی طور پر یہ ایک اہم موضوع پر بیش قیمت کتاب ہے جس میں عہد بہ عہد تصور قومیت کے ارتقا کی مکمل تصویر پیش کی گئی ہے۔ اردو میں اس موضوع پر کوئی باضابطہ مربوط اور مبسوط تحقیقی و تنقیدی کتاب نہیں تھی۔ اس لیے یہ کتاب بہت ہی فکر انگیز اور معنی خیز ہے۔ ڈاکٹر فریدی نے بہت ہی محنت، لگن اور جستجو کے ساتھ یہ مقالہ تحریر کیا تھا۔ شاید یہ ان کے پی ایچ ڈی کا مقالہ تھا جو منظر عام پر نہیں آسکا تھا۔ ان کے شاگرد رشید ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے بڑی اچھی کوشش کی کہ ایک نہایت اہم موضوع اور عصر حاضر کے مطالبات سے ہم آہنگ کتاب کو اپنے بیش قیمت مقدمے کے ساتھ شائع کیا ہے۔ انھوں نے اپنے تفصیلی مقدمے میں اس کتاب کے امتیازات اور اختصاصات کی وضاحت کی ہے اور یہ تحریر کیا ہے کہ ڈاکٹر فریدی نے اردو کے تناظر میں قومیت اور وطنیت کی تفہیم و تعبیر کی عمدہ کوشش کی ہے۔ آج جب قومیت کے تصور پر تمام سیاسی، سماجی اور علمی حلقوں میں بحث و مباحثے کا سلسلہ جاری ہے تو یہ کتاب اور بھی زیادہ معنی خیز ہو جاتی ہے۔ مغیث الدین فریدی نے انگریزی، اردو کے مصادر و منابع سے استفادہ کیا ہے اور اس موضوع کے تمام تر اطراف و جہات کا عمدگی سے احاطہ کیا ہے۔

خاکے

درشن

مصنف: وقار قادری

صفحات: 232، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2021

ناشر: کتاب دار، جلال منزل، ٹیمکر اسٹریٹ، ممبئی 8

مبصر: علی احمد فاطمی

سابق صدر شعبۂ اردو، الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد، یوپی

قرأت کا ایک روایتی مسئلہ رہتا ہے کہ قارئین کو تحقیق و تنقید کی رو سے تقسیم کر کے دیکھنے کا عادی بنا دیا گیا ہے۔ نصابی و کتابی نوعیت کے افکار نے روایتی مدرس و ناقد کو مدرسے کی قیل و قال میں الجھا رکھا ہے جبکہ یہ مسئلہ ایک عام قاری کا ہے ہی نہیں کہ خاکے کی اصل تعریف کیا ہے اور وقار قادری کی یہ تحریریں خاکہ ہیں یا خاکہ نما۔ چلیے اگر کوئی تعریف کر بھی لی جائے تو کیا فرحت اللہ بیگ اور رشید احمد صدیقی کے خاکے پورے طور پر اس کسوٹی پر اترتے ہیں؟ ہم انھیں بحثوں میں الجھے رہتے ہیں اور دوسروں کو بھی الجھائے رکھتے ہیں غالباً اسی لیے یہ صنف شاعری اور افسانہ نگاری کے مقابلے عدم توجہ کا شکار رہی۔ یوں تو تعمیری ادب کی رو سے بحث، تبادلۂ خیال اور اختلافِ فکر کارآمد چیزیں ہیں کہ اسی سے نئی راہیں نکلتی ہیں۔ سردار جعفری نے کہا تھا۔

اختلا فات سے کھلتی ہے تخیل کی گرہ
یہ بھی اک رائے ہے دشنام نہیں ہے اے دوست

میں اختلاف تو نہیں لیکن اس خیال سے ضرور متفق ہوں کہ ان دنوں خاکہ نگاری، انشائیہ نگاری، سوانح نگاری جیسی تحریریں خوب لکھی جارہی ہیں اور قارئین میں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھی جارہی ہیں۔ غور طلب نکتہ یہ ہے کہ کیا یہ تحریریں واقعی دلچسپ اور قابل مطالعہ ہیں یا عام قارئین آج کی تخلیق سے بالعموم اور تنقید سے بالخصوص بیزار اور دل برداشتہ ہیں۔ اس لیے غیر شعوری طور پر ان کی توجہ ان اصناف پر جارہی ہے۔ کچھ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اصناف میں براہ راست انسان، انسانی معاملات و تجربات کی جو تصویریں، تعبیریں ابھرتی ہیں وہ قارئین کو آج کے الجھے ہوئے تاریک ماحول میں ہمت اور روشنی عطا کرتی ہیں جو کسی وجہ سے دوسری اصناف میں نہیں ہیں یا کم ہیں۔ بہرحال اس پر گفتگو ہونی چاہیے اور غور و فکر کی راہیں کھلنی چاہیے۔ فی الوقت میں اپنے دیرینہ دوست وقار قادری کی کتاب 'درشن' پر گفتگو کروں گا جن میں خاکے ہیں یا خاکے نما تحریریں، ایسا انھوں نے خود ہی لکھا ہے۔

میں کتاب کے عنوان سے ہی اپنی گفتگو کا آغاز کرتا ہوں۔ اندازہ ہوتا ہے کہ وقار قادری نے بے حد سوچ سمجھ کر اس کتاب کا عنوان رکھا ہے 'درشن'، اس لیے کہ یہ کتاب احباب بزرگ و خورد کا درشن نہیں کرواتی بلکہ زندگی کا درشن (فلسفہ) بھی پیش کرتی ہے۔ آپ پہلا ہی خاکہ پڑھیے جو وقار کے استاد پروفیسر عالی جعفری پر ہے۔ شخصیت کا تعارف تو ہوتا ہی ہے لیکن صرف تعارف سے خاکہ یا کوئی صنف نہیں بنتی لیکن جب اس کے جملے سامنے آتے ہیں "میں نے انھیں کبھی عجلت میں نہیں دیکھا، یہ آہستگی گویا ان کی زندگی کا حصہ تھی کم سخن، گوشہ نشینی کے قائل تھے عالی جعفری" یہ محض ایک عادت نہیں ہو سکتی یقیناً اس میں فکر بھی شامل ہے اور فکر ہی آگے بڑھ کر فلسفے کا روپ لیتی ہے یعنی درشن۔ ایک سادہ سا جملہ اور ہے "جب انھیں غلطی کا احساس ہوگیا تو بات ختم ہو جانا چاہیے..." یہ محض شرافت نہیں بلکہ زندگی برتنے کا ایک زاویہ فکر ہے۔ ندا فاضلی پر ایک نہیں دو مضامین ہیں۔ یہ تحریریں قدرے مختلف اور اس سے زیادہ منفرد ہیں۔ 'کاش ہمیں تقسیم کا عذاب نہ جھیلنا پڑتا' شخصی وارداتیں اگر سماجی صورتوں کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہیں تو شخص کے ساتھ عہد بھی بولنے لگتا ہے اور دائرہ ادب از خود وسیع ہونے لگتا ہے۔ یہ خصوصیت اکثر بڑے خاکوں میں بھی نہیں پائی جاتی لیکن وقار کے چند خاکوں میں سہی جھلکتی ہے۔ ان کا ایک اور معنی خیز جملہ ہے "بہت کم زمانہ شناس شاعر ہوتے ہیں بقیہ اپنی تباہی کو فن کی معراج سمجھتے ہیں۔" دوسرا مضمون تعزیتی جس میں اداسی و غمگینی زیادہ ہے۔ کل ملا کر ندا کی جو تصویر ابھرتی ہے وہ پرلطف ہے اور غور طلب بھی۔

خاکہ نگاری بھی ایک تخلیقی عمل ہے اس لیے زبان کی دلکشی، اشاریت اور ادبیت سے ہی تعارف، تخلیق میں تبدیل ہوتا ہے ورنہ آپ دوسروں کے بارے میں لکھ رہے ہیں اس میں آپ کا کیا ہے۔ مجھے تو آپ کا بہت کچھ ہوتا ہے۔ آپ کا قلم۔ آپ کا ذہن اور آپ کا وژن جو اس طرح کے بے ساختہ اور معنی خیز جملے رقم کرواتا ہے۔ "انھیں آتا دیکھ کر لگتا کہ حیدرآباد دکن کا سفیر آرہا ہے"

"ناظم صاحب بہت سا لکھنے کے لیے بہت سا پڑھنے میں یقین رکھتے ہیں"

یا یہ معنی خیز جملہ "سورج کے روٹین ورک میں غروب ہونا بھی شامل ہے۔"

ساجد رشید پر لکھی گئی تحریریں اس لیے بھی قابل قدر ہیں کہ وہ دوری اور خفگی کے عالم میں لکھی گئیں لیکن وقار کی پروقاریت یہی ہے کہ وہ اس کو ظاہر کرتے ہوئے بھی ظاہر نہیں ہونے دیتے۔ یہ وقار کا ظرف ہے اور تحریر کا کمال بھی۔ دو اقتباسات دیکھیے:

"وہ بھی ایک عام انسان کی طرح کئی اچھی اور بری بشری کمزوریوں کے ساتھ جینے والے انسان تھے۔" یا "ساجد رشید باقر مہدی کے تربیت یافتہ باخبر آدمی تھے۔ باقر مہدی کو ادبی حلقوں میں کچھ بزرگ باخبر مہدی کے نام سے یاد کرتے تھے"

انور ظہیر پر لکھتے لکھتے ایسے جملے لکھ جانا "ہم جیسا چاہتے ہیں ویسا بہت کم ہو پاتا ہے"

"بروں کی صحبت میں بیٹھ کر بھی نیک بنے رہنا"

م ناگ پر لکھتے ہوئے کہا "سیدھے شریف، نیک اور غریب لوگوں کو یاد رکھنے کا اب اس دنیا میں کوئی چلن نہیں رہا" یا مظہر سلیم پر لکھتے ہوئے کہا "اس شہر میں ایسی تنخواہ پا کر زندگی کرنے والا ایک مدرس اپنی صحت کی طرف کیا توجہ دے گا؟"

"مہنگائی کے اس عالم میں آدمی زندگی جیے گا یا ڈاکٹر کی فیس ادا کرے گا... یہاں کون ہے جو بیمار نہیں ہے!"

میں فیاض احمد فیضی کے اس خیال سے اتفاق کرتا ہوں کہ "وقار قادری کے کامیاب ترین خاکے وہ ہیں جو غیر معروف شخصیتوں پر لکھے گئے ہیں۔" یوں تو خاکے غیر معروف شخصیتوں پر کم لکھے جاتے ہیں لیکن وقار نے یہ بڑا کام کیا ہے۔ ان کے تئیں وقار کی جو دردمندی اور انسان دوستی ہے وہ فطری طور پر فنکاری میں بدل جاتی ہے، جو بعض بے حد قریبی دوستوں کے لیے بھی پیدا نہیں ہو پاتی۔ خواہ وہ یعقوب راہی ہوں یا سلام بن رزاق۔ اس لیے کہ یہاں دوستی و محبت ہے لیکن کسک نہیں۔ لیکن م ناگ اور مظہر سلیم پر لکھتے ہوئے جو خستگی اور دردمندی ظاہر ہوتی ہے وہ نہ صرف تحریر میں سوز و گداز پیدا کرتی ہے بلکہ زندگی کا درشن بھی کراتی ہے، جو شفیع انعامدار اور وجے تیندولکر کی تحریروں میں بھی نہیں پیدا ہوتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ کالو بھنگی، منگو کوچوان گھیسو مادھو جیسے کردار اردو افسانے کے اہم کردار بن جاتے ہیں۔ یہ رتبہ یہ عظمت تو چمپا اور شمن کو بھی نہیں ملتا دھنیا اور رانو کو مل جاتا ہے۔

وقار قادری یوں تو بظاہر سادہ طبیعت اور عام مزاج کے انسان ہیں لیکن ان خاکوں کو پڑھنے کے بعد ان کے مشاہدے اور تجربے کا خوب خوب اندازہ ہوتا ہے، وہ کس قدر خاموشی سے انسان کی نقل و حرکت اور سماجی حقیقت اور زندگی کی صداقت کو پڑھتے اور

سمجھتے آئے ہیں۔ چونکہ وہ خود ایک لمبی جدوجہد گزار کر آئے ہیں اسی لیے وہ جو کہاوت ہے کہ ''گھائل کی گتی گھائل جانے'' والی کیفیت ان خاکوں میں نظر آتی ہے جو زمین اور زندگی سے قریب ہے۔ جو کشمکش اور جدوجہد سے جڑے ہیں۔ بقول محمد علوی۔

دُکھ تو ہر گھر میں جاتا ہے   ہر گھر سے اس کا ناطہ ہے

لیکن جب ناطہ، واقعہ، حادثہ 'تخلیقی تجربے' کا حصہ بن جاتا ہے تو پھر وہ وقار کا خاکہ بن جاتا ہے۔ میں پروفیسر ظہیر علی کے ان جملوں سے صدفی صد اتفاق کرتا ہوں ''دوسری خوبی جوان خاکوں کو قابل قدر بناتی ہے وہ انسانی نفسیات سے ان کی گہری واقفیت ہے۔''

تحقیق و تنقید

فنگر پرنٹس (ابن صفی کی قلمی جولانیاں)

تحقیق وترتیب: ادریس شاہجہانپوری

صفحات: 808، قیمت: 850، سنہ اشاعت: 2021

ناشر: ادریس احمد خان

مبصر: عبدالحی، اسسٹنٹ پروفیسر، ایم کالج، دربھنگہ، بہار

اردو ادب میں ابن صفی ہی وہ واحد قلمکار ہیں جنھوں نے سری تخلیقات کو پاپولر کے زمرے سے نکال کر ادب کے زمرے تک پہنچایا۔ ان سے قبل سری کہانیوں یا ناولوں کے حوالے سے اردو میں تراجم تو بہت موجود تھے مگر طبع زاد تخلیقات خال خال ہی نظر آتی تھیں۔ یہ ابن صفی ہی تھے جنھوں نے لگاتار تین دہائیوں تک صاف ستھری سری تخلیقات کے ذریعے نہ صرف قارئین کی ذہن سازی کی بلکہ بالواسطہ طور پر اردو کے ایک استاد کا کردار بھی ادا کیا۔ ابن صفی اور ان کی سری تخلیقات کے بارے میں ایک اہم حقیقت اب سامنے آرہی ہے وہ یہ کہ ان کے ہم عصر ناقدین میں سے بیشتر ثقہ حضرات نے کبھی ان کو قابل اعتنا نہیں سمجھا تھا مگر نئی نسل اس نامور مصنف کی قدر دانی اور عظمت کے اعتراف میں اپنے پیش روؤں سے آگے بڑھتی چلی جارہی ہے۔ شمس الرحمن فاروقی، امجد اسلام امجد، حسن کمال، پروفیسر خالد جاوید، کرسٹینا آسٹر ہیلڈ، عارف اقبال، راشد اشرف جیسے درجنوں قلم کاروں نے ابن صفی کی عظمت کو تسلیم کیا اور ابن صفی کی ادبی حیثیت مضبوط کرنے کی کوشش کی ہے اور اس فہرست میں ادریس شاہجہانپوری کا نام بھی جڑ گیا ہے جن کی ابن صفی پر تحقیق 'فنگر پرنٹس (ابن صفی کی قلمی جولانیاں) حال ہی میں منظر عام پر آئی ہے۔ 808 صفحات پر مشتمل اپنی نوعیت کی منفرد کتاب ہے۔ کتاب دیکھ کر قاری تعریف کیے بنا نہیں رہ سکتا اور وہ یہ کہنے پر مجبور ہو جائے گا کہ کام اس طرح سے بھی کیا جاسکتا ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے جاسوسی دنیا اور نکہت پبلی کیشنز کے تحت شائع ہونے والے تمام ناولوں کے سرورق کو جمع کر دیا ہے اور ان کے حوالے سے تمام معلومات بھی درج کردی ہیں۔ ایک طرح سے دیکھا جائے تو انھوں نے ابن صفی پر مکمل انسائکلوپیڈیا ترتیب دے دی ہے۔ روایتی انداز کی کتابوں سے ہٹ کر یہ کتاب ابن صفی شناسی کے میدان میں میل کا پتھر ثابت ہوگی کتاب کا آغاز پیش تحریر سے ہوتا ہے جس میں ادریس صاحب نے اپنے بچپن کے حالات لکھے ہیں اور کتاب کی غرض وغایت بیان کی ہے۔ پیش تحریر سے معلوم ہوا کہ یہ کتاب ان کی چھ برسوں کی محنت کا نتیجہ ہے۔ یہ اقتباس دیکھیں:

''2015 میں واپس دوردرشن، دہلی آکر خیال آیا کہ ہندوستان میں الہ آباد سے شائع جاسوسی دنیا اور نکہت کے تحت عمران کے ناولوں کے سرورق اور ان کے اقتباسات پر مبنی ایک کتاب شائع کی جائے۔ بظاہر تو یہ کام آسان نظر آیا۔ مگر جب پہلے ایڈیشنز کے سرورق اکٹھا کرنا شروع کیے تو معلوم ہوا کہ بہت سے ناولوں کے پہلے ایڈیشنز کے علاوہ دوسرے اور تیسرے ایڈیشنز شائع کرتے وقت ان کے سرورق نامعلوم وجوہ سے عباس حسینی صاحب نے تبدیل کرادیے ہیں۔ یعنی ایک دوسرے سے تبدیل کردیے ہیں۔ لہٰذا ان کے پہلے ایڈیشن یا اصل سرورق کی تلاش میں مجھے دوردراز مقامات کا سفر کرنا پڑا اور الہ آباد، سنبھل، امروہہ، لکھنؤ، شاہجہاں پور، بھوپال وغیرہ شہروں کی خاک چھاننا پڑی۔ (ص 9)

اس اقتباس سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ ادریس صاحب نے اس کتاب کے لیے کتنی تگ ودو کی ہے۔ کتاب میں ابن صفی کے ناولوں کے سرورق، ہر ناول میں ابن صفی کے فلسفیانہ خیالات، طنز ومزاح بالترتیب فکر پارے، شگر پارے، نمک پارے، کی شکل میں، ناول کا خلاصہ، ناول کی اشاعت کی تفصیل، ناول کا عنوان، ابواب، کردار، مقامات، حوالے، مجرم، جرم کی نوعیت غرض تمام چیزیں جمع کردی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ سب معلومات اکٹھا کرنے کے لیے ہر ناول کو توجہ سے پڑھنا ساتھ ساتھ یہ تمام تفصیلات نوٹ کرتے جانا کتنا مشکل اور وقت طلب کام ہے۔ کتاب میں ہندوستان میں جاسوسی ناول نگاری کی روایت، ابن صفی: کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا، کے عنوانات سے مضامین بھی شامل ہیں۔ اردو گھر کے لیے فیس بک لائیو پر پروفیسر خالد جاوید سے زمرد مغل کی گفتگو زیر عنوان 'ادب عالیہ میں ابن صفی کا حصہ کیوں نہیں؟' بھی شامل کتاب ہے۔ ماہنامہ جاسوسی دنیا اور نکہت کے تحت شائع ناولوں کے سرورق اور دیگر تمام تفصیلات یقیناً ابن صفی کے چاہنے والوں کے لیے ایک تحفہ خاص ہے۔ کتاب میں بہ انداز دیگر کے تحت ابن صفی کی دیگر تحریروں کا تعارف بھی پیش کیا گیا ہے۔ اسی طرح تغافل شاعرانہ کے تحت ابن صفی کی شعری تخلیقات کی فہرست دی گئی ہے جو ہندوستان کے مختلف رسائل وکتاب میں شائع ہوئی تھیں۔ غرض یہ کہ ابن صفی سے متعلق وہ ساری تفصیلات اس کتاب میں شامل ہیں جو ابن صفی پر لکھی گئی دوسری کتابوں میں شاید نہ ہوں اور یہی اس کتاب کی خوبی ہے۔

یہ کتاب ادریس شاہجہاں پوری کی علمی وتحقیقی ریاضت کا عمدہ نقش ہے اور ابن صفی پر تحقیق کرنے والوں کے لیے بھی بہت مفید ثابت ہوگی۔

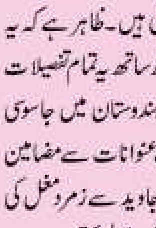

چند تاثرات

مصنف: ڈاکٹر چمن آرا خاں

صفحات: 160، قیمت: 275 روپے

ناشر: جی۔ ایل انٹرنیشنل پبلشرز، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی

مبصر: ڈاکٹر عبدالرزاق زیادی

مکان نمبر 372 گلی نمبر 14 غفار منزل،، نئی دہلی 25

ڈاکٹر چمن آرا خاں کا نام علمی وادبی دنیا میں محتاج تعارف نہیں۔ ان کی تیار کردہ کئی کتابیں، ترجمے اور ڈکشنریاں این سی ای آر ٹی کے پبلی کیشن ڈویژن سے شائع ہو کر منظر عام پر آچکی ہیں۔ ڈاکٹر چمن آرا خاں کی کتابوں میں ہماری زبان، اردو گلدستہ، اردو کٹ اور سہ لسانی لغات خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ چونکہ ڈاکٹر چمن آرا خاں کی دلچسپی تعلیم کے ساتھ ساتھ ابتدا سے ہی ادب سے بھی رہی ہے اس لیے جہاں گاہے بگاہے ان کے مضامین ہند وپاک کے مؤقر ومعتبر رسائل وجرائد کی زینت بنتے رہتے ہیں وہیں اب تک ان کی کئی کتابیں بھی قارئین سے داد تحسین حاصل کرچکی ہیں۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی زیر نظر کتاب ''چند تاثرات (مجموعہ مضامین)'' بھی ہے۔

'چند تاثرات' ڈاکٹر چمن آرا خاں کے مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس میں پیش لفظ کے علاوہ کل اٹھارہ مضامین شامل ہیں۔ مصنفہ نے اس کو تین حصوں میں تقسیم کر کے قارئین

کے سامنے پیش کیا ہے۔ حصہ ادب کے تحت نو مضامین نظیر اکبرآبادی، غالب کی خوش طبعی، اقبال ایک مصلح اور پیامی شاعر، مولانا ابوالکلام آزاد کی خطوط نگاری، وامق جونپوری، فراق: ہندوستان کے روپ رس کا شعری تلازمہ، ساحر لدھیانوی: درد کو نغمہ بنانے کا جادو، خلیل الرحمٰن اعظمی: جدید حسیت کے شاعر اور عبداللطیف اعظمی: حیات و خدمات شامل کتاب ہیں۔ ان مضامین سے جہاں ہمیں ڈاکٹر آرا کے تنقیدی شعور اور فکری نقطۂ نظر کا اندازہ ہوتا ہے وہیں ان سے ان کی شخصیت کی ہمہ جہتی، مطالعے کی وسعت اور گہرائی و گیرائی کا بھی علم ہوتا ہے۔ نظیر، غالب اور اقبال پر ان کے لکھے ہوئے مذکورہ مضامین قاری کو نہ صرف معلومات بہم پہنچاتے ہیں بلکہ ان کے ذہن میں کئی سوال بھی چھوڑ جاتے ہیں۔

'مولانا ابوالکلام آزاد کی خطوط نگاری' مضمون میں ڈاکٹر چمن آرا خاں نے مختلف خطوط کے ذریعے مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت کے تمام پہلوؤں کو تلاش کرنے کی سعی کی ہے۔ وامق جونپوری، فراق اور ساحر اردو کے اہم اور ممتاز ترقی پسند ادبا و شعرا میں شمار ہوتے ہیں۔ ان پر لکھے مضامین میں ان شخصیات کے فکر و فن پر بھرپور روشنی ڈالی گئی ہے۔ جدید شاعری اور بالخصوص نئی غزل کے حوالے سے ناصر کاظمی کے بعد جن شعرا کا نام سر فہرست لیا جاتا ہے ان میں خلیل الرحمٰن اعظمی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ شامل کتاب مضمون 'خلیل الرحمٰن اعظمی: جدید حسیت کے شاعر' میں ان کے شاعرانہ حسن و جمال کا جائزہ موجود ہے۔ ادبی مضامین کے ضمن میں شامل ہونے والا آخری مضمون 'عبداللطیف اعظمی۔ حیات و خدمات' ہے۔ اس میں، عبداللطیف اعظمی کی زندگی کا ایک سرسری خاکہ پیش کیا گیا ہے۔

'چند تاثرات' کے دوسرے حصے میں تعلیم و تدریس سے متعلق پانچ مضامین بچوں کے کردار کی تعمیر میں خاندان کا رول، تعلیم اور جمہوریت کا باہمی رشتہ، پرائمری تعلیم کے مسائل، بچوں کا ادب اور اس کی خصوصیات اور زبان کی تدریس کے جدید طریقہ کار شامل ہیں۔ کتاب کے تیسرے اور آخری حصے میں تین مضامین اردو زبان منزل بہ منزل، کفن کا تجزیاتی مطالعہ اور تعزیہ اور زخم دل کا تجزیہ شامل ہیں۔ اول الذکر مضمون میں اردو زبان کی ابتدا، تعمیر و تشکیل، اس کا پس منظر اور اسباب و علل پر بڑے ہی مدلل انداز میں گفتگو کی گئی ہے۔

پہلا تجزیہ اردو کے شاہکار افسانہ 'کفن' کا ہے جبکہ دوسرے تجزیے میں ابوالفضل صدیقی کے دو ناول 'تعزیہ' اور 'زخم دل' شامل ہیں۔ ان کہانیوں کے تجزیے میں مصنف نے ان کے قصے، مرکزی کردار، پلاٹ، کہانی پن، جزئیات نگاری، زبان و بیان، لفظیات اور کہاوتوں کے برجستہ استعمال وغیرہ پر بڑی تفصیل سے گفتگو کی ہے۔

کتاب اپنے باطن کی طرح ظاہری اعتبار سے بھی اپنے اندر بہت سی خوبیاں لیے ہوئے ہے۔ کتاب کی کمپوزنگ اور طباعت حد درجہ عمدہ اور نفیس ہے۔ سرورق کی جاذبیت اور کشش نے اس کے حسن میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔ اس اہم کاوش کے لیے ڈاکٹر چمن آرا خاں واقعی نہ صرف مبارکباد کی مستحق ہیں بلکہ مستقبل میں اس سے بہتر کی توقع ہے۔

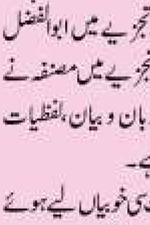

گلدستہ آزاد

مصنف: ڈاکٹر عبدالعزیز عرفان

صفحات: 128، قیمت: 100 روپے، سنہ اشاعت: 2020

مبصر: ڈاکٹر حمیرا حیات، دہلی یونیورسٹی

ڈاکٹر عبدالعزیز عرفان اردو زبان و ادب کی دنیا میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ اردو ادب کی آبیاری کرتے ہوئے انھوں نے جس محنت و مشقت سے اردو زبان کا دامن وسیع کیا ہے وہ قابل تعریف ہے۔ ان کی تیس کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ یہ کتب ادب اطفال، تانیثی ادب، تراجم، تاریخ و تحقیق اور تعلیمی و ادبی موضوعات پر مشتمل ہیں۔

'گلدستہ آزاد' مولانا ابوالکلام آزاد پر مختلف اوقات میں تحریر کردہ مضامین کا مجموعہ ہے، جس میں سولہ مضامین مولانا آزاد کی ادبی، سماجی، سیاسی اور ذاتی زندگی کے متعلق ہیں۔ کتاب کے آخر میں مولانا ابوالکلام کی نعت، شورش کاشمیری کی نظم بعنوان 'ابوالکلام آزاد' اور شجرہ نسب مولانا آزاد پیش کیا گیا ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی شخصیت، علمی و ادبی زندگی پر خامہ فرسائی کرنا آسان کام نہیں ہے۔ مگر مصنف نے 127 صفحات کی چھوٹی سی کتاب میں مولانا کی ادبی و سیاسی زندگی کو پیش کر کے اہم کام انجام دیا ہے۔ بقول مصنف ''مقصد تحریر بھی یہی ہے کہ مولانا آزاد کے حالات زندگی اور ان کی خدمات کا تعارف کرواتا ہے، نئی نسل تحریک آزادی ہند کے مجاہد کے کارہائے نمایاں سے روشناس ہو جائے، وہ ایک ہمہ گیر شخصیت کے بھی مالک تھے، ان کے اوصاف پر روشنی ڈالے تاکہ نوجوان نسل متعارف ہو جائے' ان ہی مقاصد کے مدنظر ناچیز نے قلم اٹھایا ہے''۔

بلاشبہ مصنف کی یہ کوشش کافی حد تک کامیاب نظر آتی ہے۔ کتاب میں موجود ہر مضمون کی اپنی اہمیت ہے۔ مصنف نے مولانا کی زندگی کے ہر پہلو کو موضوع کی مناسبت سے پیش کیا ہے۔ ابوالکلام آزاد کی زندگی کے حالات، ابتدائی تعلیم کے حوالے سے باب اول بعنوان 'مولانا ابوالکلام آزاد' میں ہمیں ان کی زندگی کا مختصر سا خاکہ مل جاتا ہے۔ ایک 'مولانا ابوالکلام آزاد اور ان کا مطالعہ' ہے، جو ممبئی ماہنامہ گل بوٹے میں بچوں کو مطالعے کا شوق دلانے کے لیے لکھا گیا تھا۔ اس مضمون میں ابوالکلام آزاد کے مطالعے کا شوق کے لیے کی گئی کوششیں، لکھنے پڑھنے کی عادات کو سادہ و سلیس الفاظ میں پیش کیا گیا ہے۔ اگلے باب میں ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد میں مولانا کو ایک عظیم مجاہد آزادی کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ اس باب میں آزادی تحریک میں مولانا کا رول اور ان کی ادبی کاوشوں کے علاوہ قید و بند میں اٹھائی گئی صعوبتوں کو مقام، تاریخ و سال کو تفصیل سے پیش کیا گیا ہے۔ اس کے بعد دو مضامین آزادی کی تحریک اور اردو صحافت کے سفر کو پیش کیا گیا ہے۔ اگلا مضمون بعنوان 'مولانا ابوالکلام آزاد کی یادگار تفسیر ترجمان القرآن' ہے، جس میں مولانا کے ذریعے قرآن کے ترجمے و تفسیر کے بارے میں معلومات فراہم کی گئی ہیں۔

'مولانا ابوالکلام آزاد اور غبار خاطر' کتاب کا اگلا اور اہم مضمون ہے۔ غبار خاطر خطوط کا مجموعہ ہے جو ان کی اسیری کے دوران قلعہ احمد نگر میں قلم بند کیے گئے۔ ان خطوط میں زندگی کے حالات، ذاتی تاثرات انسانی تجربات و مشاہدات اور مطالعات، یونانی فلسفہ، انانیت ادب، قید و بند کی زندگی، نظریات فن موسیقی اور فلسفیانہ خیالات ملتے ہیں۔ بلاشبہ یہ خطوط حسیاتی ادب میں ایک خاص قدر و منزلت کے حامل ہیں۔ اگلا مضمون 'مولانا ابوالکلام آزاد اور تذکرہ' ہے۔ یہ مولانا کی خود نوشت سوانح عمری ہے۔ جس میں مصنف نے تذکرہ لکھنے کا سبب اور وجوہات بتاتے ہوئے اس کی خصوصیات کو بھی قلم بند کیا ہے۔ کتاب میں اگلے چھ مضامین جن میں ابوالکلام آزاد کا نظریہ تعمیر ملک، الہلال پر ایک اجمالی نظر، دوسری گرفتاری اور قول فیصل، مولانا ابوالکلام آزاد کا بچپن: چند یادیں ہیں۔ یہ سب ہی مختصر مگر معلوماتی مضامین ہیں۔ الہلال پر ایک اجمالی نظر ایک اہم مضمون ہے۔ جس میں الہلال جو کہ ابوالکلام کا ہفتہ وار اخبار ہے۔ جس کا اردو صحافت میں اہم مقام ہے۔ مصنف نے الہلال کا اجمالی جائزہ لیتے ہوئے اس کی تاریخ، اشاعت، مقاصد، مجموعی شماروں کی فہرست کو پیش کیا ہے۔ الہلال کی اہمیت و افادیت کو جاننے کے لیے ان کا یہ مضمون بہت اہمیت کا حامل ہے۔

کتاب کا اسلوب سادہ اور سلیس ہے۔ زبان بہت آسان اور صاف ہے۔ مصنف نے مشکل الفاظ سے پرہیز کیا ہے۔ پڑھتے ہوئے کوئی دشواری نہیں پیش آتی

ہے۔ کیونکہ سبھی مضامین کا مقصد ابوالکلام آزاد کی شخصیت کو نئی نسل سے روشناس کرانا ہے۔ لہٰذا ایک بات کا ذکر بار بار آنے سے قاری کو اکتاہٹ محسوس ہوسکتی ہے۔ مختصر یہ کہ جو قاری مولانا ابوالکلام آزاد کے تعارف اور ان کی زندگی کے مقاصد اور ادبی زندگی کو مختصر طور پر جاننا چاہتا ہے وہ اس کتاب سے فیض حاصل کرسکتا ہے۔

سفینۂ ادب

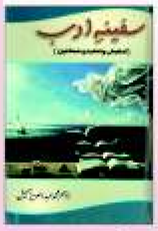

مصنف: ڈاکٹر محمد عبدالعزیز سہیل

صفحات: 192، قیمت: 250 روپے، سنہ اشاعت: 2020

ناشر: روشان پرنٹرس، نئی دہلی

مبصر: محسن خان، 19-3-294/264/96/A

محبوب کالونی، وٹے پلی، حیدرآباد، تلنگانہ۔ 500053

دورِ حاضر کے نوجوان قلمکاروں میں اردو زبان وادب کے فروغ کے لیے سنجیدہ طور پر جدوجہد کرنے والوں میں علاقہ تلنگانہ کے ایک معتبر قلمکار ڈاکٹر عبدالعزیز سہیل کا نام بھی شامل ہے۔ جو پیشہ درس وتدریس سے وابستہ ہیں، ساتھ ہی اردو زبان وادب کے فروغ میں منہمک نظر آتے ہیں۔ اب تک ان کی دس کتابیں (ادبی نگینے، ڈاکٹر شیلا راج کی تاریخی وادبی خدمات، سماجی علوم کی اہمیت 'مسائل اور امکانات'، میزان نو، مولوی محمد عبدالغفار حیات وخدمات، دیار ادب، رونق ادب، فکر نو، مضامین ڈاکٹر شیلا راج، نظم ونسق عامہ میں ابھرتے رجحانات) شائع ہوچکی ہیں۔ 'سفینۂ ادب' ڈاکٹر محمد عبدالعزیز سہیل کی گیارہویں تصنیف ہے جو تحقیقی وتنقیدی مضامین پر مشتمل ہے۔

ڈاکٹر عزیز سہیل نے اس کتاب میں اپنی بات کے عنوان سے کتاب کے موضوعات کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ''مختلف موضوعات پر منعقد ہونے والے سیمناروں میں حصہ لیتا رہا جس کے نتیجے میں میرے قلم میں کچھ پختگی پیدا ہونی شروع ہوئی، تحقیقی وتنقیدی شعور بیدار ہوا اور میرے قلم سے دس تصانیف کی تخلیق انجام پائی۔''

اس کتاب کو انھوں نے 2 حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ کتاب کے پہلے حصے کا پہلا مضمون 'کلام اقبال اور قرآن' کے عنوان سے شامل ہے۔ اس مضمون میں ڈاکٹر عزیز سہیل نے قرآن کے پیغام کو شاعر مشرق علامہ اقبال کے حوالے سے پیش کیا ہے اور لکھا ہے کہ علامہ اقبال نے اپنی شاعری کے ذریعے قرآن کے پیغام کو زندہ جاوید کردیا۔ علامہ اقبال کی فکری اساس قرآن مجید ہے، ان کی فکر کا محور قرآن ہے، ان کی سوچ کا مبدا قرآن ہے۔

زیر نظر کتاب کے پہلے حصے کا دوسرا مضمون شہنشاہ رباعیات امجد حیدرآبادی کے عنوان سے شامل ہے۔ 'امجد حیدرآبادی کی شاعری اور قرآن وحدیث' عنوان کے تحت مصنف نے لکھا ہے کہ حضرت امجد حیدرآبادی نے قرآن مجید کی عظمت اور ہدایت پر کئی ساری رباعیاں لکھی ہیں۔ امجد حیدرآبادی کی رباعیات قرآن وحدیث کی تعلیمات پر مشتمل ہیں۔

اس کتاب میں شامل تیسرا مضمون 'عصر حاضر میں بچوں کا ادب اور بچوں کے رسائل ایک جائزہ' ہے جس میں مصنف نے بچوں کے ادب پر تفصیلی طور پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں ''دورِ حاضر میں کمپیوٹر ٹکنالوجی اور مختلف گیمس نے بچوں کو مشغول کر رکھا ہے ایسے میں والدین کا فریضہ ہے کہ وہ اپنی اولاد کو اردو زبان وادب سے واقف کروائیں۔'' اس مضمون میں ہندوستان سے شائع ہونے والے مختلف بچوں کے ادبی رسائل کا بھرپور تذکرہ کیا گیا ہے۔

کتاب کا چوتھا مضمون 'آصف جاہی حکمرانوں کی رواداری (ڈاکٹر شیلا راج کے حوالے سے)' پر ہے۔ جس میں حیدرآباد دکن کے آصف جاہی حکمرانوں نے اپنی اپنی حکومت میں رواداری قومی یکجہتی کو کس طرح برقرار رکھا ہے اس سے متعلق مختلف واقعات کو حوالوں کے ذریعے پیش کیا ہے۔ ساتھ ہی آصف سابع میر عثمان علی خان نے بلالحاظ مذہب وملت کس طرح مختلف کالجوں اور یونیورسٹیوں اور دیگر تعلیمی اداروں کی مدد کی اس پر بھی تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔

زیر نظر کتاب کا پانچواں مضمون 'حیدرآباد کے کائستھ خاندان کے چند غیر مسلم شعرا' کے عنوان سے شامل ہے اس مضمون میں حیدرآباد کے ایک کائستھ خاندان نے کس طرح آصف جاہی عہد میں اردو کی بے لوث خدمت کی ہے اس کو بیان کیا گیا ہے۔

اس کتاب میں شامل چھٹا مضمون 'تلنگانہ میں اردو کا فروغ، مسائل اور امکانات' ہے جس میں ریاست تلنگانہ میں اردو کے فروغ کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ساتھ ہی مختلف تجویز پیش کی گئی ہے۔ ساتواں مضمون 'اردو یونی کوڈ سسٹم اور چند نمائندہ ویب سائٹس ایک جائزہ' شامل ہے۔ یہ ایک اہم اور عصری موضوع ہے۔ اس مضمون میں یونی کوڈ کی مدد سے گوگل سرچ انجن میں کس طرح ہم اردو میں مواد کو تلاش کرسکتے ہیں بتایا گیا۔ ساتھ ہی مختلف ویب سائٹ کا تفصیلی تعارف پیش کیا گیا ہے جن میں ریختہ، ہماری ویب ڈاٹ کام، مضامین ڈاٹ کام، جہان اردو ڈاٹ کام، اردو شعر وسخن شامل ہیں۔ مذکورہ ویب سائٹس کی اردو خدمات کو اجاگر کیا گیا ہے۔

کتاب کے پہلے حصے میں تبصرہ اور تبصرہ نگاری، مجری ادب، برطانیہ اور حبیب حیدرآبادی، رپورتاژ نگاری کا فن اور عبدالرحیم نشتر کی رپورتاژ نگاری، رپورتاژ نگاری میں خواتین قلمکاروں کی خدمات اور اردو شاعری اور عید کتاب کے عنوان سے دیگر مضامین شامل ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب کے حصہ دوم میں 'امجد حیدرآبادی حیات اور شخصیت'، 'عظیم شاعر واعلیٰ فنکار: مضطر مجاز'، 'پیکر خلوص جناب حلیم بابر'، 'بلبل دکن پروفیسر فاطمہ پروین: ایک مطالعہ'، 'ڈاکٹر سروشہ نسرین قاضی: ایک مطالعہ'، 'فروغ اردو کے لیے ٹیکنالوجی کا استعمال اور ڈاکٹر محمد اسلم فاروقی کی خدمات' چہرہ چہرہ آئینہ عبداللہ ندیم، پر مضامین شامل ہیں۔ یہ تمام مضامین موجودہ دور میں اردو کی خدمت کرنے والی شخصیات کو خراج تحسین ہے۔

ڈاکٹر عزیز سہیل کی یہ تصنیف اردو ادب میں ایک نمایاں اضافہ ہے، امید ہے کہ عزیز سہیل کی اس کتاب کو اردو حلقوں میں پذیرائی حاصل ہوگی۔

فکشن

منزل بے نشان

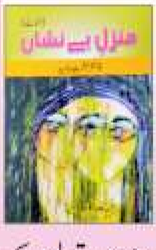

مصنفہ: ڈاکٹر عشرت ناہید

صفحات 192، قیمت: 350 روپے، سنہ اشاعت: 2020

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: فرح جبیں، ریسرچ اسکالر، شعبہ اردو

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، لکھنؤ کیمپس

'منزل بے نشان' ڈاکٹر عشرت ناہید کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے۔ مصنفہ درس وتدریس کے پیشے سے منسلک ہونے کے ساتھ ساتھ فکشن نگاری کی دنیا میں بھی مستحکم شناخت قائم کرچکی ہیں۔

افسانوی مجموعہ 'منزل بے نشان' سترہ افسانوں اور دو افسانچوں پر مشتمل ہے۔ ان افسانوں کے مطالعے سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ بیشتر افسانوں کا موضوع عورت ہی ہے۔ ان کے افسانوں میں ادنیٰ اور اعلیٰ دونوں طبقوں کی خواتین کو بطور موضوع منتخب کیا گیا ہے۔ کہانیوں میں ممکن حد تک عصری زندگی کے مسائل، بھوک وافلاس، جہالت، تشدد، بے انصافی، زیادتی اور جنسی استحصال کو پیش کیا گیا ہے۔ مصنفہ نے بیشتر افسانوں میں حساس نسائی وجود کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ ڈاکٹر عشرت ناہید اپنے افسانوں کے موضوعات کا سبب بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

''کہانیاں تو چاروں طرف بکھری پڑی تھیں، طبیعت کی حساسیت کی وجہ سے دل ہر درد پر تڑپ اٹھتا تھا۔ عورت ہونے کے ناطے خاص طور سے عورت کے مسائل، اس کی مظلومیت ہمیشہ ہی دل کو افسردہ کیا کرتی تھی۔ جب افسانہ لکھنے کی غرض سے نظر دوڑائی تو وہی کہانیاں مجسم ہوکر پکارنے لگیں کہ ہمیں بیان نہ کروگی تو کون کرے گا؟''

اس افسانوی مجموعے کے مرکزی افسانہ 'منزل بے نشان' میں مصنفہ نے ازدواجی زندگی کے متعلق عورتوں کی آرزوؤں کو موثر انداز میں بیان کیا ہے۔ افسانہ 'سہیلی' ایک ایسی مظلوم عورت کی درد بھری کہانی ہے جو بانجھ نہ ہوتے ہوئے بھی بانجھ کہلائی گئی ہے۔ اس میں سوکھی ندی کو بطور علامت پیش کیا گیا ہے۔ اقتباس دیکھیں:

''زمیں نمی کھودے تو بھی الزام اسی کو کہ بنجر ہوگئی۔

بنجر! یہ لفظ ایک ایسی دنیا میں لے جاتا جہاں دور دور تک کوئی نہ ہوتا بس لق و دق صحرا جہاں وہ بھٹکتی رہتی اور سوچتی کہ اپنے بنجر ہونے کی کیا وہ تنہا ذمے دار ہے؟

مجموعے میں شامل افسانے لہولہو افسانہ، سائبان اور کھچن جنسی استحصال پر لکھے گئے ہیں۔ ان افسانوں میں مرد کے اس روپ کو بیان کیا گیا ہے جب وہ رشتوں کے تقدس کو پامال کرتا ہے۔ افسانہ 'سائبان' میں مصنفہ مرد و عورت کو آسمان اور زمین سے تعبیر کرتے ہوئے کہتی ہیں'' ...... یہ آسماں کے بدلتے روپ، یہ نیلا امبر کیسے کیسے ڈراونے روپ لے کر سامنے آتا رہتا ہے، اسے تو کسی رشتے کے تقدس کا احساس ہی نہیں۔'' (ص 132)

لیکن افسانے کے اختتام پر مرکزی کردار کو اس کا حقیقی 'سائبان' مل جاتا ہے۔ افسانوی مجموعے میں شامل دو افسانے ''کچھ ایسے بہار آئی' اور 'فیصلے دل کے' طالب علمی کے زمانے میں لکھے گئے رومانی افسانے ہیں۔ افسانہ 'فیصلے دل کے' میں امور خانہ داری کو موضوع بنایا گیا ہے۔ افسانہ 'کسک' اور افسانچہ 'آنکھیں' Fantacy انداز میں تحریر کی گئی نمایاں کہانیاں ہیں۔ افسانوی مجموعے میں شامل 'سنگ تراش' علامتی پیرائے میں لکھی گئی ایک منفرد تخلیق کہی جاسکتی ہے۔ افسانہ 'مجھے یقین ہے' سماجی موضوع پر لکھی گئی، قاری کو مبہوت کرنے والی ایک درد بھری کہانی ہے۔

اس طرح مجموعے میں شامل دیگر افسانے میں صنف نازک کو سچے عشق کی تلاش ہے تو کسی میں ظاہری طور پر چاند کی طرح خوبصورت اور فلسفیانہ گفتگو کرنے والی عورت حقیقت میں گرہن زدہ ہے۔ ان کے ساتھ ہی عصری دور کی عورت کے ایک نئے روپ کو بھی موضوع بنایا گیا ہے جہاں عورت نہیں بلکہ مرد مظلوم ہے۔ افسانوی مجموعے میں شامل بیشتر افسانے اپنے عہد کی حقیقی اور تانیثی مسائل کی عمدہ تصویر نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹر ریاض توحیدی کتاب کا معروضی جائزہ پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ'' چند فنی اور لسانی سقم کو چھوڑ کر ...... ڈاکٹر عشرت ناہید کے افسانوی مجموعہ 'منزل بے نشان' میں شامل افسانے فنی برتاؤ اور فکری و موضوعاتی پیش کش کا اچھا تاثر چھوڑ جاتے ہیں۔ خصوصی طور پر تانیثی نقطہ نگاہ سے دیکھیں تو جو افسانے تانیثی مسائل و موضوعات پر تخلیق ہوئے ہیں وہ موضوع، پلاٹ اور کردار نگاری میں کامیاب افسانے دکھائی دیتے ہیں۔'' (ص 18)

ڈاکٹر عشرت ناہید نے اپنے افسانوں میں ثقیل جملوں سے حتی الامکان اجتناب کرتے ہوئے عام فہم اور بول چال کی زبان کو ہی استعمال کیا ہے۔ افسانوں میں اسلوب نگارش اور منظر نگاری اس انداز میں پیش کی گئی ہے کہ قاری کو افسانہ پڑھتے ہوئے بوریت کا احساس نہیں ہوتا۔ افسانوں کو مزید دلچسپ بنانے کے لیے واقعات کی مناسبت سے بعض جگہ اشعار بھی اس انداز سے پیش کیے گئے ہیں کہ کہانی کا تسلسل اور قاری کا تجسس دونوں ہی اپنی جگہ قائم رہیں۔

متذکرہ افسانوی مجموعہ 'منزل بے نشان' اشاعت و طباعت کے ساتھ ساتھ سرورق کے لحاظ سے بھی جاذب نظر ہے۔ امید ہے کہ علمی و ادبی حلقے میں ڈاکٹر عشرت ناہید کے افسانوں کو خاطر خواہ پزیرائی ملے گی۔

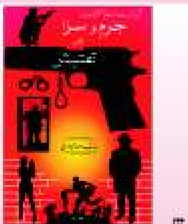

جرم وسزا اور تفتیش

مصنف: سالک دھامپوری

صفحات: 272، قیمت: 168 روپے،

ناشر: جے پی ایس پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی 25

مبصر: ثمرین، ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ

'جرم وسزا اور تفتیش' کے مصنف مشتاق احمد سالک ہیں جو قلمی نام سالک دھامپوری سے مشہور ہیں۔ ان کی کئی کتابیں اردو ادب کے افق پر روشن ہوچکی ہیں جو شاعری، طب، صحافت اور افسانہ وغیرہ سے متعلق ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب 'جرم وسزا اور تفتیش' چند واقعات ہیں جو نہ صرف مستند ہیں بلکہ ایک انسپکٹر کی ڈائری سے ماخوذ ہیں۔ مزید یہ کہ اس کتاب میں یہ بات نئی نظر آتی ہے کہ اس میں قدیم و جدید دور کی تحقیقات اور کارکردگی کے فرق کو پیش کیا گیا ہے۔ پہلے پولیس کا عملہ کم افراد پر مشتمل ہوتا تھا جس کے سبب کام دیر سے ہوتا تھا لیکن بہتر، اچھا اور ایمانداری سے ہوتا تھا مگر آج کے دور میں جتنے زیادہ پولیس اہلکار ہیں اور آمدورفت کے ذرائع موجود ہیں، جدید ٹیکنالوجی ہے جس سے جرم کی تفتیش میں آسانیاں پیدا کی جاسکتی ہیں اور ہوتی ہیں لیکن پھر بھی جرم کی تفتیش کا کیا حال ہے وہ آپ سب بھی بخوبی جانتے ہیں۔

موصوف نے مذکورہ کتاب میں یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ خواہ جرم کتنا ہی سنگین ہو اور اس کو کتنے ہی پوشیدہ اور خفیہ طریقے سے کیوں نہ انجام دیا جائے لیکن قانون کے محافظ اگر پوری ایمانداری اور جدوجہد کے ساتھ اس کا سراغ لگانا چاہیں تو یقیناً انھیں کامیابی حاصل ہوگی اور دوسری بات یہ واضح ہوگئی کہ جرم کرنے والے اگر زیادہ ہوں گے تو بہت جلد گرفت میں آجائیں گے اور مجرم اگر اکیلا ہوگا تو وہ بہت سی دشواریاں پیدا کرسکتا ہے جیسا کہ اس کتاب کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے۔ سالک دھامپوری کی جرائم پر مبنی کہانیوں میں جو چپ رہے گی زبانِ خنجر، جذبہ انتقام، پرانا قبرستان اور 'ڈھانچہ' بھی نادر کہانیوں میں سے ہیں۔ یہ کہانیاں انقلاب اور اردو ٹائمز میں شائع ہوئی تھیں۔ ان میں سالک دھامپوری نے قتل کے واقعات کو خوش اسلوبی اور افسانوی انداز کے ساتھ بڑے سلیقے سے پیش کیا ہے۔

یہ کتاب مشہور اداکار اور محب اردو ڈاکٹر ٹام آلٹر کی خواہش پر تحریر کی گئی تھی لیکن جب یہ منظر عام پر آئی تو ٹام آلٹر اس دنیا سے رخصت ہوچکے تھے۔ کتاب میں شامل کہانیاں کافی طویل ہیں جو آج کی کہانی اور افسانوں سے بالکل علیحدہ معلوم ہوتی ہیں۔ افسانہ 'لاش اور چوڑیاں' کافی طویل افسانہ ہے اور مذکورہ کتاب میں بیشتر افسانے طویل ہیں، جن کے مطالعے کے وقت قاری کو بوجھل پن محسوس ہونے لگتا ہے کیوں کہ ان افسانوں میں بے جا طوالت موجود ہے اور کئی باتوں اور واقعات کو بے وجہ پیش کیا گیا ہے، جن کا ذکر ناگزیر معلوم ہوتا ہے۔ 'لاش اور چوڑیاں' افسانے میں رفیق عرف فیقا کے کردار کے قتل اور اس کی تفتیش کے واقعات غیر ضروری ہیں جن کی اس کہانی میں کوئی ضرورت نہیں ہے۔ کہانی تو تفتیش کے متعلق ہی ہے مگر اس میں کئی جگہوں پر ایسے واقعات کا بیان کیا گیا ہے جو کہانی میں صرف بوجھل پن ہی پیدا کرتے ہیں نہ کہ خوبصورتی اور تفتیش کی رو سے بھی ان واقعات کا ذکر ناگزیر ہے۔

افسانہ 'احسان کا بدلہ' میں بھی یہی بے جا طوالت پائی جاتی ہے۔ یہ افسانہ ص 11 سے شروع ہوکر ص نمبر 67 تک چلتا ہے جس کا مطالعہ کرتے کرتے قاری اکتا جاتا ہے لیکن افسانے میں کوئی جان نظر نہیں آتی اور اکثر و بیشتر قارئین اسے دوران مطالعہ ہی چھوڑ دیں گے کیونکہ انسان کہانی یا افسانہ بھی اسی لیے پڑھتا ہے تاکہ وہ اس سے حظ اٹھا سکے اور لطف اندوز ہو مگر یہی کہانی جب اسے بور کرنے لگے گی تو وہ اکتا جائے گا۔ اسی طرح افسانہ 'خودکشی یا قتل' بھی ایک طویل افسانہ ہے اس کے علاوہ افسانہ 'ابراہیم موچی کا قتل' کی بات کریں تو اس افسانے میں ابراہیم موچی کا قتل تو ضرور ہوا ہے لیکن اس کی

تفتیش کے معاملات کو پڑھ کر یہ بالکل محسوس نہیں ہوتا کہ یہ افسانہ تفتیش کے معاملات پر مبنی ہے بلکہ بے وجہ کا ایک غیر دلچسپ موضوع لے لیا گیا ہے جس کے مطالعے سے کم از کم مجھے تو یہی اندازہ ہوا کہ اسے پڑھنا بے وجہ وقت ضائع کرنا ہے۔

سالک دھامپوری نے سادہ و سلیس زبان میں اس کتاب کو تحریر کیا ہے۔ الفاظ گنجلک نہیں ہیں بلکہ عام انسان کی زبان سے بولے جانے والے الفاظ ہیں۔ کہیں کہیں انھوں نے انگریزی زبان کے الفاظ کا استعمال بھی کیا ہے جیسے اسٹارٹ، پریشر، کراس، کوریج گراؤنڈ وغیرہ۔ سالک دھامپوری کی زیر تبصرہ کتاب ادب کے طالب علم کے لیے تفتیشی معاملات وواقعات کے حوالے سے اہم ہے لیکن جہاں تک مجھے لگتا ہے یا میرا مطالعہ ہے کہ اگر ان افسانوں مین تفتیش کے طریقہ کار پر توجہ دی جاتی اور ساتھ ہی افسانوں کو بے جا طوالت سے محفوظ رکھا جاتا تو شاید کتاب کی اہمیت بڑھ جاتی۔

انٹرویوز

دوبدو (ادبی مکالمہ)

مصنف: انور آفاقی

صفحات: 176، قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت: 2021

ناشر: ہدیٰ منزل، راجتولی (بھیگو)، دربھنگہ۔ 846004 (بہار)

مبصر: مجیر احمد آزاد

محلّہ فیض اللہ خان، حامد کالونی، دربھنگہ 846004 (بہار)

انٹرویو شخصیت کو جاننے کا ایک اہم وسیلہ اور ادب وصحافت کا قابل ذکر حصہ ہے۔ انٹرویو دینے والے کے بارے میں معلومات، افکار ونظریات، فرد کے کارنامے نیز عصری منظر نامہ اس کے محتویات میں شامل ہوتے ہیں۔ بعض دفعہ یہیں سے بحث و مباحثے کی راہیں نکل آتی ہیں۔ اردو میں مصاحبہ نگاری یا انٹرویو کی روایت موجود ہے اور اس سلسلے کی ایک کڑی کا اضافہ انور آفاقی نے 'دوبدو' کے نام سے کیا ہے۔ انور آفاقی شاعر و افسانہ نویس ہیں اور انٹرویوز میں بھی خوب دلچسپی لیتے ہیں۔ 'لمسوں کی خوشبو' (شاعری)، 'دیرینہ خواب کی تعبیر' (سفرنامہ کشمیر)، 'نئی راہ نئی روشنی' (افسانوی مجموعہ)، 'پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی سے گفتگو' (انٹرویو) ان کی گوناگوں ادبی کاوشوں کا سرنامہ ہیں۔

یہ کتاب اردو کے 9 قلم کاروں سے لیے گئے انٹرویو کی کتابی صورت گری ہے۔ پروفیسر آفتاب احمد آفاقی، خلیق الزماں نصرت، ڈاکٹر سلیم خان، شمیم قاسمی، پروفیسر عبدالمنان طرزی، مجیر احمد آزاد، ڈاکٹر منصور خوشتر، نورشاہ اور وحشی سعید سے مکالمے کو شخصی احوال و کوائف اور کارنامے کے ساتھ ساتھ اصناف ادب کی صورت حال سے آراستہ کیا گیا ہے۔

اردو غزل اور اردو افسانے میں کس کا اثر دیرپا ہوتا ہے؟، جدید اور تجریدی افسانے کی مخالفت، حالیہ دنوں لکھے جارہے افسانوں کی سمت ورفتار، اردو تنقید کا بدلتا ہوا منظر نامہ، فکشن تنقید کا رویہ، آزاد نظم اور آزاد غزل کی فنی حیثیت.....ایسے سوالات ہیں جو پروفیسر آفتاب احمد آفاقی سے پوچھے گئے ہیں اور جوابات مفصل اور متنوع ہیں۔ خلیق الزماں نصرت نے زندہ جاوید زبان اردو اور نئی نسل کی کاوشوں پر کارآمد گفتگو کی ہے۔ ناول نگار اور افسانہ نویس سلیم خان نے اردو ادب کے علاوہ ملک کی سیاست سے جڑے مکالمے کو صداقت کا پیرہن عطا کیا ہے۔ شمیم قاسمی سے ادبی مصاحبہ کے ذریعے ان کے سلسلے کی کئی اہم اور یادگار باتیں سامنے لانے میں انور آفاقی کامیاب ہوئے ہیں۔ کسی بھی تخلیق کار کے باطن سے مکاشفہ آسان نہیں ہوتا لیکن یہیں انٹرویو لینے والے کی استعداد کا امتحان ہوتا ہے کہ وہ کس طرح کے سوالات سے مخفی مگر کارآمد باتیں سامنے لے آئیں۔ یہ مرحلہ بھی انھوں نے آسان کرلیا ہے۔ بزرگ شاعر پروفیسر طرزی نے انٹرویو میں بھی اپنی انفرادیت قائم رکھی ہے اور منظوم کاوشوں کو حوالے کیا ہے۔ جواں سال شاعر وادیب منصور خوشتر نے اردو زبان اور معاش کے مسئلے پر اس انٹرویو میں خوش اسلوبی سے گفتگو کی ہے۔ مشہور فکشن نگار نورشاہ اور وحشی سعید سے گرچہ کم لیکن اہم سوالات پوچھے گئے ہیں۔

سوالات قائم کرتے ہوئے جہاں فن کار کو جاننا مقدم رکھا گیا ہے وہیں مباحث کے روزن بھی وا رکھے گئے ہیں۔ بعض سوالات علم وادب کے میدان کی کثافتوں کو ہمارے سامنے لاتے ہیں اور مردم شناسی کی راہ ہموار کرتے ہیں۔ پروفیسر آفتاب احمد آفاقی نے لکچرر کی تقرری میں ہونے والی خامیوں کا ذکر کرتے ہوئے علاقائی عصبیت کو واضح طور پر نشان زد کیا ہے۔ انھوں نے اس ادبی مکالمے کے ایک سوال کے جواب میں لکھا کہ ''پہلی بار مجھے اندازہ ہوا کہ جسے ہم ممتاز ادیب، شاعر اور دانشور کا خطاب دیتے ہیں، وہ کتنا چھوٹے اور پست قد ہیں۔ وہاں علم وادب کے علاوہ سب فروغ پاتے دیکھا..... گالی گلوچ، گریبان دری، مار پیٹ، کیس مقدمہ وغیرہ'' کا تعلق ان کی حق گوئی اور بیباکی ہے۔ اسی طرح پروفیسر عبدالمنان طرزی نے سند اعزاز وانعام ملنے کی جو روداد بیان کی ہے اس سے اداروں کی اصلیت سامنے آتی ہے۔

'اپنی بات' میں مصاحبہ کار انور آفاقی نے انٹرویو کے سلسلے میں جو باتیں کہی ہیں ان کے ذریعے ہم اس کتاب کے مقصد اور افادیت کو آنک سکتے ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے کہ ''مکالمے کی روایت کوئی نئی نہیں ہے۔ زمانہ قدیم میں افلاطون کے مکالمے مشہور ہوئے بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ مکالمے کی روایت بعض حوالوں سے اس سے بھی پہلے سے ملتی ہے۔ یہ وہ روایت ہے جس کے توسط سے ہم کسی ادیب، شاعر، دانشور اور فن کار کے اندر جھانکنے کی کوشش کرتے ہیں، ان سے تبادلہ خیال کرتے ہیں جس کے نتیجے میں بہت ساری ایسی باتیں سامنے آتی ہیں جس سے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملتا ہے اور بعض دفعہ ذہنوں پر پڑے ہوئے تالے کھلتے ہیں اور پھر بصیرت وآگہی کی ایسی دنیا سامنے آتی ہے جس سے نئی نسل مستفیض ہوتی ہے۔''

کتاب میں شامل ڈاکٹر عبدالحی کا تحریر کردہ مقدمہ بعنوان 'انور آفاقی کے انٹرویو: ایک جائزہ' انور آفاقی اور ان کے انٹرویوز کے ان پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے جن سے مزید گفتگو کے مراحل کو سمجھا جا سکے۔ مشمولہ انٹرویوز کئی لحاظ سے اہمیت کے حامل ہیں کہ یہاں مختلف عمر اور اصناف سے وابستہ اشخاص نے بے باکی سے اپنی باتیں رکھی ہیں۔ انٹرویو لینے والے کو اس سے نہ تو کوئی اکیڈمک فائدہ حاصل کرنا ہے اور نہ ہی کسی گروہ بند اصول کو اپنایا گیا ہے۔ سوالات کے انداز روایتی ہیں لیکن جا بجا ایسے سوالات بھی ہیں جو عصری ادب معیار و مزاج کا پتہ دیتے ہیں۔ شعر وادب کے شائقین اس کتاب سے استفادہ یقیناً کریں گے۔

ڈراما

اشتیاق حسین قریشی کے ڈرامے

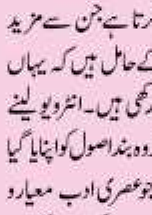

مرتب: ڈاکٹر شمیم احمد

صفحات: 615، قیمت: 347، سنہ اشاعت: 2021

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس

مبصر: ڈاکٹر صبا عنبرین، مکان نمبر 5078، پھاٹک بانس، حوض قاضی، دہلی 6

اردو ادب میں ڈرامے کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ جس طرح اردو کی نثری اصناف میں ناول اور افسانے نے مقبولیت حاصل کی، اسی طرح اردو ڈرامے نے بھی اپنی اہمیت کو درج کرایا ہے۔ اردو ڈرامے کی اپنی روایت رہی ہے اور تخلیقی اعتبار سے بھی ڈرامے پر تحقیقی وتنقیدی کام جاری ہے۔ اسی ضمن میں ڈاکٹر شمیم احمد کی مرتب کردہ کتاب 'اشتیاق حسین قریشی کے ڈرامے' اس بات کی ضامن ہے کہ ادب کے

شیدائیوں میں ڈرامے سے دلچسپی رکھنے والوں کی کمی نہیں ہے۔ یہ کتاب شمیم صاحب کی تحقیقی کاوشوں کا نتیجہ ہے اور ان کی تنقیدی بصیرت کا ثبوت ہے۔ انھوں نے قریشی صاحب کے متفرق ڈراموں کو یکجا کر کے کتابی شکل میں پیش کیا اور اردو ڈرامہ نگاری کے میدان میں ایک اہم اور نمایاں خدمت انجام دی ہے۔ زیر تبصرہ کتاب میں نو ڈرامے شامل ہیں۔ یہ وہ ڈرامے ہیں جو ڈاکٹر اشتیاق کی تحریر ہی نہیں بلکہ اس وقت کے آئینہ دار ہیں جب ملک میں مختلف جہتوں پر رسہ کشی کا سلسلہ جاری تھا۔ ایک طرف ملک میں آزادی کا مطالبہ دن بہ دن زور پکڑ رہا تھا تو دوسری طرف ملک کی سیاست میں زبردست ہیجان برپا تھا۔ ملک کی سیاست دو بڑے بلاکوں میں تقسیم ہو چکی تھی۔ اور سیاست کی اس تقسیم نے لوگوں کی سوچ اور ان کے جذبات و احساسات پر بھی اثر ڈالا تھا۔ بین الاقوامی سطح پر بھی تغیرات کا سلسلہ جاری تھا اور ان تمام حالات نے مل کر انسانی زندگی کو ایک ایسے موڑ پر لا کھڑا کیا تھا جہاں انسان زندگی کے نئے مفہوم سے آشنا ہونے کی کوشش میں تھا۔

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے اخبار الامان میں صحافی کی حیثیت سے کام کیا اور محمد علی جیسی شخصیت سے اپنی صحافت کے لیے داد حاصل کی۔ 1923 میں سینٹ اسٹیفنز کالج سے تاریخ میں بی اے کیا۔ 1928 میں ایم اے اتنی شاندار کامیابی سے کیا کہ انھیں کالج میں ہی بحیثیت لیکچرار تقرری مل گئی۔ اسی دوران انھوں نے اپنے کئی اہم ڈرامے لکھے۔ اس کے بعد تاریخ میں The Administration of the Sultanate of Delhi کے عنوان سے مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔

بنیادی طور پر تاریخ ان کا میدان تھا اس سلسلے میں ان کی تصانیف میں 'سلطنتِ مغلیہ کا نظم و نسق'، 'مغل سلطنت کا بانی: اکبر' اور 'سلطنتِ دہلی کا نظامِ حکومت' جیسی اہم تصانیف شامل ہیں۔ لیکن اردو ڈرامے سے ان کا قلبی تعلق تھا۔ درس و تدریس کے ساتھ ہی انھوں نے اردو ڈرامہ نگاری کو بھی پوری توجہ اور دلچسپی کے ساتھ اپنی ذمے داری سمجھا اور اسے نبھانے کی کوشش بھی کی۔ ان کے ڈراموں میں سماجی و معاشرتی مسائل کے ساتھ مخصوص تاریخی فکر بھی نظر آتی ہے۔ ڈرامے کا تعلق اسٹیج سے ہے اشتیاق حسین قریشی نے اپنے ڈراموں میں اسٹیج کے تقاضوں کو پورا کرنے کی کوشش کی ہے ان کے ڈرامے آسانی کے ساتھ اسٹیج پر پیش کیے جا سکتے ہیں۔ ان کے ڈراموں کے کردار معاشرے سے وابستہ انسانوں کے مسائل کی عکاسی کرتے ہیں۔ 1930 میں ان کا پہلا ڈرامہ 'معلم اسود' تحریر کیا گیا۔ اس کے بعد 'گناہ کی دیوار' لکھا اور اس ڈرامے میں انھوں نے سینٹ اسٹیفنز کالج کے ڈرامیٹک کلب میں ڈرامہ کھیلے جانے کی روایت سے متاثر ہونے کا اعتراف تمہید یہ لکھ کر کیا ہے۔ 1931 میں ہم زاد اور اس کے بعد 1932 میں ان کا مشہور ڈرامہ 'صید زبوں' شائع ہوا۔ 1933 میں 'نقش آخر'، 1934 میں 'نیم شب' اور 1935 میں 'نفرت کا بیج' منظر عام پر آئے۔ 1940 میں مختصر ڈرامہ 'بت تراش' اور 1943 میں 'کٹھ پتلیاں' شائع ہوا۔ یہ نو ڈرامے اس کتاب میں شامل ہیں۔ ڈرامہ معلم اسود میں نفسیاتی جدوجہد کے ساتھ خیر و شر کی کشمکش کو بیان کرنے کے لیے شیطان اور فرشتوں کے کردار بھی پیش کیے گئے ہیں۔ گناہ کی دیوار میں انسانوں کے مکر و فریب کو بیان کیا گیا ہے۔ ہمزاد ایک ایکٹ کا ڈرامہ ہے اس میں رشتہ ازدواج سے منسلک مسائل کو سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے۔ صید زبوں چار ایکٹ پر مبنی ڈرامہ ہے۔ اس ڈرامے میں عورتوں کے استحصال کی روداد کو بیان کرنے کے ساتھ اس کی بے بسی کو بیان کیا گیا ہے ساتھ ہی سماج کے ذریعے کی جا رہی ناانصافی اور معاشرتی ناانصافیوں کے تباہ کن نتائج کی ترجمانی کی گئی ہے اسی ضمن میں ڈرامہ بت تراش کا نام بھی لیا جا سکتا ہے۔ نقش آخر 1857 کے غدر کے حالات پر مبنی ڈرامہ ہے اس ڈرامہ میں نئی اور پرانی تہذیب کی قدروں کا ٹکراؤ بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ہماری قدیم مٹتی ہوئی تہذیب کا نوحہ بھی موجود ہے اور لوگوں کی اس تکلیف کا احساس بھی مل جاتا ہے جو غدر کے وقت دہلی کے لوگوں نے برداشت کی ہوگی۔ ڈرامہ نیم شب میں قریشی صاحب نے پچاس سال بعد کے وقت کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ بنیادی طور پر اس ڈرامے کا موضوع طبقاتی فرق ہے جہاں امیری اور غریبی کے درمیان موجود سماجی و معاشرتی فرق کو واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ اور اس کے لیے اشتراکی حکومت کے قیام کی تمثیل پیش کی گئی ہے۔ ڈرامہ نفرت کا بیج پانچ ایکٹ پر مبنی ڈرامہ ہے اس ڈرامے میں خود غرضی اور مفاد پرستی جیسی سماجی برائیوں کے مضر نتائج کو پیش کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ خود غرضی اور مفاد پرستی جیسی بری عادتیں انسانیت کے لیے تباہ کن ہیں۔ کٹھ پتلیاں پانچ ایکٹ کا ڈرامہ ہے جس میں فلمی دنیا کی چکا چوندھ کے ساتھ اس دنیا کی تلخ حقیقتوں سے بھی روشناس کرایا گیا ہے جہاں یہ بات صحیح معلوم ہوتی ہے کہ ہر چمکنے والی چیز سونا نہیں ہوتی۔

اشتیاق حسین قریشی کے ڈراموں میں آسان اور سادہ زبان استعمال کی گئی ہے ان کے ڈراموں میں کردار اپنی تمام خوبیوں و خامیوں کے ساتھ فطری انداز میں موجود ہوتے ہیں۔ ان کے ڈرامے سماج اور معاشرے کی حقیقت کو ان کی مٹھاس، کڑواہٹ، تلخی اور سچائی کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ اس کتاب کی مدد سے ڈاکٹر اشتیاق احمد قریشی کی ڈرامہ نگاری کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔ ڈاکٹر شمیم احمد نے اس کتاب کو مرتب کر کے اردو ڈرامے کی روایت کی ان گمشدہ کڑیوں کو ملانے میں کامیابی حاصل کی ہے جو نظر کے سامنے ہونے کے باوجود پردۂ خفا میں تھیں۔

شاعری

زمیں چیختی ہے (شاعری)

شاعر: قیصر شمیم

صفحات: 208، قیمت: 250 روپے

ناشر: عرفان گرافکس۔ ہوڑہ

مبصر: ایم نصر اللہ نصر، تین بوس روڈ، شالیمار اپارٹمنٹ، دانش شیخ لین، بوکل تلہ، ہوڑہ 711109

قیصر شمیم بنگال کے موجودہ اردو ادبا و شعرا کی صف میں امام کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان کی حیثیت ادبی دنیا میں مینارِ ادب سے کم نہیں۔ نہایت ہی کم سخن اور گوشہ پسند انسان ہیں۔ اسم بامسمیٰ ہیں۔ پیکرِ اخلاص اور بندۂ اخلاق دونوں ہیں۔ وہ دوستوں کے دوست اور رقیبوں کے بھی رفیق ہیں۔ ان کے حضور دونوں کے سر عقیدت سے جھکتے ہیں۔ کسی سے بغض نہیں رکھتے مگر فاصلہ ضرور رکھتے ہیں اس لیے کہ زندگی کے تلخ تجربات انھیں ایسا کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ ان کی شاعری کا بیشتر حصہ اسی اظہار کا عکس پارہ ہے۔ شاعری چونکہ مشاہداتِ زندگی اور تجرباتِ حیات کا اظہاریہ ہے اس لیے سانحاتِ حیات کے نقوش ان کے اشعار میں ڈھلتے چلے گئے ہیں۔ آنکھ روتی ہے تو سب دیکھتے ہیں لیکن دل روتا ہے تو وہی محسوس کرتا ہے جس کا دل ہوتا ہے۔ قیصر شمیم کی شاعری میں ایسے بیشتر اشعار موجود ہیں جو ان کی ان کہی کہانی کو بیان کرتے ہیں۔ آپ بھی ملاحظہ فرمائیں۔

دنیا تو رنج دیتی رہی بات بات پر — یارائے صبر تو نے دیا، شکر اے خدا
شہرِ منافقت کی فضا کچھ نہ کر سکی — اس زہر سے میں بچ ہی گیا، شکر اے خدا
آنسوؤں کی بوندوں میں کیا تلاش کرتے ہو — دل کی ایک دنیا ہے، اور کیا ہے آنکھوں میں
نہ پوچھ کیسے سفر میں ہے زندگی میری — کہ رنگ کرب ہی شام و سحر میں رہتا ہے

قیصر شمیم کی شاعری ٹھوس شاعری کے زمرے میں آتی ہے۔ ان کی شاعری میں بکھراؤ

نہیں ہے۔ ڈھیر سارے مسائل و مضامین کی آمیزش سے وہ پرہیز کرتے ہیں مگر دوران تخلیق کوئی نیا عنوان آ جائے تو اس سے گریز بھی نہیں کرتے۔ ان کی شاعری میں رومانیت کم واقعیت زیادہ ہے۔ فلسفیانہ خیالات اور سیاسی حالات کے عکس ریزے بھی موجود ہیں۔ روایتی انداز، ترقی پسندی اور جدیدیت کے امتزاج سے ان کی شاعری پر ایک نیا رنگ چڑھ گیا ہے لیکن ان کے رجحان سخن کو کسی ایک خانے میں نہیں رکھا جا سکتا۔ زمانے کے سرد و گرم سے وہ باخبر رہتے ہیں۔ سیاسی سانحات پر ان کی گہری نظر رہتی ہے۔ چند اشعار بطور دلیل ملاحظہ کریں۔

کیوں لیے بیٹھے ہو فرسودہ فسانے اپنے　　ہر نئے دور کے ہوتے ہیں تقاضے اپنے
آندھیاں ڈھونڈنے نکلی ہیں کے شہروں میں　　کیا چراغوں نے بدل رکھے ہیں چہرے اپنے
ملتا ہے جب تو کھل کے ملیں اور کچھ کہیں　　احباب آج چپ نہ رہیں اور کچھ کہیں
قیصر انھیں تو وقت ہی ملتا نہیں کہ وہ　　تم سے ملیں تمہاری سنیں اور کچھ کہیں
کانٹوں کے ساتھ رہنے کی عادت سی ہے ہمیں　　منہ پھیرتے نہیں کبھی اپنے چمن سے ہم

جب ہم قیصر شمیم کی شاعری کا عمیق مطالعہ کرتے ہیں تو ان میں پوشیدہ طلسماتی انداز اور نقش آرائی کا جو اہتمام ملتا ہے وہ بیشک انھیں دوسرے شعرا سے ممتاز و منفرد حیثیت عطا کرتا ہے۔ انسان کے مسائل اور ان کی خستہ ریزیاں، شکست و ریخت، زندگی کی بے معنویت، غیر یقینیت، مہملیت اور اجنبیت کا شدید احساس دلاتی ہیں۔ ان کی شاعری میں تلخی اور شیرینی کے امتزاج و اختلاط سے جو نقوش ابھرتے ہیں وہ سیدھے قاری کے دل میں اتر جاتے ہیں۔ ان کا ایک شعر ان کی شناخت کے لیے کافی ہے۔

ہمارے جسم کو موجیں نگل گئیں قیصر　　کہ ساعتوں کا سمندر بڑے جلال میں تھا

یہ ایک شعر ہی ان کو اردو شعر و ادب میں زندہ و پائندہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔
حالانکہ ان کی شاعری میں ایسے اشعار کی کمی نہیں۔ ان کی حقیقت پسندی تشکیک پرستی پر غالب ہے۔ ان کی تخلیقی آئینہ سازی اور شعوری افکار کا کون قائل نہیں لیکن ان کی گوشہ نشینی ان کی شہرت کی راہ میں حائل ہے۔ انھیں اس سے باہر آنا ہوگا۔ اب قاری کے پاس تلاش و جستجو کا جذبہ نہیں بلکہ اسے اپنے ہونے کا احساس دلانا ہوگا۔ ہمیں بھی قیصر شمیم کی شاعری میں بہت کچھ تلاش کرنا ہے۔ اس خزانے پر جمی وقت کی گرد کو ہٹانا ہوگا اور ان کے گوہر آب دار کو عام کرنا ہوگا۔

خیال میں ہے نیا کیا، یہ دیکھنا قیصر　　اگر زمانہ کسی شے کا انکشاف کرے
عرضِ ہنر میں رکھتے ہیں ہر بات پر نظر　　قیصر خجل نہ ہوں گے کبھی اپنے فن سے ہم
موجِ بلا سے سابقہ کس کو پڑا نہیں　　قیصر ترا سفینہ رواں ہے رواں رہے

زیر مطالعہ شعری مجموعہ قیصر شمیم کی شاعری کا مرقع ہے جس میں غزلیں، نظمیں، رباعیات اور تراجم شامل ہیں۔ میں نے صرف ان کی غزل گوئی کو ہی موضوع بحث بنایا ہے اور اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اس گدڑی میں مختلف اقسام کے گرانقدر لعل پوشیدہ ہیں جن کی قدر و قیمت کا تعین ناقدین شعر و ادب کا کام ہے۔

رسائل و جرائد

رسالہ بازدید

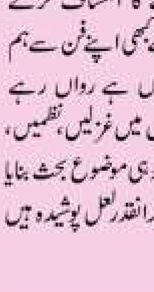

مدیر: مقصود بستوی
صفحات: 126، قیمت فی شمارہ: 150 روپے، زر سالانہ: 600 روپے
رابطہ: S360، آئی ٹی آئی، سد حیشور نگر، جھانسی۔ 284003 (یوپی)
مبصر: محمد اسلام خان، D-64، تھرڈ فلور، ٹھوکر نمبر 8
شاہین باغ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ 110025

اردو کا رسالہ نکالنا کوئی آسان کام نہیں۔ اس پر مستزاد میعاد کی پابندی اور معیار کی پاسداری اس کام کو مزید دشوار بنا دیتی ہے۔ مگر اپنی علمی سنجیدگی، شخصی متانت اور جہد پیہم کی بدولت مقصود بستوی اس کام کو برسوں سے بخوبی انجام دے رہے ہیں۔ 'بازدید' (کتابی سلسلہ) کے نام سے ان کا یہ رسالہ تاریخی شہر جھانسی سے نکلتا ہے۔ زیر نظر رسالہ اس سلسلے کی 14 ویں کڑی ہے۔ مدیر موصوف نے مذکورہ رسالہ کو نہایت محنت اور جاں فشانی کے بعد قارئین کے سامنے پیش کیا ہے، جس کے لیے وہ یقیناً مبارکباد کے مستحق ہیں۔ اردو رسائل کی بھیڑ میں 'بازدید' کا اختصاص یہ ہے کہ وہ مسلکی تعصب، گروہ بندی اور علاقائی عصبیت سے پاک ہے۔ جینوئن قلم کاروں کی تخلیقات اور سنجیدہ و علمی مضامین کی اشاعت رسالہ کی ترجیحات میں شامل ہیں۔ مقصود بستوی کی یہ کوشش نہ صرف قارئین کے ذوق کو جلا بخش رہی ہے بلکہ ادب عالیہ کے لیے بھی افتخار کا سامان بہم پہنچا رہی ہے۔ موضوعات کی نیرنگی اور ترتیب و پیش کش کی خوب صورتی رسالہ کے حسن کو تو دوبالا کرتی ہی ہے، ساتھ ہی یہ سالکان ادب کو متوجہ کرنے میں بھی کامیاب ہے۔

مشمولات کے اعتبار سے رسالے کی فضا علمی ہے۔ اس میں شامل بعض تحریریں انتہائی اہم ہیں جن سے غور و فکر کے نئے دریچے روشن ہوتے ہیں۔ اس حوالے سے پروفیسر ابوالکلام قاسمی کا مضمون 'اردو شاعری کی کلاسیکی شعریات' انتہائی گراں قدر ہے جس میں کلاسیکی ادب پر تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔

اس کے علاوہ اس رسالہ میں شین کاف نظام کا مضمون 'مطابقت، روایت اور فراق' بھی بہت اہم ہے۔ مضمون نگار نے اپنے مضمون میں فراق کی شخصیت کے کئی گوشوں سے پردہ اٹھایا ہے۔ انہوں نے فراق کی شخصیت کو سمجھنے کے لیے فراق ہی کا قول نقل کیا ہے: 'زندگی کا مقصد وہ محنت نہیں، جس سے تاج محل کی تعمیر ہوتی ہے بلکہ اس Aesthetic Sense کو حاصل کرنا ہے، جس نے تاج محل کے خواب کو جنم دیا۔'

پروفیسر اسلم جمشید پوری نے اپنے مضمون میں 2020 میں شائع ہونے والے اہم افسانوی مجموعوں پر اظہار خیال کیا ہے۔ یہ مضمون قاری کا زیادہ وقت لیے بغیر بہت ساری معلومات فراہم کرا دیتا ہے۔ اس لیے یہ مضمون بھرپور معلومات کے ساتھ ساتھ ریسرچ اسکالروں کے لیے ایک قیمتی تحفہ بھی ہے۔ اس مضمون میں 25 افسانوی مجموعوں پر مختصر مگر جامع معلومات پیش کی گئی ہے۔

وطن پرستی اردو ادیبوں اور قلم کاروں کی تخلیقات کا پسندیدہ موضوع رہا ہے اور اس پر مختلف زاویوں سے لکھا جاتا رہا ہے مگر موجودہ دور کی سیاست نے اس کی اہمیت مزید بڑھا دی ہے۔

'بازدید' میں سنجیدہ قارئین کے ذوق کا پورا خیال رکھا گیا ہے تو دوسری طرف قارئین کی فرحت کے لیے بھی اس میں خاصا مواد ہے۔ رسالہ میں غزلیں، نظمیں بھی خاصی مقدار میں دی گئی ہیں۔ واصف فاروقی، مخمور کاکوروی، قمر صدیقی، چندر بھان خیال، خورشید طلب، انجم بارہ بنکوی وغیرہ کی تخلیقات خصوصی طور پر اہمیت کی حامل ہیں۔ شاعری کے علاوہ اسلم جمشید پوری، رضیہ کاظمی، آبیناز جان علی، احسان قاسمی کے افسانے بھی رسالے کی زینت میں اضافہ کر رہے ہیں۔

علمی و ادبی نوعیت کے مضامین اور تخلیقات سے رسالہ خوب سے خوب تر ہو گیا ہے۔ یہ شمارہ ایک طرف اردو کے معتبر شاعر عشرت ظفر کو خراج عقیدت پیش کرتا ہے تو دوسری طرف رسالے میں تحریر بستوی اور صغیر نوری پر خصوصی گوشے بھی شامل کیے گئے ہیں۔ یہ رسالہ طلبہ و اساتذہ دونوں کے لیے یکساں طور پر مفید ہے۔ اردو ادب کے باذوق قارئین کو ایسے رسالوں کو، جن سے علمی تشنگی کی تسکین کے ساتھ ساتھ خیالات و نظریات کی بلند پروازی میں مدد ملے، اپنے مطالعے میں ضرور شامل کرنا چاہیے۔ ■

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں

قومی تعلیمی پالیسی ہندوستانی مزاج واقدار کے مطابق ہے

قومی اردو کونسل میں پروفیسر شعیب عبداللہ کا خطاب

نئی دھلی: ہندوستان کثیر ثقافتوں اور زبانوں کا گہوارہ ہے۔ قومی تعلیمی پالیسی کے تحت تمام ثقافتوں اور زبانوں کے فروغ کے بھرپور مواقع موجود ہیں۔ یہ تعلیمی پالیسی ہندوستانی مزاج واقدار کے مطابق ہے۔ اس تعلیمی پالیسی کے تحت نہ صرف عصری تقاضوں کو پورا کرنے پر توجہ دی گئی ہے بلکہ ہمہ جہتی اور خودشناسی پر بھی زور دیا گیا ہے۔ اسی کے ساتھ قومی تعلیمی پالیسی کا مقصد قومی یکجہتی اور ثقافتی تحفظ بھی ہے۔ ان خیالات کا اظہار قومی اردو کونسل کے صدر دفتر میں منعقدہ لیکچر بعنوان 'ہندوستانی تعلیمی فکر وآگہی اور زبان وثقافت کا تحفظ: قومی تعلیمی پالیسی 2020 کے تناظر میں' میں جناب شعیب عبداللہ سابق پروفیسر فیکلٹی آف ایجوکیشن جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی نے اپنے خطاب میں کیا۔

انھوں نے کہا کہ قومی تعلیمی پالیسی 2020 ہمارے ملک کے تعلیمی نظام کے حوالے سے بہت اہم ہے۔ اس کی خاص بات تعلیمی وحدانیت ہے۔ اس کے علاوہ اس میں قدیم علوم وفنون کے فروغ کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے اور روحانی آگہی وخودشناسی کو بھی اس میں جگہ دی گئی ہے۔ انھوں نے کہا کہ چونکہ ہمارے ملک میں ثقافتیں اور زبانیں خاص اہمیت رکھتی ہیں، اس لیے قومی تعلیمی پالیسی میں ان کے تحفظ اور فروغ کے حوالے سے بہت کچھ موجود ہے۔

پروفیسر شعیب عبداللہ نے قومی تعلیمی پالیسی کے تمام اہم نکات پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اس تعلیمی پالیسی کی ایک اہم بات یہ ہے کہ اس میں استاد کو اعلی مقام دیا گیا ہے۔ یعنی استاد کا جو مقام قدیم زمانے میں تھا، اس کی بازیافت کی کوشش اس پالیسی میں کی گئی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس میں کلاسیکل زبانوں کو بڑھاوا دینے کی بات بھی کی گئی ہے جن میں سنسکرت سمیت ملک کی کئی قدیم زبانیں شامل ہیں اور فنون، آرٹ، موسیقی جیسی قدیم چیزوں کی بھی حوصلہ افزائی کی گئی ہے۔ انھوں نے اپنی گفتگو میں ایک اور بنیادی نکتہ پر توجہ دلاتے ہوئے کہا کہ اس تعلیمی پالیسی میں تعلیم کے طریقہ کار پر خصوصی زور دیا گیا ہے۔

قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر شیخ عقیل احمد نے پروفیسر شعیب عبداللہ کا تعارف کرایا اور قومی تعلیمی پالیسی پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ یہ پالیسی ملک کی تعلیمی تقدیر بدل دے گی اور تعلیمی نظام میں یقیناً بہتری آئے گی۔ اس تعلیمی پالیسی میں نسل نو کے لیے بہت کچھ موجود ہے۔ یہ انھیں ماضی سے بھی جوڑتی ہے اور حال سے بھی اور ان کے مستقبل کے لیے ترقی کے دروازوں کو وا کرتی ہے۔ آخر میں قومی اردو کونسل کی اسسٹنٹ ڈائرکٹر اکیڈمک شمع کوثر یزدانی نے مہمان گرامی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے قومی تعلیمی پالیسی کے بہت اہم نکات پر روشنی ڈالی ہے۔ اس موقع پر انھوں نے دیگر تمام شرکا کا بھی شکریہ ادا کیا۔

پریس ریلیز، رابطہ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 5 اگست 2021

’قومی تعلیمی پالیسی 2020 اور اردو تعلیم‘ کے عنوان سے آن لائن مذاکرہ

نئی دهلی: آج قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے زیر اہتمام ’قومی تعلیمی پالیسی 2020 اور اردو تعلیم‘ کے عنوان سے ایک آن لائن مذاکرے کا اہتمام کیا گیا جس میں ماہرین تعلیم نے نئی تعلیمی پالیسی کے نکات و مشمولات اور اس کی رہنمائی میں اردو زبان کی تعلیم و ترویج کے امکانات پر سیر حاصل گفتگو کی۔ پروگرام کی شروعات میں تمام مہمانوں کا استقبال اور تعارفی کلمات پیش کرتے ہوئے کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر شیخ عقیل احمد نے کہا کہ نئی تعلیمی پالیسی جو وزیر اعظم نریندر مودی کے خوابوں کی تعبیر ہے اس میں صرف تعلیم پر ہی زور نہیں دیا گیا ہے بلکہ تربیت کو بھی اہمیت دی گئی ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہندوستان ہزاروں سال سے تعلیم اور تربیت دونوں کا مرکز رہا ہے اور نئی تعلیمی پالیسی میں ہندوستان کے اس کردار کو خاص طور پر مدنظر رکھا گیا ہے، ساتھ ہی طالب علموں کو سیکھنے کی آزادی دی گئی ہے، پہلے کی طرح موضوعاتی بندش یا پابندی نہیں رہی، اب ایک سبجیکٹ کا طالب علم اپنی خواہش اور مرضی سے دوسرے کسی بھی موضوع کو اختیار کر سکتا اور پڑھ سکتا ہے۔ اسی طرح اس میں ابتدائی تعلیم مادری زبان میں دیے جانے کی تاکید کی گئی ہے، جس میں یقیناً اردو زبان بھی شامل ہے۔

این سی ای آر ٹی کے سابق ڈائرکٹر پروفیسر ایس راجپوت نے تعلیمی پالیسی میں مادری زبان کو اہمیت دیے جانے پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اس میں متعدد زبانوں کو سیکھنے پر بھی زور دیا گیا ہے جو کہ اچھی بات ہے۔ انھوں نے کہا کہ کوئی بھی زبان اسی وقت ترقی کرے گی جب اسے اہمیت دی جائے، پس ہمیں سب سے پہلے خود اپنی مادری زبان کو عزت دینی ہوگی اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ ہم اپنے بچوں کو ابتدائی تعلیم مادری زبان میں دینے کا اہتمام کریں۔ اردو کے حوالے سے انھوں نے کہا کہ آزادی کے بعد ہندی کو فلموں کے ذریعے مقبولیت ملی اور ہندی کو سہارا اردو سے ملا کیوں کہ اس دور میں فلمیں لکھنے والے سارے اردو کے ادیب و تخلیق کار تھے، اردو کا ہر زبان کے ساتھ تعاون رہا ہے، لہٰذا اس زبان کو سیکھنا اور پڑھنا اپنے آپ میں ایک انوکھا تجربہ ہے۔ انھوں نے ایک اہم بات یہ کہی کہ کسی بھی زبان کو فروغ دینے کے لیے دوسری زبان کو ہٹانے کی بات نہیں کرنا چاہیے، بلکہ اپنی زبان کو فروغ دینے میں تمام صلاحیتوں کا استعمال کرنا چاہیے، اس کا مثبت نتیجہ نکلے گا اور ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکیں گے۔

پروفیسر محمد میاں سابق وائس چانسلر مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے اظہار خیال کرتے ہوئے قومی تعلیمی پالیسی کے بنیادی وژن اور تصور پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ انھوں نے بتایا کہ نئی تعلیمی پالیسی میں کس طرح موجودہ تعلیمی نظام کو مستحکم اور بہتر بنانے پر زور دیا گیا ہے اور اس میں موجود خامیوں پر قابو پانے کی تدبیریں بتائی گئی ہیں۔ انھوں نے نئی تعلیمی پالیسی کے کامل نفاذ میں درپیش مشکلات کی بھی نشان دہی کی اور کہا کہ اس سلسلے میں وزارت تعلیم کے ذریعے ایک متحدہ پروگرام شروع کیا جانا چاہیے۔ اردو اساتذہ کی ٹریننگ پر بھی انھوں نے زور دیا۔ انھوں نے کہا کہ اس سلسلے میں جو ادارے کام کر رہے ہیں ان کے ساتھ مل کر قومی اردو کونسل بھی اچھا کام کر سکتی ہے۔

پروفیسر شاہد اختر نے قومی تعلیمی پالیسی میں اردو زبان کا تذکرہ نہ ہونے کے سوال پر کہا کہ آٹھویں شیڈول میں درج جتنی زبانیں ہیں یہ پالیسی ان سب کے تحفظ اور فروغ کی ضمانت دیتی ہے۔ ان میں اردو بھی شامل ہے اور اردو اس ملک کی ایسی زبان ہے جس کے اثرات اس ملک کی تمام زبانوں پر پائے جاتے ہیں اور اس کی کشش پوری دنیا میں محسوس کی جاتی ہے۔ قومی اردو کونسل اس زبان کے فروغ کے لیے پابند عہد ہے اور ہم سرکار سے مسلسل رابطے میں رہ کر اپنی کوششوں کو مزید منظم کر رہے ہیں۔ اردو اساتذہ کی تربیت اور مختلف ریاستوں کے سرکاری اسکولوں میں اردو طلبہ کو پرائمری تعلیم مادری زبان میں فراہم کرنے کے لیے بھی ہم سب کوشش کر رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ 34 سال بعد عزت مآب وزیر اعظم نریندر مودی کی سربراہی میں ایک جامع اور مفید تعلیمی پالیسی تیار کی گئی ہے، جس کا تمام طبقات کو خیر مقدم کرنا چاہیے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کی پروفیسر اروندرائے انصاری نے کہا کہ نئی تعلیمی پالیسی نظری اعتبار سے نہایت وسیع اور جامع ہے مگر دیکھنے والی بات یہ ہے کہ اس کے نفاذ کے لیے سرکار کیا انتظام کرتی ہے؟ اسی طرح لوکل زبانوں بالخصوص اردو زبان کی تعلیم اور تحفظ کی بھی اس پالیسی میں ضمانت دی گئی ہے مگر اس کے لیے جو ادارے کام کر رہے ہیں ان کو خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

ڈاکٹر ظہور گیلانی نے نئی قومی تعلیمی پالیسی کو وقت کی ضرورت قرار دیا۔ انھوں نے کہا کہ اس پالیسی میں جدید دور کے تعلیمی تقاضوں کو سامنے رکھ کر اہم نکات کو شامل کیا گیا ہے۔ اشوکا یونیورسٹی کے ڈاکٹر علی خان محمود آباد نے بھی تعلیمی پالیسی کے نظریاتی پہلو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ اس میں جامعیت اور لچک تو ہے مگر اسے عملی جامہ پہنانا اصل مطلوب ہے۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد کے پروفیسر صدیق محمد محمود نے نہایت خوب صورتی سے نظامت کا فریضہ انجام دیا اور اخیر میں مقررین کے تاثرات کا خلاصہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ بلاشبہ نئی قومی تعلیمی پالیسی اپنے مشمولات کے اعتبار سے نہایت جامع اور مفید ہے مگر اس کی کماحقہ تنفیذ ضروری ہے، جس میں سرکار کے ساتھ ہم تمام لوگوں کو اپنا کردار ادا کرنے کی ضرورت ہے۔ قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر شیخ عقیل احمد کے اظہار تشکر کے ساتھ اس مذاکرے کا اختتام عمل میں آیا۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 9 اگست 2021

قومی اردو کونسل میں 75 ویں یومِ آزادی کے موقعے پر تقریبِ پرچم کشائی

نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان میں آج 75 ویں یوم آزادی کی مناسبت سے منعقدہ تقریب میں پرچم کشائی کی گئی۔ اس موقعے پر قومی اردو کونسل کے وائس چیئر مین پروفیسر شاہد اختر نے تمام اہل وطن کو جشن آزادی کی مبارک باد پیش کی۔ انھوں نے کہا کہ آج ہم بھارت کا 75 واں یوم آزادی منا رہے ہیں، جو ہمارے بے لوث نے کہا کہ اردو کے صحافیوں، شاعروں، ادیبوں اور مصنفوں نے تحریکِ آزادی کو توانائی بخشنے میں غیر معمولی کردار ادا کیا اور انھوں نے عملی طور پر اس جدوجہد میں حصہ لینے کے ساتھ اپنے قلم کی طاقت کا بھی خوب استعمال کیا جس کے نتیجے میں درجنوں صحافیوں اور شاعروں کو انگریز حکومت نے سخت سزائیں دیں، بلکہ 1857 کے انقلاب میں شرکت کی

قائدین اور قوم ووطن کے تئیں جذبۂ فدائیت رکھنے والے اسلاف کی قربانیوں کی وجہ سے ہمیں حاصل ہوئی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس ملک کو آزاد کروانے میں تمام طبقات اور مذاہب کے لوگوں کا حصہ رہا ہے۔ اس موقعے پر قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے آزادی کی تحریک میں خاص طور پر اردو زبان کی حصے داری کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ اس زبان نے شروع سے ہی آزادی کے متوالوں کے جوش وجذبے کو مہمیز کیا اور باشندگانِ ہند کے دلوں میں بیرونی تسلط کے خلاف انقلاب و بغاوت کے بیج بوئے جس کے نتیجے میں ملک کے ہر گوشے میں 'انقلاب زندہ باد' جیسے نعرے گونجنے لگے تھے۔ انھوں پاداش میں سزائے موت پانے والے اولین صحافی مولوی محمد باقر کا تعلق اردو صحافت سے ہی تھا، وہ 'دہلی اردو اخبار' کے بانی مدیر تھے۔ ان کے علاوہ 1947 تک اس زبان سے تعلق رکھنے والے نہ جانے کتنے ہی جیالوں نے گلستانِ وطن کو سینچنے کے لیے اپنے خون کا نذرانہ پیش کیا۔ ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے کہا کہ آج ضرورت ہے کہ ہم نئی نسل کو اپنے آباواجداد کی قربانیوں سے آگاہ کریں تاکہ ہمیں آزادیِ وطن کی حقیقی قدر و قیمت کا احساس ہو اور ملک کی تعمیر وترقی میں حصہ لینے کا جذبہ بیدار ہو سکے۔ اس موقعے پر کونسل کے اسٹاف بھی موجود رہے۔ پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 15 اگست 2021

دوڑنا صحت کے لیے بہت مفید ہے: ڈاکٹر عقیل احمد

نئی دہلی: 'آزادی کا امرت مہوتسو' منانے کی ایک کڑی کے طور پر 'فٹ انڈیا فریڈم رن 2.0' پروگرام کا آغاز ملک کے مختلف حصوں میں کیا گیا۔ اس موقعے پر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، وزارت تعلیم حکومت ہند کے اسٹاف نے اس رن میں حصہ لیا۔ اس پروگرام کے حوالے سے قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے کہا کہ حکومت ہند کی جانب سے شروع کیا گیا یہ پروگرام بہت اہمیت کا حامل ہے۔ اس کے ذریعے حکومت ہند پورے ملک میں صحت عامہ کے تعلق سے عوام میں بیداری لانا چاہتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ ماہرین صحت کا خیال ہے کہ صحت کے لیے دوڑنا نہایت مفید عمل ہے۔ اس کے ذریعے بہت سی بیماریوں سے بچا جاسکتا ہے۔ جن لوگوں نے دوڑ کو اپنے معمولاتِ زندگی میں شامل کیا ہوا ہے، وہ چست اور صحت مند رہتے ہیں۔ 'فٹ انڈیا فریڈم رن 2.0' کے تعلق سے حکومت ہند کی طرف سے جو ہدایات جاری کی گئی ہیں ان کا مقصد یہی ہے کہ لوگ اپنی صحت پر خاص طور پر دھیان دیں کیونکہ نفسیاتی اور جسمانی بیماریوں سے تحفظ کے لیے دوڑ فائدہ مند ہے۔ پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 13 اگست 2021

اردو اور تعلیم سے متعلق قومی اور علاقائی خبریں

دھلی

18واں ان ہاؤس سمینار

نئی دھلی: ریسرچ اسکالرفورم، شعبۂ عربی، جامعہ ملیہ اسلامیہ کی جانب سے اٹھارہویں ان ہاؤس سمینار کا انعقاد صدر شعبہ پروفیسر عبدالماجد قاضی کی صدارت میں کیا گیا۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے سینٹر فار عربک اینڈ افریقن اسٹڈیز جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے استاد ڈاکٹر عبیدالرحمٰن طیب نے شرکت کی۔ پروگرام کے آغاز میں سمینار کے ناظم محمد غلمان نے مہمانِ خصوصی، صدر شعبہ اساتذہ و ریسرچ اسکالرس کا استقبال کیا۔ اس کے بعد شعبہ کے ریسرچ اسکالر نظم حسین نے ''طعمہ فرمان کے 'المخاض' ناول میں وطن سے محبت کی تصویر کشی ایک جائزہ'' کے موضوع پر اپنا تحقیقی مقالہ پیش کیا۔ موصوف نے اپنے مقالہ کے آغاز میں طعمہ فرمان کی حیات و خدمات پر مختصر روشنی ڈالی، پھر ان کے ناولوں کا ذکر کیا اور ان کے اسلوب پر بھی بحث کی۔ اس کے بعد ریسرچ اسکالر و اساتذہ کی جانب سے کیے گئے سوالات کے مدلل جوابات دیے۔ مہمان خصوصی ڈاکٹر عبیدالرحمٰن نے اپنے خطاب میں کہا کہ یہ موضوع بڑی اہمیت کا حامل ہے کیونکہ طعمہ فرمان کے لکھے ہوئے ناول ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں کیونکہ ان کی ادبی کاوشیں دیار شوق میرا جیسے موضوع پر مبنی ہیں نیز دیار غیر میں رہنے والوں کے احساسات و جذبات کی ترجمانی کرتے نظر آتے ہیں۔ پروگرام کے آخر میں صدر شعبہ پروفیسر عبدالماجد قاضی نے اپنے صدارتی خطاب میں طعمہ فرمان کی ناول نگاری پر گفتگو کی۔ پروگرام کے اختتام پر ریسرچ اسکالرفورم کے ایڈوائزر ڈاکٹر نسیم اختر ندوی نے مہمان خصوصی، صدر شعبہ، تمام اساتذہ اور ریسرچ اسکالرس کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 8 جولائی 2021

جشن عربی شاعری

نئی دھلی: انڈیا عرب کلچرل سینٹر، جامعہ ملیہ اسلامیہ، اکیڈمی آف ایکسیلینس، شعبۂ عربی، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد اور دارالنشر والتوزیع مصر کے اشتراک سے پروفیسر محمد ایوب ندوی ڈائرکٹر انڈیا عرب کلچرل سینٹر، جامعہ ملیہ اسلامیہ کی صدارت میں 'ہندوستان میں عربی شاعری کے جشن' کے افتتاحی پروگرام کا آن لائن انعقاد کیا گیا جس میں ہندوستان اور عرب دنیا کے اساتذہ، شعرا اور دانشوروں نے شرکت کی۔ پروگرام کے آغاز میں اکیڈمی آف ایکسیلینس انڈیا کے ڈائرکٹر ڈاکٹر صابر نواز نے تمام شرکا اور مہمانوں کا استقبال کیا نیز سہ روزہ ہندوستان میں جشن عربی شاعری کی غرض و غایت پر روشنی ڈالتے ہوئے سہ روزہ جشن کی تفصیل پیش کی۔ اس کے بعد عراق کے مشہور شاعر اور ناول نگار حمید قاسم نے اپنی گفتگو کے آغاز میں اس پروگرام کے انعقاد پر تمام منتظمین کو مبارکباد پیش کی اور کہا کہ ہندوستان کے علما اور مولفین نے عربی زبان و ادب اور علوم شرعیہ میں بیش بہا خدمات انجام دی ہیں، فاضل شاعر اور ناول نگار کے ساتھ امارات کے مشہور ادیب عادل خزام اور ڈاکٹر شاکر نوری نے ان کی شاعری کے موضوعات نیز عراق میں جنگ کے بعد کی تباہیوں اور ان کا ان کی شاعری پر اثرات کے تعلق سے سوالات کیے جن کے جوابات حمید قاسم نے تفصیل سے دیے، نیز اپنی کئی کلاسیکی اور آزاد نظمیں پیش کیں۔ افتتاحی پروگرام کے صدر پروفیسر محمد ایوب ندوی نے اپنے صدارتی خطاب میں سہ روزہ جشن کے انعقاد پر ڈاکٹر صابر نواز کو مبارکباد پیش کی نیز تمام شرکا اور مہمانوں کا استقبال کیا اور شکریہ ادا کیا اور کہا کہ ہندوستان میں یہ پہلا موقع ہے کہ ہم اس طرح کا عربی شاعری آن لائن جشن منا رہے ہیں۔ مجھے قوی امید ہے کہ اس کے اچھے نتائج سامنے آئیں گے اور ہندوستان میں عربی زبان و ادب کے اساتذہ اور طلبہ و طالبات اور ریسرچ اسکالرز کو عرب شعرا کے کلام کو سننے کا موقع ملے گا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 28 جولائی 2021

آثارالباقیہ عن قرون الخالیہ

نئی دھلی: علمی اور تحقیقی مرکز انٹرنیشنل نور مائکرو فلم سینٹر، ایران کلچر ہاؤس، نئی دہلی ہندوستان اور ایران کی مشترکہ میراث کی حفاظت اور نشر و اشاعت میں مسلسل سرگرم عمل ہے۔ اس مرکز میں متعدد شعبے ہیں جن میں سے تحقیق و تالیف، کتابوں کی مرمت، کتابوں کو ڈیجیٹل کرنا اور ریئل مینو اسکرپٹ کی نشر و اشاعت سرفہرست ہے۔ ابھی تک اس مرکز میں 300 سے زیادہ نادر اور نایاب قلمی نسخوں کو ہو بہو تیار کر کے نشر کیا جا چکا ہے جن میں سے 66 آثار کا شمار ایران اور ہندوستان کی مشترک میراث میں ہوتا ہے۔ ہو بہو (Real Menu Script) اس نسخہ کو کہا جاتا ہے کہ جس کی تمام خصوصیات اصلی نسخے کی ہوتی ہیں۔ مرکز میں موجود ہندوستانی کارکنان اس نسخہ کو دبیز کاغذ پر بہترین اور خوبصورت جلد کے ساتھ چھاپ کر نشر کرتے ہیں۔ اس سینٹر نے جو تازہ ترین نسخہ تیار کیا ہے وہ 'آثارالباقیہ عن قرون الخالیہ' نامی کتاب ہے جس کو دنیا کے مشہور محقق اور سائنسداں ابوریحان بیرونی نے تصنیف کیا ہے۔ انھوں نے اس کتاب کو 20 سال کی عمر میں ایلخانی کے دربار گرگان میں جمع کیا ہے۔ اس کتاب میں گزشتہ مختلف اقوام کی تقاویم سے متعلق تاریخ، تہذیبی آثار، تہوار، ریاضیاتی استخراجات، فلکیاتی کلیات سے استخراجات مع معلومات کے فراہم کیے گئے ہیں۔ علاوہ ازیں مذاہب عالم کے مابین تاریخوں کا تفاوت بھی بیان کیا گیا ہے۔ ابوریحان بیرونی نے اس کتاب میں اسطرلاب بنانے اور اس کے استعمال کا طریقہ بھی بیان کیا ہے۔ نقشہ جات کی تفاصیل اور تکوینیاتی نقشہ جات بنانے کی تفصیل اور دائروی نقشہ جات کی تفصیل بھی فراہم کی ہے۔ مذکورہ بالا تفاصیل کے ساتھ ساتھ الصغانی کے ریاضیاتی کام بھی تحریر کیے ہیں۔ یہ قیمتی اثر کافی مرتبہ محققین کی کاوشوں کے ذریعہ چھپ کر منظر عام پر آیا ہے۔ قلمی نسخہ فرانس کے قومی کتابخانہ کا ہے جس میں 25 عدد نہایت اہم نگارشات پائی جاتی ہیں۔ اگرچہ پرانا ہونے کی وجہ سے تاریخ کتابت اور کاتب کا نام پڑھنے میں نہیں آتا لیکن خط کی نوعیت اور موجودہ نگارش سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس نسخہ کی کتابت آٹھویں یا نویں صدی میں ہوئی ہے۔ بیرونی کی کتاب 'آثارالباقیہ عن قرون الخالیہ' کو ہو بہو چھاپ کر ہندوستان اور ایران کے محققین اور دانشمندان کی خدمت میں پیش کیا کیا جاتا ہے۔ روزنامہ 'صحافت' دہلی، 19 جولائی 2021

عالمی اردو ادب

نئی دھلی: دہلی سے شائع ہونے والا مجلّہ 'عالمی اردو ادب' برصغیر میں شائع ہونے والا اردو کا واحد حوالہ جاتی مجلّہ ہے۔ رسالے کے مدیر اور 'اکادمی اردو زبان و ادب دہلی' کے ڈائرکٹر محمد یوسف رضا نے بتایا کہ دسمبر 2019

میں اس کا 48 واں شمارہ ڈاکٹر ستیہ پال آنند نمبر آنا تھا جو کہ 27 اگست 2019 کو اس کے مدیر اور بانی نند کشور وکرم کے اچانک انتقال کے باعث جاری نہیں ہو سکا تھا۔ تقریباً دو سال کے عرصے کے بعد 'عالمی اردو ادب' کا اگلا شمارہ (متوقع) اکتوبر-نومبر 2021 میں محمد یوسف رضا کی ادارت میں شائع ہونے جا رہا ہے جو کہ 'ڈاکٹر ستیہ پال آنند' پر خصوصی شمارہ ہوگا۔ اس سے قبل اس رسالے کے کئی خصوصی شمارے شائع ہو چکے ہیں جن میں سنیما صدی نمبر، حبیب جالب نمبر، احمد ندیم قاسمی نمبر، علی سردار جعفری نمبر، دیویندر ستیارتھی نمبر، اشفاق احمد نمبر، کشمیری لال ذاکر نمبر اور مشتاق احمد یوسفی نمبر کافی مقبول ہوئے۔ یوسف رضا نے آگے بتایا کہ اس رسالے کے سرپرست جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کے شعبہ اردو کے پروفیسر کوثر مظہری ہیں۔ مجلس مشاورت میں ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی صدر شعبۂ اردو پٹنہ یونیورسٹی بہار، جناب حقانی القاسمی دہلی، ڈاکٹر شاہ عالم (استاد شعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ)، ڈاکٹر مرزا شفیق حسین شفق لکھنؤ، وکاس دت، جوہی بالی، رتو بالی (فرزند و دختران نند کشور وکرم) شامل ہیں۔ یہ مجلّہ 1985 سے پابندی کے ساتھ سال میں دو مرتبہ شائع ہوتا آ رہا ہے۔

روزنامہ 'سچ کی آواز' دہلی، 12 جولائی 2021

شہنشاہ جذبات دلیپ کمار کی یاد میں سمینار و مشاعرہ

نئی دہلی: ہفتہ کی شام دہلی کے جامعہ نگر اوکھلا ولیج میں شہنشاہ جذبات دلیپ کمار کی یاد میں سمینار و مشاعرے کا

انعقاد کیا گیا جس میں دہلی کی کئی اہم شخصیات نے شرکت کی۔ اس موقعے پر ممتاز شعرا، ادبا اور صحافیوں نے دلیپ صاحب کو یاد کرتے ہوئے ان کے تعلق سے اچھوتے پہلوؤں پر روشنی ڈالی اور ان کی مغفرت کے لیے دعا کی۔ اس پروگرام کا انعقاد تسمیہ ایجوکیشنل سوسائٹی و انڈین کلچرل سوسائٹی کی جانب سے کیا گیا۔ پروگرام کے پہلے حصے میں سمینار کا اہتمام کیا گیا تھا۔ اس کا آغاز شاعر و صحافی معین شاداب کے تعارفی کلمات سے ہوا نیز پروگرام کی نظامت کے فرائض بھی معین شاداب نے انجام دیے۔

شاعر اور صحافی مکیش امروہوی اور مصنف و سینئر صحافی فاروق ارگلی نے دلیپ کمار کی شخصیت پر اپنے مقالے پیش کیے۔ مکیش امروہوی نے دلیپ کمار کی زندگی کے کئی اہم پہلوؤں کو پیش کیا جب کہ فاروق ارگلی نے معروف اداکار کی ملی ہمدردی اور مذہب سے دلچسپی اور خدا اور قرآن پر ان کے یقین کے پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ انڈین کلچرل سوسائٹی کے سرپرست اور ہمالیہ ڈرگس کے چیئرمین ڈاکٹر سید فاروق نے پروگرام کی صدارت کی۔ ڈاکٹر سید فاروق نے دلیپ کمار کے تعلق سے اچھوتے پہلوؤں سے شرکا کو باخبر کیا جن کا ابھی تک کہیں ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ اس موقعے پر ان دنوں میڈیا گروپ کے چیئرمین صحافی سید محمد آصف نے کہا کہ انھیں دلیپ صاحب سے ملنے کا صرف ایک موقع ملا وہ بھی جب وہ نماز جمعہ کے لیے جا رہے تھے۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 2 اگست 2021

غالب انسٹی ٹیوٹ میں موسیقی کلاسز

نئی دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام 5 جولائی شام پانچ بجے بین الاقوامی آن لائن اردو، فارسی اور موسیقی کلاسز کا افتتاح ہوا۔ افتتاحی اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کہا کہ یہ کوئی نیا سلسلہ نہیں ہے۔ پہلے بھی غالب انسٹی ٹیوٹ اس طرح کی کلاسز کا اہتمام کرتا رہا ہے البتہ یہ ضرور ہے کہ گزشتہ چند برسوں سے یہ سلسلہ موقوف ہو گیا تھا۔ مجھے نہایت خوشی ہے کہ غالب انسٹی ٹیوٹ نے اپنی اس بہترین روایت کو دوبارہ زندہ کیا۔ اس مرتبہ اس کورس کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں پوری دنیا سے شائقین جڑ رہے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ اس سے لوگوں کو بہت فائدہ ہوگا۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ادریس احمد نے کہا کہ گزشتہ 24 اپریل کو اس ادارے کے ہردل عزیز ڈائرکٹر سید رضا حیدر ہم سے رخصت ہو گئے اور یہ پہلا موقع ہے جب ہم ان کے بغیر کوئی پروگرام کر رہے ہیں لیکن سرگرم عمل رہنا بھی انھیں خراج عقیدت کی ایک صورت ہے۔ ہماری نئی نسل دھیرے دھیرے اردو سے دور ہوتی جا رہی ہے۔ اس کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ وہ اپنے مشترکہ کلچر کی خصوصیات کو دھیرے دھیرے فراموش کرتی جا رہی ہے۔ انھیں اردو، فارسی اور موسیقی سے دلچسپی تو ہے لیکن واقفیت نہ کے برابر ہے۔ یہ کورس ان لوگوں کے لیے ایک موقع ہے کہ وہ دوبارہ اپنے تہذیبی رشتوں سے واقف ہو سکیں۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 6 جولائی 2021

اتر پردیش

منشی پریم چند پر سمینار

سنبھل: ایم جی ایم کالج میں اردو ہندی کے عظیم فکشن نگار منشی پریم چند کے یوم ولادت کی مناسبت سے ایک سمینار

کا انعقاد کالج پرنسپل ڈاکٹر عابد حسین حیدری کی صدارت میں منعقد ہوا۔ خصوصی مقرر کی حیثیت سے گورنمنٹ رضا پوسٹ گریجویٹ کالج رامپور کے شعبہ ہندی کے پروفیسر ڈاکٹر ارون کمار نے شرکت کی جب کہ ایس ڈی ایم سنبھل دیپندر یادو بطور مہمان خصوصی شریک رہے۔ موضوع کا تعارف کراتے ہوئے شعبہ انگریزی کے استاد ڈاکٹر محمد احمد نے کہا کہ منشی پریم چند زبان کی قید سے آزاد عالمی شہرت یافتہ قلم کار ہیں۔ شعبۂ ہندی کے استاد ڈاکٹر فہیم احمد نے کہا کہ پریم چند کی کہانیاں دلتوں اور عورتوں کے مسائل کی تصویر کشی کرتی ہیں۔ خصوصی مقرر ڈاکٹر ارون کمار نے کہا کہ پریم چند کے فکشن میں دیش بھکتی اور حب الوطنی کا پہلو نمایاں ہے اس لیے انھیں افسانوی ادب میں حب الوطنی کا علمبردار کہا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر عابد حسین حیدری نے کہا کہ پریم چند کے فکشن کے ساتھ ساتھ ان کی دیگر تحریروں کا بھی مطالعہ کرنا چاہیے اس کے بغیر ہم پریم چند شناسی کا حق ادا نہیں کر سکتے۔ انھوں نے سوز وطن کی کہانیاں خصوصاً دنیا کا سب سے انمول رتن کے کرداروں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ یہ کردار اسلامی، عجمی تہذیب کے غماز ہیں۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر ریاض انور نے بخوبی انجام دیے۔ اس موقعے پر ڈاکٹر رضا الرحمٰن عاکف اور جملہ اسٹاف موجود رہا۔

روزنامہ 'سچ کی آواز' دہلی، 2 اگست 2021

منشی پریم چند کے یوم پیدائش پر جشن

وارانسی: مشہور و معروف مصنف منشی پریم چند کے یوم پیدائش کا جشن لمہی گاؤں میں جوش و خروش سے منایا گیا۔ اس موقعے پر کئی ڈراموں کا بھی انعقاد کیا گیا۔ اس کے علاوہ صبح سے شام تک ثقافتی پروگرام بھی ہوتے رہے۔ منشی جی

کی زندگی پر سمینار کا بھی انعقاد کیا گیا۔ منشی پریم چند کے مجسمہ پر گل پوشی کرنے والوں کا تانتا لگا رہا۔ 141ویں یوم پیدائش سے ماقبل ہی شب سے مختلف پروگرام ہونا شروع ہوگئے تھے۔ ملتا کاشی منچ تنظیم کی جانب سے مانسرور گھاٹ پر سمینار کا انعقاد کیا گیا۔ مشہور و معروف نیورو سرجن پروفیسر وجے ناتھ مشر نے منشی پریم چند کی زندگی پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ پریم چند جی کو سمجھ کر ہم اپنے معاشرے کو ترقی کی جانب گامزن کرسکتے ہیں۔ پروفیسر شری پرکاش شکلا نے کہا کہ مانسرور گھاٹ پر اس لیے سمینار کا انعقاد کیا گیا کہ منشی جی کی کہانیوں کو مانسرور نام سے ایڈٹ کیا گیا ہے۔ کاشی کے گھاٹ پر پوری دنیا کے لوگ چہل قدمی کے لیے آتے ہیں۔ منشی جی کو یاد کرنے کے لیے یہ جگہ بہت مناسب تھی۔

روزنامہ'انقلاب' 1اگست 2021

پروفیسر ایم جے وارثی کی تحقیق نصاب میں شامل

علی گڑھ: پروفیسر ایم جے وارثی (چیئرمین، شعبۂ لسانیات اے ایم یو) کی تحقیق کو ملک کے معروف تعلیمی بورڈ آئی سی ایس ای (انڈین سرٹیفکیٹ آف سیکنڈری ایجوکیشن) کی کتاب میں جگہ دی گئی ہے۔ پروفیسر وارثی کی تحقیق جو ہندوستان کے ثقافتی تنوع کے بڑھتے ہوئے اثرات سے متعلق ہے، اس کی کیس اسٹڈی کے اقتباسات کو آئی سی ایس ای بورڈ کے تازہ نصاب کی کتاب 'لانگ مین ہسٹری اینڈ سِوکس' میں شامل کیا گیا ہے۔ نصاب میں شامل کیس اسٹڈی، ریاستہائے متحدہ امریکہ میں ہندوستانی باشندوں کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ پر روشنی ڈالتی ہے۔ اس سے امریکہ میں ہندوستانی رقص اور دیگر فنون کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

روزنامہ'اخبارِ مشرق' دہلی، 20 جولائی 2021

بہار

طلبا و طالبات کو اردو زبان و ادب کی طرف راغب کرنا اساتذہ کی ذمے داری

موتیہاری: اردو زبان و ادب کے فروغ میں سماج کے سب سے نچلے پائیدان پر رہنے والے افراد کا اہم کردار ہے جنھوں نے بغیر ذاتی مفاد کے اردو زبان کو اپنی بول چال کی زبان بنا کر رکھا اور اپنے بچوں کو اس کی تعلیم سے آراستہ کرنے میں مصروف ہیں۔ آج بھی سماج میں ایسے ہزاروں افراد موجود ہیں جو اردو کی بقا اور تحفظ کے لیے کوشاں ہیں اور اس کو اپنی بول چال کی زبان بنائے ہوئے ہیں۔ ان خیالات کا اظہار کنڈواپ گریڈ ڈبائی اسکول اردو میں منعقد مشاورتی نشست کے دوران عوامی اردو نفاذ کمیٹی کے ضلع صدر مولانا انیس الرحمٰن چشتی نے کیا۔ انھوں نے کہا کہ اردو اساتذہ کی اولین ذمہ داری ہے کہ طلبا و طالبات کو اردو زبان و ادب کی تعلیم کی جانب راغب کریں اور انھیں اس کی اہمیت و افادیت سے آگاہ کریں۔ انھوں نے کہا کہ ہمیں زمینی سطح پر کام کرنے پر یقین رکھنا چاہیے۔ کمیٹی کے رکن اور کنڈواپ گریڈ ڈبائی اسکول کے پرنسپل ماسٹر ہدایت اللہ احسن چمپارنی نے کہا کہ بین الاقوامی سطح پر اردو زبان و ادب اپنی منفرد شناخت رکھتی ہے۔ اس کی حلاوت و چاشنی بے مثال ہے۔ ہر گھر میں اردو کی شمع کی لو کو مزید تیز کرنے اور تقویت دینے کی ہر ممکن کوشش کی جائے۔ اپنے بچوں کو اردو زبان کی تعلیم سے آراستہ کریں، کیونکہ اردو ہمارے ملک کی مہذب و شائستہ زبان ہے۔ جب تک ہمارے بچے اس کی تعلیم نہیں حاصل کریں گے اس وقت تک اس کی ترقی اور فروغ ناممکن ہے۔

کمیٹی کے رکن اور یو ایم ایس بیریا اردو کے معلم ماسٹر شکیل احمد نے کہا کہ اردو زبان و ادب کی ترقی اور فروغ پر خصوصی توجہ دینا، اردو اساتذہ کی ذمے داریوں میں سے ہے۔ ہم بچوں کو اس زبان کے استعمال کی جانب راغب کریں۔ یو ایچ ایس کنڈوا اردو کے معلم ماسٹر مہتاب عالم نے کہا کہ اردو صرف زبان ہی نہیں بلکہ یہ ہماری تہذیب و ثقافت کی بہترین ترجمان بھی ہے۔ اس کی تعلیم کے بغیر ہمارے بچے کسی بھی زبان کو درست طریقے سے لکھ پڑھ نہیں سکتے اور نا ہی الفاظ کو درست ادا کرسکتے ہیں۔

روزنامہ'انقلاب' دہلی، 4اگست 2021

شکیلہ اختر یادگاری ویبینار

پٹنہ: شکیلہ اختر کی افسانہ نگاری میں عام انسانوں کی تصویر اور ان کے درد کی کہانیاں ہیں۔ ایک اعلیٰ خانوادے سے تعلق رکھنے کے باوجود انھوں نے جس طریقے سے اپنے افسانوں میں عام لوگوں اور کمزور طبقوں کے مسائل اور ان کے درد کو بیان کیا ہے وہ دوسروں کے یہاں شاذ و نادر ہے۔ ان کے افسانے اتنے بلند پایہ ہوتے تھے کہ ہند و پاک کے سبھی مقتدر رسائل انھیں فخر کے ساتھ شائع کرتے تھے۔ شکیلہ اختر کے سارے افسانے معیاری ہیں۔ ان کے کسی بھی افسانے کو کمزور نہیں کہا جاسکتا ہے۔ ان خیالات کا اظہار معروف فکشن نگار پروفیسر عبدالصمد نے کیا۔ وہ آج یہاں اردو ڈائرکٹوریٹ، محکمہ کابینہ سکریٹریٹ، حکومت بہار کے زیر اہتمام اردو کی سرکردہ افسانہ نگار شکیلہ اختر کی یاد میں ایک آن لائن پروگرام بعنوان 'شکیلہ اختر یادگاری ویبینار' میں صدارتی گفتگو کر رہے تھے۔ اس موقعے پر پروفیسر قمر جہاں، پروفیسر شہناز فاطمی اور ڈاکٹر قاسم خورشید مقالہ خواں کی حیثیت سے شریک ہوئے۔

روزنامہ'انقلاب' دہلی، 30 جولائی 2021

تلنگانہ

اردو یونیورسٹی میں قومی اردو سائنس کانگریس کا افتتاح

حیدرآباد: کورونا وائرس بظاہر بے جان نظر آتا ہے لیکن یہ ایک نہایت ذہین جرثومہ ہے جو انسان کے مدافعتی نظام کو مفلوج کرکے رکھ دیتا ہے۔ اس وائرس کے بغور مطالعہ سے ہمارا ایمان تازہ ہوجائے گا۔ کورونا نے ہمیں جس قدر سکھایا ہے اس سے کہیں زیادہ پہلے سے موجود نظریات کو مسترد کیا ہے۔ ان خیالات کا اظہار ممتاز سائنسداں پروفیسر شیر علی، سابق ڈائرکٹر انٹرڈسپلنری سائنسز، جامعہ ملیہ اسلامیہ نے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں پانچویں قومی اردو سائنس کانگریس کے آن لائن افتتاحی اجلاس میں کیا۔ کانگریس کا عنوان 'بین علومی سائنسی تحقیق پر ٹکنالوجی کے اثرات' ہے۔ پروفیسر ایس ایم رحمت اللہ وائس چانسلر انچارج نے صدارت کی۔ پروفیسر شیر علی نے 'جسمی اودیہ: امیدیں مبالغہ اور چیلنجز' کے موضوع پر کلیدی خطبہ دیتے ہوئے کہا کہ اردو کے نظریے سے سائنس کو دیکھنا اور سائنسی نظر سے اردو کا مطالعہ اپنے آپ میں ایک نہایت خوبصورت تجربہ ہے۔ ہمہ علومی سائنسی تحقیق کے نتیجے میں سرگرمیوں اور ٹکنالوجی کے اطلاق کا دائرہ وسیع ہوجاتا ہے۔ مختلف میدانوں کے علوم کا جب مشترکہ انطباق ہوتا ہے تو حیرت انگیز نتائج ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ انھوں نے اردو، سائنس اور کانگریس تینوں موضوعات پر مختصر بات کی۔ پروفیسر پروین جہاں نے خطبۂ استقبالیہ میں کانگریس کے اغراض و مقاصد بیان کیے۔ فوائد اور نقصانات پر روشنی ڈالی۔ پروفیسر سید نجم الحسن، شعبۂ ریاضی و کنوینر سائنس کانگریس نے تعارفی کلمات میں کہا کہ 50 مقالے منتخب کیے گئے ہیں۔ ڈاکٹر قسیم اللہ، اسسٹنٹ پروفیسر نے شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ'انقلاب' دہلی، 15 جولائی 2021

اردو صحافت، رجحانات و امکانات

حیدرآباد: اردو صحافیوں کی فنی و تکنیکی صلاحیتوں میں مزید اضافے کی خاطر تلنگانہ ریاستی اردو اکادمی کی جانب سے پانچ روزہ ورکشاپ اردو صحافت، رجحانات و امکانات کے عنوان کے تحت 13 جولائی تا 17 جولائی گذشتہ روز اختتام عمل میں آیا۔ اس ورکشاپ سے ہندوستان بھر کے تقریباً 700 اردو صحافیوں اور محبان اردو نے استفادہ کیا۔ ورکشاپ کے صدر نشین رحیم الدین انصاری نے اجلاس سے صدارتی خطاب کرتے ہوئے اس ورکشاپ کے کوآرڈینیٹر ایس ایم فصیح اللہ، اسٹاف و اردو اکیڈمی کو مبارکباد پیش کی اور کہا کہ اردو صحافت کا روشن ماضی رہا ہے اور آج بھی اردو صحافت اسی کڑی کو آگے بڑھا رہی ہے۔ اردو اکیڈمی تلنگانہ نے صحافیوں کی تربیت اور ان کی مخفی صلاحیتوں کے فروغ کے لیے ہی اس ورکشاپ کو منعقد کیا ہے۔ نئی دہلی سے ممتاز صحافی مہتاب عالم نے اختتامی اجلاس میں کلیدی خطبہ دیا۔ انھوں نے پرنٹ میڈیا، ڈیجیٹل میڈیا اور سوشل میڈیا کے بارے میں کہا کہ ہم فیس بک کا استعمال کرتے ہیں اور اس میں طویل مضامین ڈال دیتے ہیں جس سے لوگوں کو دلچسپی نہیں رہتی اس کے بجائے اگر مختصر پوائنٹس یا بلٹ کا استعمال کریں تو لوگ اس کو دیکھیں گے اور یاد بھی رکھیں گے۔ انھوں نے خبروں کے لیے پوسٹ کارڈ کے استعمال کو عام کرنے کی ضرورت پر زور دیا کہ شہر میں خبریں اور واقعات ایسے ہونے چاہئیں کہ عام لوگ ان سے فائدہ اٹھائیں۔ مرزا غنی بیگ نے ڈیجیٹل صحافت کے رجحانات پر اظہار خیال کیا اور پی پی ٹی پیش کیا اور کہا کہ ڈیجیٹل میڈیا میں ٹرینڈس پر نظر رکھتے ہوئے نیوز پورٹلس کو کام کرنا چاہیے۔ ویب سائٹس کو گوگل اور ایس ای او کے قواعد پر عمل کرنا چاہیے۔ ڈیجیٹل میڈیا میں قارئین اور ناظرین کی پسند کو پہلی ترجیح دی جاتی ہے۔ اس لیے ٹرینڈز کا استعمال کرنے والے ویب پورٹلس کے لیے مواد کا انتخاب کیا جاسکتا ہے۔ اختتامی اجلاس کے مہمان خصوصی شاہنواز قاسم ڈائرکٹر اقلیتی بہبود حکومت تلنگانہ نے اپنے خطاب میں کہا کہ صحافت ذہن کو وسیع کرتی ہے اور اردو صحافیوں کو سماج کا حقیقی نمائندہ بن کر خبر نگاری کرنی چاہیے۔ آج کے جدید دور میں اردو صحافت کسی سے بھی پیچھے نہیں ہے۔ اردو زبان جہاں ادب و ثقافت کی زبان ہے وہیں عصری تقاضوں کو اس زبان کے ذریعے پورا کیا جارہا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ویب پورٹل کے ذریعے آج صحافت کا دائرہ وسیع ہوگیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج ویب پورٹل پر دنیا بھر سے قارئین اپنی پسند کا مواد پڑھتے ہیں۔ انھوں نے مشورہ دیا کہ خبر نگاری کے دوران سنسنی خیزی سے پرہیز کریں تاکہ اس کے ذریعے معاشرے میں غلط پیغام نہ جائے۔ ڈائرکٹر وسکریٹری محمد غوث نے صدر نشین اردو اکیڈمی محمد رحیم الدین انصاری کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ اردو اکیڈمی کے اس ورکشاپ سے سیکڑوں صحافیوں نے استفادہ کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو اکیڈمی آئندہ بھی دیگر علمی اور صحافتی شعبوں میں اس طرح کے پروگرام کا انعقاد کرے گی۔ اس اختتامی اجلاس میں نظامت کے فرائض سید خالد شہباز نے انجام دیے۔ صحافی رحمان پاشا نے تمام ریسورس پرسنز سامعین و اردو اکیڈمی کے عہدے داران و اراکین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 19 جولائی 2021

جھارکھنڈ

ابن صفی کا جاسوسی کردار 'عمران' آج بھی ہر قاری کا آئیڈیل: امان ذخیروی

جموئی: بزم تعمیر ادب ذخیرہ جموئی بہار کے جنرل سکریٹری و معروف شاعر امان ذخیروی نے اطلاع دی ہے کہ بزم کے دفتر 'فضل احمد منزل' ذخیرہ میں ابن صفی کے یوم پیدائش و وفات

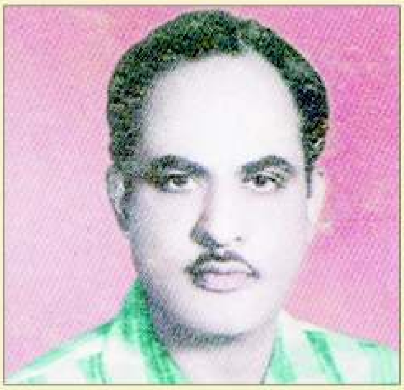

پر ایک یادگاری تقریب، بصدارت حاجی محمد سعد اللہ خان عمل میں آئی۔ صدر تقریب حاجی محمد سعد اللہ خان نے ابن صفی مرحوم کے جاسوسی ناولوں کا چرچہ سامعین کے سامنے کیا۔ صدر موصوف نے نئی نسل کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ اگر کہیں دستیاب ہوں تو ابن صفی کے ناول ضرور پڑھیں۔ میرا دعویٰ ہے کہ آپ موبائل پر ڈرامے اور فلمیں دیکھنا چھوڑ دیں گے۔ ان ناولوں کے کبھی نہ ختم ہونے والے تجسس میں آپ ایسا کھوئیں گے کہ خود کا خیال نہیں رہے گا۔ صدر تقریب کے تعارفی خطبے کے بعد بزم کے جنرل سکریٹری امان ذخیروی نے ابن صفی کی حیات و خدمات پر اجمالی روشنی ڈالی۔ جناب ذخیروی نے اپنی تقریر میں کہا کہ ابن صفی کی پیدائش 26 جولائی 1928 کو الہ آباد کے ایک گاؤں نارا میں ہوئی تھی۔ ان کے والد کا نام صفی اللہ اور والدہ کا نام نذیرہ بی بی تھا۔ ابن صفی کا اصل نام اسرار احمد تھا، لیکن انھیں شہرت ابن صفی کے نام سے ہی ملی۔ ابن صفی نے اپنے ادبی سفر کا آغاز 1948 میں ماہنامہ نکہت کی سب ایڈیٹری سے کیا۔ اسی رسالے میں 1948 میں ہی ابن صفی کی پہلی کہانی فرار شائع ہوئی پھر رفتہ رفتہ ان کا رجحان جاسوسی ناول لکھنے کی طرف ہوا اور 1952 میں ان کا پہلا ناول دلیر مجرم شائع ہوا تو ادبی حلقے میں دھوم مچ گئی۔

روزنامہ 'سچ کی آواز' دہلی، 27 جولائی 2021

مہاراشٹر

شیخ الکبیر کی حیات کے چند نمایاں پہلو

برہانپور: تہذیبی شناخت کی اس ہوڑ میں اپنی تاریخ کو از سر نو زندہ کرنے اور اسے کتابوں سے نکال کر موجودہ نسل کے اذہان تک پہنچانے کی ضرورت ہے تب آپ اپنی شناخت قائم کر پائیں گے۔ ان خیالات کا اظہار ورلڈ اردو ایسوی ایشن کے چیئرمین، جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر خواجہ اکرام الدین صاحب نے 30 جولائی بروز جمعہ کو رات 11 بجے دارالسرور ایجوکیشن اینڈ ویلفیئر سوسائٹی برہان پور (رجسٹرڈ) کے زیر اہتمام سوسائٹی کے آفیشل فیس بک پیج پر حضور شیخ الکبیر خواجہ سید نذیر میاں چشتی رحمتہ اللہ علیہ کے 142 سالہ عرس کے موقع پر منعقدہ آن لائن توسیعی خطبہ بعنوان 'شیخ الکبیر کی حیات کے چند نمایاں پہلو' میں صدارتی خطبہ پیش کرتے ہوئے کیا۔

نبیرۂ شیخ الکبیر حضرت مولانا سید فاروق میاں چشتی مصباحی (صاحب سجادہ آستانۂ عالیہ) نے دعائیہ کلمات پیش کرتے ہوئے کہا: ان شاء اللہ جلد دادا حضور شیخ الکبیر کی تصانیف کے اردو تراجم اور ان پر ہوا تحقیقی کام پی ایچ ڈی کا مقالہ جلد شائع ہوگا، جس کے محرک ہمارے عزیزی تنویر رضا برکاتی ہیں۔ مہمان معظم کی حیثیت سے موجود معروف شاعر فاروق جائسی (سابق اسسٹنٹ کمشنر کانپور) نے اپنے تاثرات پیش کرتے ہوئے کہا: حضور شیخ الکبیر کا علمی سرمایہ جو اب تک شائع نہ ہوسکا ہے اگر یہ اشاعتی مرحلے سے گزرے گا تو یقیناً افادیت کا حامل ہوگا، شرط یہ ہے کہ وہ سلیس اردو زبان میں ہو۔

خصوصی خطاب کے لیے مدعو مولانا کاشف رضا شاد مصباحی نے شیخ الکبیر کی حیات کے چند نمایاں پہلو پر گفتگو

کرتے ہوئے کہا: 142 سال گزر جانے کے بعد بھی آپ کی کتابوں کا منظر عام پر نہ آنا یقینی طور پر باعث حیرت بھی ہے اور باعث افسوس بھی۔ انھوں نے مزید کہا کہ شیخ الکبیر کی کتابوں کی اشاعت وقت کا اہم تقاضا ہے جس سے ہمارا علمی سرمایہ محفوظ بھی ہوگا اور نئے محققین کو کام کرنے کی راہیں بھی ہموار ہوں گی۔

اس توسیعی خطبہ کا آغاز صدیق رضا قادری نے کیا۔ نظامت کے فرائض معروف شاعر و ناظم ڈاکٹر جلیل الرحمن انصاری نے بحسن وخوبی انجام دیے۔ سوسائٹی کے چیئرمین تنویر رضا برکاتی نے تمام مہمانان اور لائیو دیکھنے والوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا: تحریک اسلاف شناسی کے تحت ہم برہان پور کے صوفیا، علما، ادبا، کی حیات و خدمات پر پروگرام کے انعقاد کے ذریعہ ان پر تحقیقی علمی کاموں کے لیے لوگوں کو آمادہ کرنا چاہتے ہیں۔ آج کا یہ توسیعی خطبہ بھی اسی حصے کی ایک کڑی ہے۔

رپورٹ: عمران انصاری، 30 جولائی 2021

اعزاز و اکرام

عین الحسن

نئی دھلی: صدر جمہوریہ رام ناتھ کووند نے حیدرآباد سمیت 12 سینٹرل یونیورسٹیوں کے وائس چانسلروں کی تقرری کو منظوری دے دی ہے۔ حکومت ہند کی وزارت تعلیم کے ڈپارٹمنٹ آف ہائیر ایجوکیشن کی طرف سے جاری کیے گئے ایک آرڈر سے معلوم

ہوا کہ جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کے اسکول آف لینگویج کے شعبۂ فارسی اور سینٹرل ایشین اسٹڈیز کے پروفیسر اور مشہور ومقبول شاعر عین الحسن کو مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کا وائس چانسلر مقرر کیا گیا ہے۔ یہ تقرری پانچ سال کے لیے کی گئی ہے۔ پروفیسر عین الحسن کا تعلق فیض آباد سے ہے مگران کا زیادہ وقت بنارس میں گزرا جہاں ان کے والد پروفیسر بدرالحسن مرحوم بنارس ہندو یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے سربراہ تھے۔ پروفیسر عین الحسن عابدی نے اپنی اعلیٰ تعلیم جے این یو سے ہی مکمل کی اور پھر ڈاکٹریٹ حاصل کرنے کے بعد وہیں فارسی پڑھانے لگے۔ پروفیسر عین الحسن کو وائس چانسلر بنائے جانے کے فیصلے کا ہر طرف خیر مقدم کیا جا رہا ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 24 جولائی 2021

فاروق ارگلی

پٹنہ: خانقاہ شاہ ارزانی نے ایک باوقار تقریب میں اردو کے مشہور ادیب، صحافی اور مصنف فاروق ارگلی کو اپنے آٹھویں آفتاب شریعت تصوف ایوارڈ سے سرفراز کیا۔ خانقاہ شاہ ارزانی کے سجادہ نشیں پروفیسر ڈاکٹر سید شاہ حسین احمد نے مہمانان گرامی کے ہاتھوں ان

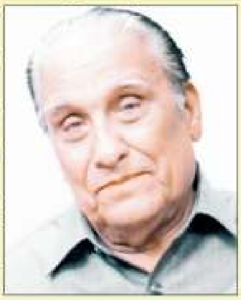

کو شال، ایوارڈ کا مومنٹو، سند توصیفی اور ایوارڈ کی رقم کا لفافہ پیش کیا۔ یہ ایوارڈ پچھلے آٹھ سال سے ان اہل قلم کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے جن کا تصوف اور صوفی ادب کے فروغ میں گرانقدر کردار ہے۔ اس سے قبل یہ ایوارڈ پروفیسر طلحہ رضوی برق، پروفیسر سید شاہ حسین الحق، شاہ ابوسعید احسان اللہ صفوی، سید محمد اشرف اور پروفیسر اختر الواسع کو پیش کیا جا چکا ہے۔ جناب فاروق ارگلی اردو کے مشہور ادیب وصحافی اور درجنوں کتابوں کے مصنف و مولف ہیں۔ سلطان الہند غریب نواز اجمیری کی ذات و خدمات پر لکھا گیا ان کا سیریل ناظرین ومعتقدین میں بے حد مقبول ہے، وہ صوفیہ کی سیرت وسوانح پر کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں اور ادھر کئی برسوں سے تصوف کے موضوع پر دہلی سے ایک ماہانہ رسالہ 'نظامی آواز' بھی شائع کرتے ہیں۔ جلسہ کی صدارت مولانا سید شاہ مصباح الحق عمادی کررہے تھے۔ خطبۂ افتتاح پروفیسر اعجاز علی ارشد نے پیش کیا جب کہ ایوارڈ یافتہ مصنف کا تعارف انقلاب کے ریزیڈنٹ ایڈیٹر احمد جاوید نے کرایا۔ انھوں نے کہا کہ فاروق صاحب اردو کی وہ شمع ہیں جو سحر ہونے تک ہر رنگ میں جلتی ہے۔ خانقاہ ارزانی کے صاحب سجادہ سید شاہ حسین احمد نے ان کی شخصیت کے اس پہلو کو دریافت کرکے ہم پر احسان کیا ہے۔ مولانا مبارک حسین مصباحی نے کہا کہ ہم بچپن سے فاروق صاحب کو پڑھتے آئے ہیں۔ مولانا مفتی ثناء الہدیٰ قاسمی نے کہا کہ یہ ایوارڈ قلم کے ایک سپاہی کے لیے سچا خراج ہے۔ مولانا سید اسد رضا، ڈاکٹر امجد رضا امجد، ڈاکٹر ریحان غنی اور دیگر مقررین نے بھی خانقاہ اور ایوارڈ سے سرفراز کیے گئے لوگوں کو مبارکباد پیش کی۔ اس موقعے پر خانقاہ نے صوفیائے کرام اور اتحاد ملت کے موضوع پر ایک سمینار کا اہتمام بھی کیا تھا جس کی صدارت مولانا مبارک حسین اور ڈاکٹر ریحان غنی نے کی۔ مقالہ پیش کرنے والوں میں مولانا طلحہ نعمت ندوی، سید شاہ محمد علی، ڈاکٹر عبدالسلام فلاحی، ڈاکٹر مشکور معینی، ڈاکٹر ریحان غنی، مولانا اسد رضا، مفتی ثناء الہدیٰ قاسمی، ڈاکٹر امجد رضا امجد اور سرفراز عالم شامل تھے۔ علما و دانشوران نے اتحاد ملت کے فروغ کے لیے صوفیا کی تعلیمات کو اپنانے پر زور دیا۔ جلسے کی نظامت بابر ندیم نے کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 16 جولائی 2021

فلم 'مرزا غالب' بین الاقوامی ایوارڈ سے سرفراز

حیدرآباد: مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے انسٹرکشنل میڈیا سنٹر کو بین الاقوامی سطح پر ایک اور اعزاز حاصل ہوا۔ سنٹر کی جانب سے تیار کردہ مختصر فلم 'نوائے سروش-مرزا غالب' کو اولین انٹرنیشنل کلچر سنیما فیسٹول 2021 میں ادب کے زمرہ میں 'بیسٹ ان لٹریچر' ایوارڈ کے لیے منتخب کیا گیا۔ 21 جولائی کو منعقدہ آن لائن فلم

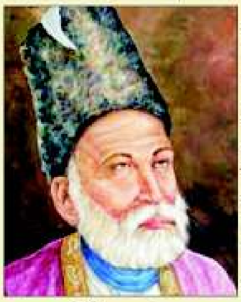

فیسٹول میں اس ایوارڈ کا اعلان کیا گیا۔ اس فلم کی ہدایت ڈاکٹر میر حشمت علی نے کی ہے۔ نوائے سروش-مرزا غالب کے علاوہ آئی ایم سی کی 9 مختصر فلموں اور دستاویزی فلموں کی اس فیسٹول میں نمائش کی گئی۔ یہ نہ صرف یونیورسٹی بلکہ سارے ملک کے لیے اعزاز ہے کہ ایک ہندوستانی فلم کو بین الاقوامی سطح پر ایوارڈ دیا گیا۔ فیسٹول میں 21 ملکوں کی 74 فلمیں دکھائی گئیں اور 42 فلمیں مسابقاتی زمرے میں تھیں۔ جناب رضوان احمد، ڈائرکٹر آئی ایم سی نے مانو فلم کو ایوارڈ ملنے پر مسرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ 2 سال قبل آئی ایم سی نے مانو نالج سیریز کے تحت سائنس، اختراع، زبان وثقافت پر فلمیں بنانے کا آغاز کیا تھا۔ اب اس کا ثمر حاصل ہو رہا ہے۔ یہ کامیابی مرکز کو مزید بہتر کام کرنے کے لیے تحریک ثابت ہوگی۔ ایوارڈ کے لیے انھوں نے پوری ٹیم کو مبارکباد دی۔ پروفیسر ایس ایم رحمت اللہ، وائس چانسلر انچارج اور پروفیسر صدیقی محمد محمود، رجسٹرار انچارج نے ایوارڈ کے حصول پر آئی ایم سی ٹیم کو مبارکباد پیش کی اور کہا کہ عالمی سطح پر اعزاز کا ملنا آئی ایم سی کی ساری ٹیم کی مشترکہ محنت کا نتیجہ ہے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 25 جولائی 2021

ممتاز احمد

دیوبند: سینئر صحافی اور معروف سماجی خدمت گار ممتاز احمد ملک کی صحافتی خدمات کا اعتراف کاؤنسل فار میڈیا اینڈ سیٹیلائٹ براڈ کاسٹنگ کی جانب سے کیا گیا۔ کاؤنسل کے فاؤنڈر چیئرمین ڈاکٹر پی کے بنگاری اور صدر ڈاکٹر چیدا تمیکا کے بدست ممتاز احمد کو اعزاز سے نوازا گیا۔ دونوں شخصیات نے انھیں یہ اعزاز ملنے پر مبارکباد دی اور ان کے بہتر مستقبل کی خواہشات پیش کیں۔ ممتاز احمد کو اس اعزاز کے ملنے پر آل انڈیا مومن کانفرنس کے صدر نسیم انصاری ایڈوکیٹ، معروف شاعر ڈاکٹر نواز دیوبندی، اسلامیہ انٹر کالج کے سابق پرنسپل شمیم مرتضی فاروقی، ارون اگروال، ڈاکٹر شمیم دیوبندی، ڈاکٹر ایس اے عزیز، ڈاکٹر شبیر کریمی، ڈاکٹر صادق، تحسین خاں ایڈوکیٹ، سلیم قریشی، رضوان قاسمی، کمل دیوبندی، ارشد صدیقی، اسعد جمال فیضی، حمزہ نسیم، نجم عثمانی، ڈاکٹر فیروز ناصر اور دیگر شخصیات نے مبارکباد پیش کی۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی' 17 جولائی 2021

صابر بہوی

دیوبند: سماجی تنظیم جہانِ ادب اکیڈمی کی جانب سے محلہ بیرون کوٹلہ میں واقع اردو گھر پر معروف شاعر ڈاکٹر صابر بہوی کی آمد پر ایک استقبالیہ پروگرام کا انعقاد کیا گیا۔ ڈاکٹر صابر کی ادبی خدمات پر جہانِ ادب اکیڈمی کے چیئرمین تنویر اجمل نے ان کو اعزاز سے نوازا۔ اس موقعے پر تنویر اجمل نے کہا کہ ڈاکٹر صابر بہوی اردو ادب میں ایک بڑا نام رکھتے ہیں۔ وہ 20-15 سالوں سے اردو ادب سے جڑے ہوئے ہیں اور اردو ادب کی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ وہ ایک اچھے شاعر کے ساتھ ساتھ ایک اچھے انسان بھی ہیں، ان کی شاعری میں جدت ہے اور وہ اچھے اشعار کہنے کا ہنر جانتے ہیں۔ ڈاکٹر صابر بہوی نے اپنی دیوبند آمد پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ کافی روز سے میری دیوبند آنے کی تمنا تھی جو آج پوری ہوئی ہے۔ اس موقعے پر دلشاد خوشتر کی شاعری کی کتاب 'روبرو' بھی ڈاکٹر صابر بہوی کو پیش کی گئی۔ اس دوران دلشاد خوشتر نے کہا کہ ادب سے جڑے لوگوں کی تعریف کرنا اکیڈمی کے چیئرمین شاعر تنویر اجمل کی خاص عادت ہے۔ ان کی ادبی خدمات کی یہ الگ پہچان ہے۔ اس موقعے پر تنویر اجمل نے تنظیم کے ذمہ داران اور اراکین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'اخبارِ مشرق' دہلی، 2 اگست 2021

رسم اجرا

اشاریہ ششماہی علوم القرآن

علی گڑھ: ادارہ علوم القرآن (شبلی باغ، علی گڑھ) 1985 سے قرآنی علوم و افکار کی ترویج و اشاعت میں سرگرم عمل ہے۔ اس کی سرگرمیوں میں اردو مجلّہ ششماہی علوم القرآن کی اشاعت بھی شامل ہے۔ اس کی اشاعت جولائی 1985 سے بدستور جاری ہے۔ اس مجلّہ کا اشاریہ سابق صدر شعبۂ اسلامک اسٹڈیز پروفیسر ظفرالاسلام اصلاحی نے مرتب کیا ہے۔ یہ 'اشاریہ ششماہی علوم القرآن، علی گڑھ (1985-2020)' کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ یہ اشاریہ ابتدا و اجرا سے دسمبر 2020 تک کی شائع شدہ 35 جلدوں کے تمام شماروں کے مشتملات کا احاطہ کرتا ہے۔ موضوع کے اعتبار سے مرتبہ یہ اشاریہ 31 حصوں میں منقسم ہے۔ اس کے کچھ اہم ذیلی عناوین یہ ہیں: اداریے، نزول وجمع و تدوینِ قرآن، تعارفِ قرآن، قرآن کریم کے قدیم مصاحف، قرآن مجید اور انبیاء کرام علیہم السلام، قرآنی افکار و تعلیمات، قرآن اور سماجیات، قرآن اور معاشیات، قرآن اور سائنس، فنِ ترجمہ، اصولِ تفسیر، منہج تفسیر و متعلقہ کتب، تراجم و مترجمین، تفاسیر و مفسرین، قرآنی علوم و کتبِ متعلقہ، تفسیر و تاویلِ مشکل آیات، قرآنی الفاظ و اصطلاحات کی تحقیق و تشریح، تدریس قرآن و نصابِ تعلیم، جدید دور کے علما و اسکالرس کی قرآنی خدمات، قرآنی کتب و مجلات پر خصوصی مطالعات، علماء قرآنیات پر وفیات، قرآنیات پر مخطوطات، مطبوعات و تحقیقی مقالات کے اشاریے، قرآن کے طباعتی و اشاعتی ادارے، قرآنیات اور ان کے ماہرین پر سمینار، متعلقاتِ ادارہ و مجلّہ علوم القرآن، قرآنی خبریں، تعارف و تبصرہ، مجلّہ علوم القرآن کے خصوصی شمارے۔ آخر میں مضمون نگاروں اور تعارف و تبصرہ نگاروں اور کتب تعارف و تبصرہ کا اشاریہ بھی شریکِ اشاعت ہے۔ قرآنیات پر مطالعہ و تحقیق کرنے والوں کے لیے یہ اشاریہ افادیت سے بھرپور ہے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 20 جولائی 2021

'ایک خنجر پانی میں' پر مذاکرہ

نئی دھلی: پروفیسر خالد جاوید نے اپنے منفرد فکشن سے صرف اردو ہی نہیں بلکہ کئی زبانوں کو اپنی طرف متوجہ کیا ہے۔ ان کا ناول 'ایک خنجر پانی میں' وبا پر لکھے گئے ادب میں ایک مختلف نقطۂ نظر کا اضافہ کرتا ہے اور ان کا بیانیہ انھیں دیگر فکشن نگاروں سے ممتاز کر دیتا ہے۔ ان خیالات کا اظہار مشہور ترجمہ نگار اور ڈین فیکلٹی برائے انسانی علوم والسنہ، جامعہ ملیہ اسلامیہ پروفیسر محمد اسد الدین نے ممتاز فکشن نگار خالد جاوید کے تازہ ترین ناول 'ایک خنجر پانی میں' کے حوالے سے شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے زیر اہتمام منعقدہ آن لائن مذاکرے میں صدارتی کلمات پیش کرتے ہوئے کیا۔ صدر شعبہ ماس کمیونی کیشن، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پروفیسر شافع قدوائی نے کہا کہ پروفیسر خالد جاوید نے ایک ایسے موضوع پر ناول لکھا جس میں روایت سے انحراف یا نئی راہ نکالنا دشوار تھا۔ کیوں کہ اس سے پہلے اردو میں وبا کو ایک ربانی سزا کے طور پر پیش کیا جاتا رہا ہے اور یہ سزا انسانی بداعمالیوں کے نتیجے میں خدا کی طرف سے دی جاتی ہے۔ لیکن خالد جاوید نے اس تصور سے اپنا دامن بچا لیا اور وبا کے مسئلے کو وجودی سطح پر لا کر اس کو ڈسکورس کا حصہ بنایا۔ انھوں نے اس ناول کو ایک گہرے وجودی تجربے کے حوالے سے دیکھنے پر زور دیا۔ کئی زبانوں پر یکساں دسترس رکھنے والی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ میں مرکز برائے اسپینی اور لاطینی امریکی کی استاد پروفیسر سونیا سوربھی گپتا نے اس ناول میں موجود گہرے سیاسی شعور اور سیاسی حسیت کے تناظر میں اس کی تعبیر کی کوشش کی۔ صدر شعبہ پروفیسر شہزاد انجم نے نظامت کے فرائض انجام دیتے ہوئے کہا کہ خالد جاوید جیسے ممتاز فکشن نگار کسی بھی ادارے کے لیے ایک بڑے اثاثے کا درجہ رکھتے ہیں۔ خالد جاوید کا ناول اس وبا سے پیدا شدہ صورتِ حال، اندوہناکیوں اور سفاک حقیقتوں کو جس شدت کے ساتھ پیش کرتا ہے اس میں ان کا کوئی ثانی نہیں۔ صاحب کتاب پروفیسر خالد جاوید نے اپنے ناول کے ایک منتخب حصے کی قرأت بھی کی۔ مشہور تانیثی نقاد اور استاد شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی پروفیسر نجمہ رحمانی نے خالد جاوید کے فکشن کے امتیازی پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہوئے کہا کہ وہ زندگی اور کائنات کے تمام اندھیروں کو جس طرح جذب کرتے ہیں اور ان کا بیانیہ اردو فکشن کو جن انوکھی جہتوں سے آشنا کرتا ہے وہ حیرت انگیز ہے۔ ان کا فکشن کبھی کبھی ناقابلِ فہم ہونے کے باوجود ایک انجانی قوت کے ساتھ ہمیں اپنی طرف کھینچتا ہے۔ مشہور ہندی ادیب و نقاد اور استاد شعبۂ ہندی، جامعہ ملیہ اسلامیہ پروفیسر نیرج کمار نے ناول میں اٹھائے گئے نئے ڈسکورس پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ خالد جاوید کا یہ ناول مابعد صداقت عہد سے پیدا ہونے والی زندگی کی پیچیدگیوں کو پیش کرتا ہے اور ایک انسان جس طرح وجودی سطح پر ایک کش مکش میں مبتلا ہے، اس مسئلے کو اس کے تمام امکانات کے ساتھ موضوع

بناتا ہے۔ مشہور ترجمہ نگار اور انگریزی و اردو کے شاعر ڈاکٹر عبدالنصیب خان نے کہا کہ یہ ناول عالمی وبائی ادب میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔ خالد جاوید نے عصری المناکیوں، وبا کے خوف، انسانی مصائب، بیماری کی ہمہ گیریت اور اشرف المخلوقات کی بے بضاعتی کو نرالے انداز میں پیش کیا ہے۔ مشہور تنقید نگار اور استاد شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ ڈاکٹر سرورالہدیٰ نے کہا کہ خالد جاوید اپنے بیانیے میں جس جگہ پر ہیں اس کے آس پاس ان کا کوئی ہمعصر نظر نہیں آتا ہے۔ انھوں نے مغربی تصورِ کائنات کو اپنے تخلیقی سانچے میں پیش کیا ہے۔ ادیب و شاعر اور استاد شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ ڈاکٹر خالد مبشر نے اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا کہ اس ناول کے اکثر جملوں میں فسانہ خیزی کی صفت بدرجہ اتم موجود ہے۔ پڑھتے ہوئے قاری عبارتوں سے پھوٹنے والی بہت سی کہانیوں میں الجھ جاتا ہے۔ خالد جاوید بنیادی طور پر وجودی فکشن نگار ہیں۔ ان کے یہاں دہشت خیزی، امراض، تعفن، غلاظتیں، زرد زرد فضا، انسانی درندگی اور موت جس شدید وجودی کرب کے ساتھ خلق پذیر ہوتی ہے اس کو منفی قدر قرار دینا درست نہیں، اس لیے کہ تمام مذاہب اور فلسفے میں حیات وکائنات کی الم زدگی قدرِ مشترک ہے۔

مذاکرے میں فرحت احساس، اشعر نجمی، پروفیسر کوثر مظہری، ڈاکٹر مکیش کمار مروتھا، رضوان الدین فاروقی، ڈاکٹر عمران احمد عندلیب، ڈاکٹر شاہ عالم، ڈاکٹر سید تنویر حسین، ڈاکٹر عادل حیات، ڈاکٹر جاوید حسن، ڈاکٹر ثاقب عمران اور ڈاکٹر ساجد ذکی فہمی بھی موجود تھے۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر خالد مبشر، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی 28 جولائی 2021

مہک

دیوبند: استاد شاعر شمیم کرتپوری کا مجموعۂ کلام 'مہک' مقبولیت کے تمام ریکارڈ اپنے نام کر رہا ہے، ان کے

مجموعۂ کلام میں حمد باری تعالیٰ، نعت رسول، غزلیں، نظمیں، قطعات وغیرہ سبھی اصناف سخن ہیں۔ انھوں نے ہجر و وصال، عشق مجازی، موجودہ حالات اور معاشرتی رویوں جیسے حساس موضوعات کو اپنی شاعری میں بحسن و خوبی ڈھالا ہے۔ ان خیالات کا اظہار دارالعلوم دیوبند کے استاذ مولانا سلمان بجنوری نقشبندی نے کیا۔ اتر پردیش اردو اکیڈمی کے سابق چیئرمین و عالمی شہرت یافتہ شاعر ڈاکٹر نواز دیوبندی نے کہا کہ شمیم کرتپوری کے مجموعہ کلام 'مہک' کو پڑھتے ہوئے اندازہ ہوتا ہے کہ کلام میں عاشقانہ رنگ نمایاں ہے، بلاشبہ یہ ایک اچھی کاوش ہے، ادبی فضاؤں میں یہ کتاب ایک نئے خیال اور نئی سوچ کے ساتھ شامل ہوئی ہے۔ شاعر عفیف سراج نے کہا کہ شاعری ہماری تہذیبی روایت ہے اور شمیم کرتپوری عمل سے بھرپور ایک زندہ شاعر ہیں۔ ان کی شاعری میں بلا تخصیص نیک و بد، زندگی کے کم وبیش تمام عناصر کا بھرپور اور متوازن اظہار ایک تسلسل کے ساتھ نمایاں ہوتا چلا گیا ہے۔ زندگی کے ان عناصر کا تعلق شاعر کی ذات اور شخصیت سے آراستہ اور پیوستہ ہے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' 20 جولائی 2021

دل

سلطانپور: حاجی ایوب اللہ خان ایڈوکیٹ کے والد عاشق اللہ خاں کے یوم وفات کے موقعے پر رحمت فاؤنڈیشن امیٹھی کی جانب سے ایک شعری نشست ایوب اللہ خان ایڈوکیٹ کی قیام گاہ پر منعقد ہوئی جس میں ڈاکٹر وجہ القمر کے شعری مجموعہ 'دل' کی رسم اجرا بھی عمل میں آئی۔ نشست کی صدارت صوبہ اڈیشا کے ضلع بھدرک سے تشریف لائے استاد و بزرگ شاعر الطاف نادر نے کی اور نظامت کے فرائض عامل سلطانپوری نے انجام دیے۔ آغاز نعت پاک سے شعیب ایڈوکیٹ اور اسعد احمد نے کیا۔ رحمت فاؤنڈیشن کے ترجمان ڈاکٹر قاسم درگاہی نے فاؤنڈیشن کا تعارف کراتے ہوئے فاؤنڈیشن کے ذریعے کیے جارہے ادبی و فلاحی کاموں پر تفصیل سے روشنی ڈالی اور مستقبل کے منصوبے بتائے۔ رحمت فاؤنڈیشن کے سرپرست حاجی ایوب اللہ خان ایڈوکیٹ نے خطبہ استقبالیہ پیش کرتے ہوئے اپنے والد عاشق اللہ خان مرحوم کے سماجی وعلمی کارناموں کو بتایا۔ بعدازاں ڈاکٹر وجہ القمر کے شعری مجموعہ 'دل' جس میں دل کو موضوع بناتے ہوئے دل ردیف پر 786 اشعار کہے ہیں، کی رسم اجرا صدر نشست الطاف نادر بھدرک اڈیشا کے بدست عمل میں آئی۔ مولانا عالم ندوی ریٹائرڈ پروفیسر مہاراشٹر کالج ممبئی نے مجموعہ 'دل' پر سیر حاصل گفتگو کی اور کہا کہ اردو ادب کی تاریخ میں یہ ایک انوکھا کارنامہ ہے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 2 اگست 2021

'جدید بھارت کی پہلی مسلم خاتون معلمہ فاطمہ شیخ'

اورنگ آباد: بھارت کی پہلی مسلم خاتون معلمہ فاطمہ شیخ نامی تیلگو و انگریزی کتاب کا اجرا ریڈ اینڈ لیڈ فاؤنڈیشن کے آفس قیصر کالونی اورنگ آباد میں سینئر صحافی

سداشیو کھنڈالکر کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ مشہور مورخ درجنوں کتابوں کے مصنف، مترجم مولف سید نصیر احمد نے بھارت کی پہلی مسلم خاتون فاطمہ شیخ پر پہلی جامع کتاب تیلگو زبان میں لکھی جس کا انگریزی ترجمہ بی وی کے پروناندن (The Firt Muslim Woman Teacher of Modern India Fathima Shaik) کے عنوان سے کیا ہے آج اس کتاب کا اجرا عمل میں آیا۔ اس موقعے پر مقرر خصوصی ڈاکٹر ذاکر پٹھان وائس پرنسپل بدناپور کالج نے فاطمہ شیخ اور مصنف کے بارے میں تفصیل سے بتاتے ہوئے کہا کہ فاطمہ شیخ کی خدمات اور کارناموں پر جس طرح سے کام ہونا چاہیے تھا وہ نہیں ہوسکا۔ ابتدا میں کتاب اور مصنف کا تعارف پروگرام کی غرض و غایت بیان کرتے ہوئے فاؤنڈیشن کے صدر مرزا عبدالقیوم ندوی نے بتایا کہ آج کے دور میں کتاب لکھنا، شائع کرنا اور اس کے بعد کتاب کا اجرا کرنا بہت مشکل کام ہوگیا ہے۔ سینئر صحافی اور اوبی سی لیڈر سداشیو کھنڈالکر نے کہا کہ آج کے دور میں قومی یکجہتی اور خواتین میں مل جل کر کام کرنے کی اعلیٰ مثال اگر کوئی دی جاسکتی ہے تو وہ فاطمہ شیخ ان کے بھائی عثمان شیخ اور مہاتما جیوتی با پھلے ان کی بیوی ساوتری بائی پھلے کی زندگی وکارناموں کی دی جاسکتی ہے۔ تقریب رسم اجرا میں امان اللہ موتی والا اردو ہائی اسکول کے صدر مدرس خان جمیل احمد طیب ظفر (ہیومن رائٹس) مہمانان خصوصی کی حیثیت سے موجود تھے۔ جب کہ پروگرام کی نظامت مرزا ابوالحسن علی نے کی اور مہمانوں کا استقبال وشکریہ مرزا ورلڈ بک ہاؤس کے منیجر مرزا طالب بیگ نے ادا کیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 26 جولائی 2021

'ہندتوا کا مطلب بھارتیہ یک جہتی۔ مسلم منافرت نہیں'

ناگپور: راشٹر سنت تکڑوجی مہاراج ناگپور یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر ڈاکٹر ایس این پٹھان کی مراٹھی خودنوشت سوانح حیات 'ہندتوا مھنجے بھارتیہ یکاتمتا۔ مسلم دویش نھہوے' کا اردو ترجمہ اردو کے معروف قلمکار ڈاکٹر محمد اظہر حیات نے کیا ہے۔ 288 صفحات پر مشتمل اس

کتاب کا نام 'ہندتوا کا مطلب بھارتیہ یک جہتی۔ مسلم منافرت نہیں' ہے۔ اس اردو کتاب کا اجرا مرکزی وزیر عالی جناب نتن گڈکری صاحب کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ سادہ اور پروقار تقریب میں اجرا کے بعد وزیر موصوف نے کتاب کے مترجم ڈاکٹر اظہر حیات کی کاوشوں کو سراہا اور مبارکباد دیتے ہوئے فرمایا۔ اس قسم کی کتابیں اردو میں شائع ہونی چاہئیں جس سے آپسی غلط فہمیوں کا ازالہ ہوگا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر اظہر حیات کے ہمراہ سابق جنرل مینیجر بھارتیہ اسٹیٹ بینک شیخ عبدالوحید، نثار اختر انصاری، سہیل خان، شاہد حیات اور دیگر احباب موجود تھے۔

پریس ریلیز: اظہر حیات، مہاراشٹر، 27 جولائی 2021

بے خیالی

دیوبند: شمیم کرتپوری کے صاحبزادے کاشف اختر کے مجموعہ کلام 'بے خیالی' کی رسم اجرا محمود ہال میں عمل میں آئی۔ پروگرام کا آغاز ڈاکٹر ندیم شاد کی نعت پاک سے ہوا۔ اس موقعے پر دارالعلوم دیوبند کے استاذ مولانا سلمان بجنوری نے کہا کہ اردو شاعری صدیوں پر مشتمل اپنا سفر طے کرکے آج اس مقام پر کھڑی ہے، اس پر اظہار خیال تو نقادان فن کا کام ہے۔ ممتاز ادیب مولانا نسیم اختر شاہ قیصر نے کہا کہ دیوبند میں شعر و سخن کا سلسلہ قدیم ہے اور زمانہ طویل سے اس میدان میں بھی یہاں کے شاعروں نے ملکی سطح پر اپنی موجودگی کا بھرپور احساس کرایا ہے۔ انھوں نے کہا کہ حضرت حبیب وحشی سے اس کی شروعات ہوئی، پھر انور صابری، عامر عثمانی، عمر فاروق عاصم، تاج دارتاج، مولانا قمر عثمانی، مولانا کفیل الرحمٰن نشاط عثمانی سے لے کر عبداللہ راہی، ڈاکٹر نواز دیوبندی، شمس دیوبندی، ہارون حسرت، شمیم کرت پوری وغیرہ سے ہوتا ہوا کاشف اختر تک پہنچا ہے۔ صدارت مولانا سلمان بجنوری اور نظامت کے فرائض معروف قلم کار کمل دیوبندی نے انجام دیے۔ اس موقعے پر شہر کے مؤقر افراد موجود تھے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 13 جولائی 2021

انصاری احسان الرحمٰن کی کتاب 'آئینۂ صحافت: چالیس سالہ صحافتی خدمات'

آئینۂ صحافت: چالیس سالہ صحافتی خدمات

مالیگاؤں: شہر مالیگاؤں کے سینئر صحافی انصاری احسان الرحیم کی صحافتی کتاب آئینۂ صحافت کا اجرا بروز اتوار 11 جولائی 2021 کو اکسس ہال قدوائی روڈ پر کامیابی سے ہمکنار ہوا۔ اس تقریب کی صدارت روزنامہ ہندوستان ممبئی اخبار کے مدیر سرفراز آرزو نے کی۔ بطور مہمان خصوصی سرجن ڈاکٹر سعید فارانی، ٹائمز آف انڈیا کے اسسٹنٹ ایڈیٹر متین حفیظ 'ایشیا ایکسپریس' کے مدیر شارق نقشبندی، سابق کونسلر یونس عیسیٰ ڈاکٹر الیاس وسیم صدیقی، رضوان بیٹری والا اور عزیز مقادم نے کتاب اور صاحب کتاب پر تاثرات پیش کیے۔

سرفراز آرزو نے صدارتی خطبے میں کہا کہ ہندوستان میں اردو صحافت نے بہت اہم رول ادا کیا اور آج بھی کر رہی ہے۔ مالیگاؤں شہر کی چالیس سالہ صحافت پر مبنی کتاب آئینۂ صحافت یقیناً آنے والی نسلوں کے لیے مشعل راہ ثابت ہوگی۔ کیونکہ انصاری احسان الرحیم نے غیر جانبدار صحافت انجام دی اور ان کے قلم سے لکھے ہوئے مضامین، خبروں، اسٹوریز، انٹرویوز اور دینی، ملی، تعلیمی، سماجی و سیاسی سرگرمیوں کو یکجا کرکے کتابی شکل دی۔ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد مالیگاؤں میں اردو صحافت کا اہم کردار محسوس ہونے لگے گا۔ پروگرام کی نظامت رضوان ربانی نے بخوبی نبھائی۔ صاحب کتاب کا تعارف صحافی مختار عدیل نے پیش کیا۔ عمران راشد نے سپاس نامہ کی خواندگی کی۔

اس موقعے پر بطور مہمان کرام محمد مکی سیٹھ عبدالملک سیٹھ بکرا، لطیف عزیز، لطیف جعفری، سلیم رضوی، خیال انصاری، خیال اثر، حارث قادری، دستگیر ایم اے، منصور اکبر، زاہد دیوان، حلیم صدیقی، عتیق خطیب، احتشام بیکری والا، عرفان صدیقی، ناصر رائل، ریاض بنکر اور دیگر لوگوں نے شرکت کی۔ اخیر میں ڈاکٹر مبین نذیر نے رسم شکریہ ادا کی۔

پریس ریلیز، مالیگاؤں فرنٹ، 12 جولائی 2021

غالب ایک جائزہ

حیدرآباد: ڈاکٹر عسکری صفدر نے اپنے وجود کے نہاں خانے میں تحقیق و جستجو کا دیا گذشتہ تیس برسوں سے جلائے رکھا ہے۔ ان کی تحقیق غالب کے حوالے سے وسیع تر معلومات کا ماخذ اور دلچسپ انکشافات کا مخزن ہے۔ ڈاکٹر قطب سرشار نے اجلاس کے خطبہ صدارت میں بتاریخ 10 جولائی بروز ہفتہ میڈیا پلیس عابڈز میں مرزا غالب اکیڈمی حیدرآباد میں ڈاکٹر عسکری صفدر کی کتاب کے حوالے سے اظہار خیال فرمایا۔ پروفیسر اشرف رفیع سابق صدر شعبہ اردو جامعہ نے کتاب کی رسم اجرا انجام دینے کے بعد اجلاس سے خطاب کے دوران کتاب کے نفس مضمون کے حوالے سے کتاب کے تمام موضوعات کا احاطہ کرتے ہوئے بتایا کہ ڈاکٹر عسکری میری شاگردہ ہیں۔ انھیں ابتدا ہی سے تحقیق کاری سے لگاؤ رہا ہے۔ حیدرآباد کی شاعرات اور دکنی ادب کے محققین میر ببر علی انیس کے حوالے سے ان کی تحقیقی تصانیف منظر عام پر آچکی ہیں۔ تازہ تصنیف 'غالب ایک جائزہ' میں غالب کی علمی و فکری کاوشوں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ ان میں بعض مضامین موضوعی اور معنوی جہت سے اچھوتے اور معلومات آفریں ہیں۔ پروفیسر فاطمہ پروین سابق صدر شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ نے ڈاکٹر عسکری صفدر کی کتاب کے مضامین کو موضوع گفتگو بناتے ہوئے استدلال فرمایا کہ ڈاکٹر عسکری صفدر کی تحقیقی جہد کاری وقیع تر ہے۔ اس کے تمام تر مضامین نہایت دقت نظر کے ساتھ لکھے گئے ہیں۔

اجلاس کی تمام تر کاروائی اردو کے ممتاز ادیب و شاعر محبوب خان اصغر معتمد عمومی مرزا غالب اکیڈمی نے چلائی۔ انھوں نے اجلاس کے مقررین و صدر اجلاس کے حوالے سے عمدہ تعارفی کلمات کہے۔ اس موقعے پر ڈاکٹر عسکری صفدر کی جانب سے صدر اجلاس ڈاکٹر قطب سرشار،

پروفیسر اشرف رفیع مشیر اعلیٰ مرزا غالب اکیڈمی حیدرآباد اور مہمان خصوصی پروفیسر فاطمہ پروین اور جناب سید امتیاز الدین کی گلپوشی اور شال پوشی کی گئی۔ ان کے علاوہ حاضرین اجلاس میں ڈاکٹر جاوید کمال اور ممتاز سماجی جہدکار ادیبہ رفعیہ نوشین نے معزز مہمانان اجلاس کی گلپوشی فرمائی۔

پریس ریلیز: محبوب خان اصغر، معتمد عموی مرزا غالب اکیڈمی

11 جولائی 2021

عکس ادب اردو

اورنگ آباد: بیت الاشرف رشید پورہ اورنگ آباد میں

بوقت صبح گیارہ بجے منجانب عکس ادب ایک خوب صورت محفل سجائی گئی، جس میں محفل افسانچہ، رسم اجرا و مشاعرے کے تین اجلاس منعقد ہوئے۔ پہلا اجلاس صبح ساڑھے گیارہ بجے ڈاکٹر شیخ عظیم الدین کی تلاوتِ قرآن سے شروع ہوا۔ اس اجلاس میں نورالحسنین کی صدارت میں افسانچہ خوانی کی گئی جس میں ڈاکٹر یوسف صابر، ڈاکٹر عظیم راہی، ڈاکٹر نخشب مسعود، معز ہاشمی اور ایم مبین نے اپنے منتخب افسانچے سنائے۔ صدرِ محفل افسانچہ خوانی نورالحسنین نے افسانچہ خوانی کی تعریف کرتے ہوئے افسانچہ کے فن پر اپنے خیالات صدارتی خطبہ میں پیش کیے۔ اس پروگرام کی نظامت ڈاکٹر یوسف صابر نے بخوبی انجام دی۔

دوسری نشست میں خلیق الزماں نصرت پر خصوصی گوشۂ عکس ادب کا اجرا صدر مجلس ڈاکٹر شیخ عظیم الدین کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ اسی نشست میں بدست ڈاکٹر یوسف صابر توشیحی نظم کے فریم کے ساتھ خلیق الزماں نصرت کو اُن کے تحقیقی کام پر عکس ادب ایوارڈ سے نوازا گیا۔ اس مجلس میں خلیق الزماں نصرت کی ادبی خدمات پر ڈاکٹر نخشب مسعود اور ایم مبین نے اپنے خیالات پیش کیے اور ڈاکٹر یوسف صابر نے توشیحی نظم پڑھ کر سنائی۔ اس محفل کے صدر ڈاکٹر شیخ عظیم الدین نے عکس ادب کے کاموں کو سراہتے ہوئے خلیق الزماں نصرت کی ادبی خدمات پر خوشی کا اظہار کیا۔

اس بزم کی نظامت کے فرائض ایسوسی ایٹ پروفیسر ڈاکٹر رفیع الدین ناصر نے بحسن وخوبی انجام دیے۔ تیسری اور آخری نشست میں اسلم مرزا کی صدارت میں مشاعرہ ہوا۔ اس مشاعرہ میں عاصم رضی، احمد اورنگ آبادی، ذکی صدیقی، شفیع احمد شفیع (پربھنی)، ڈاکٹر نخشب مسعود (مالیگاؤں)، معز ہاشمی، ڈاکٹر یوسف صابر، خلیق الزماں نصرت (بھیونڈی) اور صدر محفل اسلم مرزا نے اپنا منتخب کلام سنا کر داد وتحسین حاصل کی۔ اس مشاعرے کی نظامت شفیع احمد شفیع نے کی۔ ڈاکٹر رافع (ناندیڑ)، احمد خاں ایم اے، سرتاج شاکر (سابقہ ڈپٹی ایجوکیشن آفیسر اورنگ آباد) اور ڈاکٹر عبدالعزیز عرفان بطور خصوصی مہمانان موجود تھے۔ ڈاکٹر یوسف صابر کے شکریہ کے ساتھ تین بجے یہ پروگرام اختتام پذیر ہوا۔

پریس ریلیز: شکیل خان، مہاراشٹر، 13 جولائی 2021

چار کتابوں کا اجرا

دیوبند: حجۃ الاسلام اکادمی دارالعلوم وقف دیوبند کی لائبریری میں اکیڈمی کی چار اہم مطبوعات کا اجرا عمل میں آیا۔ نو مطبوعہ کتب میں سرفہرست دو جلدوں پر مشتمل 'فتاویٰ دارالعلوم وقف دیوبند' کے علاوہ 'موقف الامام محمد قاسم النانوتوی' (عربی)، انتصارالاسلام (انگریزی) اور 'قصائد قاسمی' شامل ہیں۔ اس موقعے پر مہتمم مولانا محمد سفیان قاسمی نے کتابوں کا اجرا کرتے ہوئے کہا کہ کورونائی دور کے اس وحشت انگیز، تشویشناک ونامساعد احوال کو کارآمد ومفید بنانے میں دارالعلوم وقف دیوبند کا کردار مثالی و تقلیدی رہا ہے۔ چاہے تعلیم وتعلم سے متعلق ہو یا بحث و تحقیق سے، طلبہ کے تعلیمی سال کے تحفظ اور ان کے تعلیمی حرج کے تدارک کا مسئلہ ہو یا پھر اساتذہ کے لیے اس اجباری فرصت کو کارآمد بنانے کا مرحلہ ہو، ہر جگہ دارالعلوم وقف دیوبند نے احوال زمانہ کی ضروریات کا ادراک کرتے ہوئے جس حسن انتظام کے ساتھ اپنے منظم و مرتب نظام العمل کے زیر اثر اہم علمی و تحقیقی امور انجام دیے ہیں وہ یقیناً تمام علمی دوائر کے لیے لائق تقلید ہیں اور ان اہم علمی و تحقیقی خدمات کے تسلسل کے لیے جملہ افراد کار کے ساتھ خاص طور پر اکادمی کے ڈائرکٹر و ادارہ کے نائب مہتمم مولانا ڈاکٹر محمد شکیب قاسمی کی شبانہ روز سعی پیہم کو خراج تحسین پیش ہے۔ ان کتب کی طباعت کے ساتھ اکیڈمی کا سفر ابھی رکا نہیں ہے بلکہ مزید تیز گام ہے، جلد ہی اکیڈمی اپنی مزید علمی کاوشیں پیش کرے گی۔ دارالعلوم وقف دیوبند کے شیخ الحدیث مولانا احمد خضر شاہ مسعودی نے مولانا ڈاکٹر محمد شکیب قاسمی کو ہدیہ تہنیت پیش کرتے ہوئے کہا کہ یہ مطبوعات علم وتحقیق کی دنیا کی عظیم شاہکار اور دارالعلوم وقف دیوبند کے مثالی علمی و تحقیقی ذوق کی عکاس ہے۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 14 جولائی 2021

وفیات

پدما سچدیو

جموں: ڈوگری اور ہندی زبان کی مشہور ادیبہ پدما سچدیو کا 81 سال کی عمر میں 4 اگست 2021 کو انتقال ہوگیا۔ وہ ڈوگری زبان کی پہلی جدید شاعرہ تھیں۔ انھیں 1971 میں ساہتیہ اکادمی اور 2001 میں پدم شری ایوارڈ سے نوازا

گیا۔ ان کی پیدائش 17 اپریل 1940 کو پورمنڈل جموں میں ہوئی۔ ان کے والد جے دیو سنسکرت کے بڑے اسکالر تھے۔ 1961 میں آل انڈیا ریڈیو جموں سے بطور اناؤنسر وابستہ ہوئیں۔ آکاش وانی ممبئی سے بھی منسلک رہیں۔ انھوں نے کئی ہندی فلموں میں گانے بھی لکھے۔ ڈوگری زبان میں ان کی وہی اہمیت تھی جو ہندی میں مہادیوی ورما اور پنجابی میں امریتا پریتم کو حاصل تھی۔ انھیں 'میری کویتا میرے گیت' کے لیے 1977 میں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ ملا اور 2001 میں پدم شری ایوارڈ دیا گیا۔ انھیں ان کی سوانح عمری 'بوند باوری' کے لیے 2015 میں سرسوتی سمان بھی ملا۔ اس کتاب کا ترجمہ انگریزی میں اوما واسودیو نے 'A Drop in the ocean' کے نام سے کیا ہے۔ 2019 میں انھیں ساہتیہ اکادمی فیلوشپ بھی ملی۔ انھوں نے شاعری اور کہانی کے علاوہ ناول، انٹرویوز، مضامین اور سفرنامے بھی لکھے ہیں۔ وہ اردو زبان سے اچھی طرح واقف تھیں۔ ان کے یہاں منعقدہ محفلوں میں بڑے بڑے ادیب وشعرا شریک ہوتے تھے۔ عصمت چغتائی، ڈاکٹر

دھرم ویر بھارتی، علی سردار جعفری، شیو کمار شرما، استاد اللہ رکھا سمیت درجنوں شعرا اور مصنفین ان کے گھر آیا کرتے تھے۔

نوبھارت ٹائمز، راشٹریہ سہارا ہندی اور فیس بک ذرائع سے 5 اگست 2021

پروفیسر نصیر احمد خان

نئی دہلی: جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے اسکول آف لینگویج کے سینٹر فار انڈین لینگویجز کے سربراہ اور اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی میں ایڈوائزر کے عہدے پر رہ چکے

پروفیسر نصیر احمد خاں کا طویل علالت کے بعد 3/ اگست کی صبح کو انتقال ہوگیا۔ ان کی تدفین اوکھلا کے قبرستان میں شام کو عمل میں آئی۔ ان کی تدفین کے موقعے پر محبان اردو بڑی تعداد میں موجود تھے۔ پروفیسر نصیر احمد خان کی اردو کے تئیں خدمات کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ ان کے پڑھائے ہوئے سیکڑوں طلبہ آج مختلف یونیورسٹیوں اور کالجوں میں درس وتدریس کی ذمے داریاں نبھا رہے ہیں۔ پروفیسر نصیر احمد خاں کی مرتب کردہ دو جلدوں پر محیط 'جدید ہندی اردو شبد کوش' کو کافی مقبولیت حاصل ہے۔ اس کے علاوہ ان کی اردو لسانیات (1990)، ادبی اسلوبیات (1994)، اردو ساخت کے بنیادی عناصر، لسانیات کیا ہے (2000)، اردو کی صوتی لغت (2014) وغیرہ مشہور کتابیں ہیں۔ پروفیسر نصیر احمد خان نے جے این یو سے سبکدوش ہونے کے بعد اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی سے وابستگی اختیار کی اور وہاں ایڈوائزر کی حیثیت سے کام کرتے ہوئے انھوں نے شعبۂ اردو کھلوانے میں بہت اہم رول ادا کیا۔ عالمی اردو ٹرسٹ کے سربراہ اے رحمان نے بھی نصیر احمد خاں مرحوم سے اپنے گہرے روابط اور دوستی کا ذکر کرتے ہوئے ان کو یاد کیا اور ان کے انتقال پر ملال پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ نصیر احمد خاں کی خدمات کو اردو داں طبقے کے لوگ ہمیشہ یاد رکھیں گے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 4 اگست 2021

الحاج محمد نذیر احمد

حیدرآباد: چیرپرسن بورڈ آف اسٹڈیز عثمانیہ یونیورسٹی شعبۂ اردو الحاج ڈاکٹر محمد نذیر احمد صاحب 20/جولائی کو اپنے مالک حقیقی سے جاملے۔ محمد نذیر احمد صاحب اردو اور سماج کے خاموش خدمت گار تھے۔ بحیثیت استاد محمد نذیر احمد صاحب اردو، انگریزی اور تلگو تینوں زبانوں پر مہارت رکھتے تھے۔

موصوف اساتذہ اور طلبا کی تعلیم وتربیت، ذہن سازی اور شخصیت سازی اس طرح کرتے کہ ان کی زندگی ہی بدل کر رکھ دیتے۔ انھیں روایت شکن بھی کہا جاتا ہے کیونکہ نذیر صاحب نے نہ صرف جامعہ عثمانیہ شعبۂ اردو پر عرصے دراز سے چھائے ہوئے سکوت کو توڑا بلکہ بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق اور بابائے دکنیات ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کی اس روایت کو زندہ کردیا جس میں جامعہ عثمانیہ شعبۂ اردو کی فعالیت اور کارکردگی کے لیے شاگردوں کی مخصوص ٹیم تیار کی جاتی تھی۔ نذیر احمد صاحب کی ایک کتاب شائع ہوچکی ہے اور تین کتابیں زیر طباعت ہیں۔

محمد نذیر احمد صاحب نے گوشۂ گمنامی میں رہ کر ہی علمی وادبی اور سماجی خدمات کے لیے خود کو وقف کردیا۔ محمد نذیر احمد صاحب کی وفات اردو دنیا اور سماج کے لیے ناقابل تلافی نقصان ہے۔

پریس ریلیز: سیدہ تسنیم سلطانہ، حیدرآباد، 9 اگست 2021

قمر سنبھلی

سنبھل: تاریخی شہر سنبھل سے تعلق رکھنے والے کہنہ مشق شاعر جناب قمر سنبھلی کا 14 اگست 2021 بروز سنیچر رات گیارہ بجے لکھنؤ کیپ ویل روڈ پر واقع مکان میں انتقال

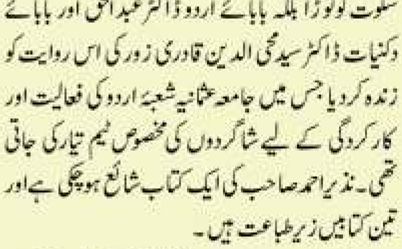

ہوگیا۔ ان کی عمر 80 سال تھی۔ ان کی پیدائش 1942 میں ہوئی۔ مشہور شاعر ظاہر حیدرآبادی سے ان کو تلمذ حاصل تھا۔ ان کے والد قاری حکیم الدین سنبھلی تھے۔ دارالعلوم ندوۃ العلما کے سابق شیخ التفسیر مولانا محمد برہان الدین سنبھلی کے برادر خرد تھے۔ ان کی مطبوعہ تصنیفات میں آواز کا لمس، پھول آنگن کے، جزیرے خواب کے، روشن روشن حرف، ادبی شخصیات میری نظر میں قابل ذکر ہیں۔ غیر مطبوعہ تصنیفات کی تعداد بھی تقریباً 10 ہے۔ ان کے پسماندگان میں تین صاحبزادیاں ہیں۔ ان کی نماز جنازہ دارالعلوم ندوۃ العلما کے مہتمم مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی نے احاطہ دارالعلوم میں پڑھائی اور ڈالی گنج قبرستان میں ان کی تدفین عمل میں آئی۔

بحوالہ قندیل آن لائن

خواجہ شبیر الزماں

گیا: صحافی ومصنف خواجہ شبیر الزماں پیر بیگھوی کا 5 اگست کی صبح 75 برس کی عمر میں اپنے وطن گیا ضلع کے پیر بیگھہ کے آبائی مکان میں انتقال ہوگیا۔ مرحوم گذشتہ ایک ہفتہ سے سخت علیل تھے۔ وہ ایک نیک دل انسان تھے۔ ان کے انتقال سے دوستوں اور چاہنے والوں میں سوگ کا ماحول ہے۔ انھوں نے کئی کتابیں تحریر کیں۔ سلسلۂ صوفیا سے بھی ان کا تعلق تھا اور اس موضوع پر انھوں نے کتاب بھی قلم بند کی۔ وہ روزنامہ 'ان دنوں' کے ساتھ آئی این ایس انڈیا اور یو این این جیسی نیوز ایجنسیوں سے وابستہ رہے۔ وہ صاف دل اور حق گو انسان تھے۔ اردو کی معروف نیوز ایجنسی یو این این کے لیے انھوں نے کئی سال تک کام کیا اور بہت سے مضمون قلم بند کیے۔ ان کے مضامین ملک کے متعدد اخبارات میں شائع ہوتے تھے۔ ان کا قلم رواں تھا، اس لیے ضعف اور بیماری کے باوجود مضامین لکھتے تھے۔ مرحوم نے اپنے پیچھے اہلیہ و 3 بیٹے اور 5 بیٹیاں چھوڑی ہیں۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 6 اگست 2021

خراج عقیدت

ریاض عظیم آبادی و نسیم پھلواری

پٹنہ: ریاست بہار میں ایسے دو سپوتوں کو آج خراج عقیدت پیش کیا گیا جن کی صحافتی خدمات کا اعتراف ہر کس وناکس کو ہے۔ نئی نسل کو آگے آکر صحافتی خدمات کے ذریعے تیز وتند ہواؤں کے سامنے نئی شمع جلانی ہوگی تب ہی اردو صحافت کا کارواں بام عروج پر پہنچے گا۔ یہ باتیں مشہور و معروف صحافی ڈاکٹر ریحان غنی نے اردو بھون میں 'اردو میڈیا' کے زیر اہتمام منعقد ممتاز وبیباک صحافی ریاض عظیم آبادی ونسیم پھلواری کی تعزیتی نشست میں صدارتی خطاب میں کہیں۔ انھوں نے کہا کہ صحافت کسی کی جاگیر نہیں ہے جو محنت کرکے آگے آئے گا وہی کامیاب وکامران ہوگا۔ انھوں نے کہا کہ ریاض عظیم آبادی نہ صرف ایک صحافی تھے بلکہ اردو تحریک کے مضبوط ستون تھے۔ مختلف تحریکوں میں شامل ہونا اور اس کو کامیاب کرانے کا ہنر جانتے تھے۔

تعزیتی نشست سے خطاب کرتے ہوئے مشہور افسانہ نگار و بہار اردو اکادمی کے سابق سکریٹری مشتاق احمد نوری نے کہا کہ ریاض عظیم آبادی میرے ہم عصر صحافی تھے، ان سے دیرینہ تعلقات بھی رہے۔ ریاض عظیم آبادی نے آخری عمر تک سچائی و حقائق سے سمجھوتہ نہیں کیا۔ جس طرح انھوں نے میدان صحافت میں اپنا لوہا منوایا وہ کسی سے مخفی نہیں ہے۔ انھوں نے کہا کہ بہار کی صحافت کا المیہ ہے کہ زندگی میں جو صحافیوں کی مدد نہیں کرسکتے وہ مرنے کے بعد کیا کریں گے؟ سابق رکن اسمبلی و نامور صحافی ڈاکٹر اظہار احمد نے کہا کہ نسیم پھلواری بہت نیک فعال پر مزاح کاپی ایڈیٹر تھے۔ وہ تاحیات اردو سے وابستہ رہے اور انھوں نے اپنے بچوں کو اپنی کاوشوں کی بنیاد پر اعلیٰ تعلیم سے آراستہ کیا وہ ہم سبھوں کے لیے ایک سبق ہے۔ سینئر صحافی سید شہباز نے کہا کہ ریاض عظیم آبادی نے جو اردو و ہندی صحافت میں کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں اس کی مثالیں کم ملتی ہیں۔ ممتاز صحافی راشد احمد نے کہا کہ ریاض عظیم آبادی کی بے باکی اظہر من الشمس ہے۔ ان کی خدمات کا احاطہ ابھی مشکل ترین امر ہے۔ وہ ہمیشہ حقائق کی بنیاد پر صحافتی خدمات انجام دیتے رہے۔ ان کی تحریر نہ صرف ایک تحریک کی شکل اختیار کرتی رہی بلکہ نئی نسل کے صحافیوں کے لیے ایک سبق بھی ہے۔ معروف ادیب و افسانہ نگار فخر الدین عارفی نے کہا کہ اردو تحریک کے ذریعے ہی بہار میں اردو کو سرکاری زبان کا درجہ ملا جس میں ریاض عظیم آبادی بھی شامل تھے۔

روزنامہ 'سچ کی آواز' دہلی، 16 جولائی 2021

نصرت ظہیر

نئی دهلی: طنز و مزاح کے مشہور صحافی نصرت ظہیر کو ان کے یوم وفات کے موقعے پر یاد کیا گیا، اس موقعے پر اپنے ایک بیان میں آل انڈیا قومی تنظیم دہلی پردیش کے صدر بابو خان وارثی نے کہا کہ نصرت ظہیر کے انتقال سے جہاں ایک جانب اردو ادب کے محبان نے ایک اچھا صحافی کھودیا ہے وہیں نصرت ظہیر کے انتقال سے انھیں ذاتی طور پر بھی نقصان ہوا ہے۔ وارثی نے مزید بتایا کہ نصرت ظہیر کا شمار طنز و مزاح نگار مجتبیٰ حسین کے بعد آتا ہے، واضح رہے کہ گزشتہ برس نصرت ظہیر اڑسٹھ سال کی عمر میں انتقال کر گئے تھے جن کی تدفین سہارنپور کے دینی قبرستان میں پورے سرکاری اعزاز کے ساتھ عمل میں لائی گئی تھی۔ ان کے پسماندگان میں اہلیہ اور چار بیٹیاں ہیں، مرحوم نصرت ظہیر بقلم خود، تحت اللفظ، خرانٹوں کا مشاعرہ کے مصنف تھے، وہ کافی عرصے تک روزنامہ اردو 'قومی آواز' سے وابستہ رہے، جب کہ روزنامہ 'انقلاب' میں بھی ہفتہ واری کالم 'نمی دانم' اپنے آخری وقت تک لکھتے رہے، مرحوم نے ایک سہ ماہی رسالہ 'ادب ساز' بھی نکالا جب کہ قومی اردو کونسل کے رسالے سہ ماہی فکر و تحقیق، ماہنامہ اردو دنیا اور ماہنامہ بچوں کی دنیا کی اعزازی ادارت بھی کی، ان کو خراج عقیدت پیش کرنے والوں میں بابو خان وارثی کے علاوہ سوشل اینڈ آرٹی آئی ایکٹیوسٹ محمد شاہد گنگوہی، اوے یر انڈیا کے محمد ندیم، اسعد میاں، فیاض الدین، دہلی انجمن کے صدر ذاکر حسین وغیرہ بھی شامل تھے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 23 جولائی 2021

Subscription Form "Urdu Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'اردو دنیا' کا/کی سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

150 روپے کا ڈرافٹ/ منی آرڈر................ بتاریخ................ بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرتعاون سالانہ -/150 روپے A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'اردو دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

پتہ : ....

....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159, E-mail.:sales@ncpul.in

دستخط

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

اردو شاعری میں قومیت کا تصور

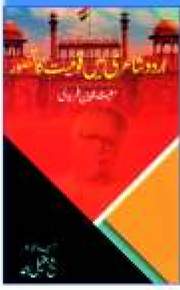

مصنف: مغیث الدین فریدی

ترتیب وتقدیم: شیخ عقیل احمد

سنہ اشاعت: 2021

صفحات: 234، قیمت 135 روپے

مسلم حکومت کے دوران ہندوستان میں علم کا فروغ

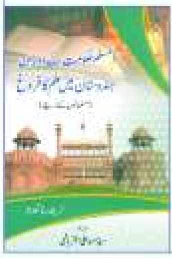

مصنف: نریندر ناتھ لا

مترجم: سید مسرور علی اختر ہاشمی

پہلی اشاعت: 2021

صفحات: 177، قیمت: 110 روپے

اردو کیسے لکھیں؟

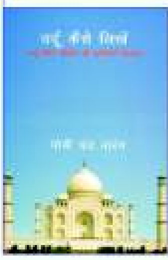

مصنف: گوپی چند نارنگ

تیسری طباعت: 2021

صفحات: 104

قیمت: 58 روپے

پریم چند

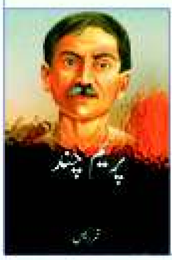

مصنف: قمر رئیس

تیسری طباعت: 2021

صفحات: 53

قیمت: 40 روپے

اردو صحافت (1858 سے 1900 تک کا ایک مختصر جائزہ)

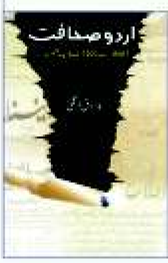

مصنف: فاروق ارگلی

پہلی اشاعت: 2021

صفحات: 191

قیمت: 110 روپے

اردو سفرناموں میں ہندوستانی تہذیب وثقافت

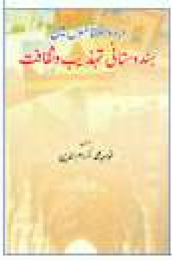

مرتب: خواجہ محمد اکرام الدین

دوسری اشاعت: 2021

صفحات: 504

قیمت: 235 روپے

مبادیات صحافت وادارت

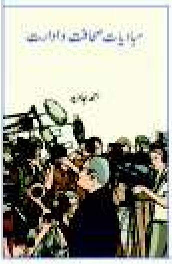

مصنف: احمد جاوید

پہلی اشاعت: 2021

صفحات: 128

قیمت: 45 روپے

انوکھے شکاری

مصنف: شمس الاسلام فاروقی

پہلی اشاعت: 2021

صفحات: 16

قیمت: 20 روپے

شعبہ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

उर्दू दुनिया, मासिक, सितम्बर-२०२१,वर्ष:२३, अंक:०९
URDU DUNIYA Monthly, September-2021, Vol.23, Issue:09
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2020-22
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:24/08/2021
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month
Total Pages:100

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم وآگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان وادب سے متعلق اہم تنقیدی وتحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش وجستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت:100روپے، فی شمارہ:25روپے

بنامNCPUL اکاؤنٹ نمبر:A/C: 90092010045326 ، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت:قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک8، وِنگ7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون:011-26109746 فیکس:011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in
شاخ : 110-7-22 تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلیکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون:24415194 - 040

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ،http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025
LPCDELHI,DELHIPSO,DELHIRMS,DELHI-6